ابن عبداللہ (دیولی)

مصنّف

جناب حضرت محمد عبد المجید احمد صاحب

قادری وخضری۔ پیر صاحب دیول شریف

- ناشر :— پیرزادہ معین الدین معین۔ فیض آباد۔ راولپنڈی
- معاون :— آلِ احمد مانی علیگ۔ سرگودھا
- طابع :— نوائے وقت پرنٹرز لمیٹڈ۔ لاہور
- طبع : بار اوّل — تعداد : ایک ہزار
- تاریخ :— نومبر سنہ ۱۹۷۰ء

ترانۂ عقیدت

مزاج میرا ہے عارفانہ، میری نگاہیں ہیں طائرانہ   مگر بحقِ حضورِ اقدس مجھے عقیدت ہے والہانہ
نظر نظر جس کی تازیانہ، ادا ادا ہے قلندرانہ   قدم باندازِ خسروانہ، جلو میں شان سکندرانہ
ہزار خوابِ گراں تصدق تمہاری محفل کے رَت جگوں پر   نگاہ و دِل سے چھلک رہی ہے گئی سحر تک مئے شبانہ
کبھی کبھی تو حضور کا ہم رکاب بھی مَیں رہا ہوں لیکن   حضور قبلہ کی منزلوں سے میرا تعارف مقرّبانہ
یہ دَر ابھی جگمگا رہا ہے، جو آ رہا ہے وہ پا رہا ہے   یہ پیرِ دیول فقیرِ دیول ہے معرفت کا بھرا خزانہ
زباں زباں جن کی گفتگو ہے، دِلوں دِلوں جن کی آرزو ہے   یہی ہیں وہ لوگ مردِ کامل کہ جن کی ٹھوکر میں ہے زمانہ
تو فکرِ منزل سے کانپتا ہے، اندھیری راہوں سے خوف کیا ہے   ابھی ہے پیرِ مغاں سلامت، کھلا ہوا ہے شراب خانہ

تلاش میری میرا تجسس سخن کے سانچے میں ڈھل رہا ہے
معینؔ کیا ہے کلام میرا، میری عقیدت کا ہے ترانہ

پیرزادہ مُعین الدین مُعینؔ

(دیول شریف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اول

پہاڑ کی زندگی

مَیں اللہ کا عاجز ترین بندہ ابنِ حضرت عبداللہ قادری دیولی عرضِ حال بیان کرتا ہوں کہ مَیں آج سے اڑتالیس برس قبل سرزمینِ دیول میں ایک درویشِ باللہ گھرانے میں پیدا ہُوا جو علمِ دین کا گہوارہ تھا۔ اور تقویٰ و پرہیز گاری اس درویش گھرانے کا امتیازی نشان تھا۔ دو نفوس جن کی عاطفت میں مجھے پرورش نصیب ہوئی۔ وہ بڑے درجے کے متقی اور بڑے جُود و سخا کے حامل تھے۔ نہایت حلیم متواضع، نہایت عاجز و غمگسار اور نہایت منکسر المزاج اور عفو و درگذر کرنے والے صفاتِ عالیہ کے مالک تھے۔ سلسلۂ تبلیغِ دین اپنے اسلاف سے تواتر کے ساتھ ورثہ میں رکھتے تھے۔ حکمت و موعظتِ اسلامیہ پر بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ کوہ مری، ہزارہ اور آزاد کشمیر کی پُرنور پہاڑیوں کے وسطی دامن قریۂ دیول میں بیٹھ کر آپ نے مذہبی تبلیغ کے فرائض جس حسنِ اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ وہ اپنی خاص نوعیت کے حامل تھے۔ خطۂ پہاڑ کے مرد و زن عوام و خواص صغیر و کبیر آپ کے معتقد اور آپ سے بے پناہ محبت کرنے والے تھے۔ آپ کے پاس ہر وقت اہلِ عقیدہ کا ایک بابرکت تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور آپ ہمہ وقت مصروفِ عبادت اور مصروف تبلیغِ دین رہتے تھے۔ اور آپ کا لنگر بھی جاری تھا۔ ایک سادہ سی جھونپڑی میں ستر پچھتر برس کی عمریں گذار دیں۔ نہایت سادہ ماحول میں رہنا سہنا پسندِ خاطر تھا۔

مجھ عاجز کو حضرت والد بزرگوار کی خدمت میں حاضری کا زیادہ شرف ملا۔ واقعتاً مَیں نے آپ کو بڑی خوبیوں کا حامل پایا۔ آپ فی الحقیقت ایک کامل مردِ بزرگ اور درویش باللہ تھے۔ آپ

فاضلِ دین تھے۔ مگر دعوائے علم سے ہمیشہ گریز فرمایا۔ آپ ایک فصیح اللسان خطیب تھے۔ اور بعض دفعہ آپ کا کلامِ بلیغ اس حد تک پُرمعنی اور پُرتاثیر ہوتا کہ اہلِ دانش تڑپ اُٹھتے۔ آپ فقیہانہ اور مجتہدانہ صفات کے مالک تھے۔ مگر باوجود ان صفاتِ عالیہ کے آپ منکسرانہ انداز میں اپنی صفات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

آپنے اپنی پوری زندگی میں صرف عاجزی کا عملی ثبوت دیا۔ آپ نے دانستہ طور پر پہاڑ کی سادہ زندگی کو اپنایا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے

کہ عارفِ باللہ کی نگاہِ عارفانہ پہاڑ سے جن لطائف کا اخذ کرسکتی ہے۔ اس کا اندازہ صرف اہلِ نظر ہی کرسکتے ہیں۔ فرمایا۔ مَیں نے پہاڑ کی زندگی میں جو کچھ پایا۔ وہ شاید کسی دوسری جگہ سے نہ پاسکتا۔

مَیں نے یہاں سے اپنے مالک و مولا کو پایا ہے۔ منزلِ سلوک پائی ہے۔ صبر و استقامت پائی۔ معرفت کے گوہرِ بے بہا پائے۔ مَیں اللہ پر کامل بھروسہ کرنے والا ہوں۔ بس میری یہی زادِ راہ ہے۔

پہاڑوں کی قدرتی ساخت ایسی ہوتی ہے۔ جس میں نیرنگئی فطرت کے سوا کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ اُوپر آسمان ہے۔ جو دستبردِ انسانی سے محفوظ و مامون اور سطحِ ارضی پر پھیلے ہُوئے بلند و بالا جبال خودرو سبزہ زاروں سے لدے ہوئے جوئے باروں کی آوازوں سے نغمہ ریز طوطیانِ خوش نوا اور مختلف پرندوں کے چہچہوں سے معمور فضاؤں سے آباد و خوشحال پہاڑ ایک سالکِ راہ کو اُس مالکِ حقیقی کی راہ بتاتے ہیں۔ جو بے چون و چرا ساری مخلوقات کا پروردگار اور بے مثل و بے مثال ہے۔

کہیں ڈھونڈے سے بھی اِن پہاڑوں کی دلفریب رنگینیوں میں بناوٹ کا شائبہ تک بھی نہیں ملتا۔ دہقان اپنی سادگی میں اپنی زندگی کے ترجمان اُن کی بہو بیٹیوں کی فطری سادگی اُن کی سادہ سی معاشرت جو ہر قسم کے تصنّع سے پاک و صاف ہے۔ زندگی کی اُن کیف انگیز حالتوں کی ترجمان ہوتی ہیں۔ جس کا ترجمہ چشمِ بینا ہی کرپاتی ہے۔ سطحی نظروں والے شاید اِس متاعِ روح پرور کا سُراغ نہ پاسکیں۔

اِن پھیلے ہُوئے کوہ و دمن میں عارفانہ نظریں نہایت سادگی سے اُچک کر حقیقی دامنِ مراد تھام

لیتی ہیں۔ اور کسی ما ورئے ہستی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ دیہاتی زندگی اور کوہ دمن کا قدرتی امتزاج قلب و نظر میں ایک کیف و سرور پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ صحیح کیف و سرور فطری منظر سے ہی میسر آتا ہے۔ لہٰذا وہ بھی فطری کیف و سرور بن جاتا ہے۔ اِس حیثیت مجموعی میں بصیرتِ عارفانہ کا افتتاح ہو جاتا ہے۔

چنانچہ عارف باللہ بصیرتِ زندگی کے وہ وہ راز معلوم کر لیتا ہے۔ جو مکتب و مدرسہ میں میسر نہیں آسکتے۔ اور نہ ہی شہروں کی گنجان آبادیوں میں اُن تک رسائی ہو سکتی ہے۔ شہر تو بس شہر ہیں۔ جن میں اکثر و بیشتر نفوس کی نگاہیں منتشر الحال رہتی ہیں۔ اگرچہ سامانِ زیست کی افراط ہوتی ہے مگر سامانِ قلب و نظر بہت کم یاب ہوتے ہیں۔ اور اِن فطری جہانوں میں چاہیں تو سارے دہقان ہی صاحبِ نظر ہو جائیں۔ اس واسطے کہ دہقان کی تارِ اربابِ حیات دنیا کے فریب سے محفوظ رہنے کی بنا پر مسلّمہ طور پر سلامت ہوتی ہے۔ جب بھی مضرابِ حقیقت کے ساتھ اس کی تارِ حیات چھیڑی جائے گی۔ اُس سے وہی نغمات صادر ہوں گے۔ جو بالکل فطری ساخت پر غیر مصنوعی ہوں گے۔

دِل غیر مصنوعی، بصر غیر مصنوعی، تمنا غیر مصنوعی، جستجو غیر مصنوعی، طلب غیر مصنوعی، منظر غیر مصنوعی۔ اس پاک ہجومِ فکر و عمل میں دہقان زادوں اور اُن کے خاندانوں کو سوائے حقیقت کے اور کچھ نظر ہی نہیں آسکتا۔ اُن کی نماز نماز ہے۔ اُن کا امام امام ہے۔ وہ ہمہ وقت انفس و آفاق سے انوار و تجلیاتِ فطرت کا مہبط ہوتے ہیں۔

پہاڑ کی زندگی اور اِس کے علم و عرفاں اور اس کی نگاہ رسا کو ساری دنیا اور اس کے تہذیب و تمدن پر اللہ تعالےٰ نے تفوق و برتری دے رکھی ہے۔ سالکِ مردِ کوہستانی ترجمان حقیقت ہے وہ زمانہ کا محاسب ہے۔ وہ دِل کا بادشاہ ہے۔ وہ مقاصدِ زیست کا عارف ہے۔ اس کے قلب و نظر سے فیض کے دریا پھوٹتے ہیں۔ اور رواں دواں ہوتے ہیں۔ وہ سنتِ اسلاف کا امین ہوتا ہے۔ وہ کسی کا حریف نہیں ہوتا۔ مگر اس کے حریف پامال خزاں ہو جاتے ہیں۔ وہ حق کی بے نیام تلوار ہوتا ہے۔

اِس دنیا میں سب سے مشکل ترین سوال مقاصدِ زیست کا حل کرنا ہے۔ اس سوال کا حل فلاسفہ

دانشوروں، شعراء، متکلمین اور دوسرے مفکرین کے بس کا روگ نہیں ہے۔

مگر دشت و جبل کا خود آگاہ درویش ایسے مشکل ترین لاینحل سوالات کو بھی حل کر لیتا ہے۔

دوسرا سوال جو اہلِ دنیا کے نزدیک ناقابلِ حل ہے۔ وہ انسانی سطح پر جدید ابھرنے والے تہذیب و تمدن ہیں۔ جو مختلف اور جدید تہذیب و تمدن کے ساتھ انسانی ذہنوں کے بے پایاں طوفانوں اور اس کی معاشرت کے ہنگاموں میں مخفی و مستور ہوتے ہیں۔ کہیں معاشرت کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے ہی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر انسانی تہذیب و تمدن کے چہروں کو مجموعی طور پر پڑھنا سوائے اہلِ نظر کے مشکل ترین عقدہ ہے۔ مگر اہلِ نظر کے نزدیک پہاڑی زندگی کی نسبت آخرالزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پہاڑی زندگی کی طرف ہے۔

یہ کہ اللہ کے سب سے مکرم ترین بندۂ کامل نے زندگی کا آغاز پہاڑوں سے کیا۔ پہاڑوں میں پرورش پائی۔ پہاڑی ماحول سے آشنا ہوئے۔ پہاڑی تربیت میں جوان ہوئے۔ اور فاران کی پہاڑی پر سے ساری دنیا کو ایک خدا کی طرف دعوتِ حق کے ساتھ نجاتِ کامل کی طرف بلایا۔ اور مقاصدِ زندگانی کے سوال کو حل کیا۔ تہذیب و تمدن کا صحیح جائزہ لے کر انسانیت کی صحیح راہنمائی فرمائی۔

مردِ کوہستانی کا فقر و غنا اگرچہ بظاہر بوریا نشین ہوتا ہے۔ مگر سرمایۂ سلطانی بھی اُس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ چونکہ بندۂ فقیر خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اطاعت شعار ہوتا ہے۔ دین کی پیروی میں وہ روحانیت اور مادیت پر متصرف ہوتا ہے۔ اس کا فقر و غنا جہاں کہیں اور جس حالت میں ہو۔ مطمئن ہے۔ اُسے انسانی نفوس پر اپنے اسلامی فقر و غنا کے ساتھ برتری حاصل ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے خفی جہانوں میں بلند و بالا ایوانوں میں رہتا ہے۔ ساری دنیا اُس کے نزدیک ایک خیمہ یا جھونپڑہ کے مانند ہے۔ جس کی چھت آسمان اور فرش زمین ہے۔ وہ ایسے عارضی مسکن کو اپنی قیام گاہ متصور نہیں کرتا۔ اہلِ دنیا کو وہ ہمہ وقت حادثات و آلام کا شکار پاتا ہے۔ اور اُن کے لئے عافیت کی دُعا مانگتا ہے۔ اس کی دعاؤں سے اہلِ دنیا امن پاتے ہیں۔ روحانیت کی بلند و بالا پرواز رکھنے والا ایسا مردِ فقیر اتنا برتر و بالا ہو کر بھی اس عالمِ کاخ و کو میں اِس واسطے بوریا نشین ہونا پسند کرتا ہے۔ کہ انجام کار سب کو زیرِ زمین خاک پر ہی لیٹنا ہو گا۔ اس کا یہ فیصلہ حاصلِ زندگی کا صحیح جواب ہے۔

والد بزرگوار جب پہاڑ کی زندگانی پر عارفانہ استفسار فرماتے۔ تو ایسا معلوم ہوتا۔ گویا کہ آپ کی ساری باطنی قوتیں اِسی نقطۂ منظر میں سمٹ آئیں۔ اور پہاڑوں کی قدرتی ساخت اُس کی آبادیوں اُس کے مساکن، اُس کی بود و باش پر باتیں کرتے ہوئے جھوم جاتے۔ فرمایا

"جس پہاڑ کو حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت دادا ملک سورج صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت پیر محمد قاسم صاحب موہڑوی نے نوازا ہو۔ اُس کی بلندئ شرافت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔"

بیٹا!۔ اگر حالات نے اجازت دی۔ تو پہاڑی آبادی کو ترک نہ کرنا۔ ورنہ بصورتِ دیگر اس کی روایات کو ذہن نشین رکھنا۔ اِس کے بسنے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ یہ لوگ ناقابلِ فراموش ہیں۔ پھر بشارت کے طور پر فرمایا۔

"کہ تم جو کچھ بھی پاؤ گے۔ اِن ہی دشت و جبل سے پاؤ گے۔ معرفتِ الٰہی کے ساغر بھی تمہیں یہیں پلائے جائیں گے۔ مگر جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ وہی بہتر ہوتا ہے۔ دینِ اسلام سب سے محبوب ہے۔ اُس کی اشاعت کے لئے اگر باہر چلے جاؤ۔ تو بھی مری کی پہاڑیوں کو اور خاص طور پر دیول کو اپنا منبع و مصدر جاننا۔"

حضرت والد بزرگوار کے کلام سے میں بار بار یہ محسوس کرتا تھا۔ کہ وہ پہاڑ کی تعریف کرتے ہوئے طورِ سینا کو بھی شاملِ کلام فرماتے۔ اور اُس کا اتمام مکہ اور مدینہ کی پہاڑیوں کے سامنے کرتے۔ صاف ظاہر ہو جاتا۔ کہ آپ کی توجہ کا مرکز مکہ و مدینہ کی پہاڑیاں ہیں۔ جن کو سید الکونین سے نسبت ہے۔ مَیں نے اپنی ریاضت کے دوران کئی سال پہاڑ کے نشیب و فراز پہاڑ کے جوئے باروں، دریاؤں، جنگلوں میں عبادات کیں اور پہاڑی فطری ماحول کا بغور مطالعہ کیا۔ اور مجھے بھی پہاڑ کی زندگی سے بہت کچھ ملا۔

حضرت والد بزرگوار پہاڑ کے دہقان اور پھر دہقان کی محنت و مشقت اور اُس کے مساکن پر اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔ جو مجھے یاد ہے۔ مَیں بھی گاہے اپنی تنہائی میں اُس کو والد بزرگوار کی سنت سمجھ کر پڑھا کرتا ہوں۔ اور اُس کے پڑھنے سے روح کو تسکین ہوتی ہے۔ شعر۔

فضا کی وسعتوں میں چند کچے گھر کسانوں کے　　یہی ارضی مساکن ہیں زمیں کے راز دانوں کے

مَیں نے اپنے مطالعہ سے پہاڑی زندگی کے متعلق جو اندازہ لگایا۔ وہ یہ ہے

کہ خالص تربیت کے ساتھ پہاڑ کا بچہ انسانی خدمت کے لئے اعلیٰ قسم کی سیادت و قیادت کا حامل ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں سیادت و قیادت کی سبیل کو اگر کوہ و دمن میں ہی پالا جائے۔ تو یہ سنتِ مصطفوی کی باسعادتی ہوگی۔

میرے والدین طریقت میں سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے۔ والد بزرگوار نے سلسلۂ چشتیہ سے بھی فیضِ خلافت حاصل کیا۔ بغدادِ معلیٰ سے بھی خلافت حاصل کی۔ اور پاکپتن شریف سے بھی خلعتِ خلافت حاصل کیا۔ سوہاوہ شریف جو آزاد کشمیر میں ہے۔ حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سے بھی خلعتِ خلافت حاصل کی۔ حضرتِ فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیسِ خاص رہے۔ اگرچہ آپ نے اُن سے بیعت نہ کی تھی۔ مگر آپ فرمایا کرتے تھے

کہ مجھے حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے بے حد عقیدت تھی اور اُن سے مجھے خاص الخاص فیض نصیب ہُوا۔ اور مَیں آپ کی خاص توجہ کا مرکز رہا۔ آپ نے مجھ سے بے پناہ التفات فرمایا۔ یہاں تک کہ مَیں نے آپ کے دستِ حق پر بیعت حاصل کرنے کی بارہا آرزو کی۔ مگر آپ اتنا فرما دیا کرتے تھے۔ کہ آپ نے تو قادریہ خاندان کے منبع و مصدر بغدادِ معلیٰ سے فیضِ معرفت و طریقت حاصل کیا ہوا ہے۔ جو بڑی فضیلت ہے۔ پس اسی پر اکتفا کرو۔ یہ مقام خوش بختی سے ہی کسی کے حصّہ قسمت میں آتا ہے۔

پھر فرمایا کرتے تھے۔ کہ عبد اللہ مَیں چاہتا ہُوں۔ کہ ہمارا انجام ایک اور بالخیر ہو۔ بارہا یہ بھی فرمایا۔ کہ تم شیر بیشۂ عرفان ہو۔ تم رستمِ فقر و غنا ہو۔ تم اپنے زمانے کے عظیم شہسوار غازیٔ میدان علم و معرفت ہو۔ تمہاری پروازِ علم و عرفان بلند و بالا ہے۔ جو اللہ کے فضل و کرم سے تمہیں عطا ہوئی۔ فرمایا

کہ تم اللہ کے دوست ہو۔ ایک دفعہ آپ نے حالتِ وجد و سرور میں فرمایا۔ کہ عبد اللہ تم تو ایک مخفی خزانہ ہو۔ میری دعا ہے۔ کہ تم مخفی ہی رہو۔ مَیں دیکھتا ہُوں۔ کہ تمہیں اللہ تعالےٰ ایک دُرویش بچہ دے گا۔ جو دین کو روشن کرے گا۔ جس کی ہدایت دُور دراز تک پھیلے گی۔ یہی نورِ معرفت تمہارے ذاتی اور مخفی فقر و غنا کا اظہار ہو گا۔ اور اِس ظہور سے تمہاری روح برزخ میں امن و سرُور پائے گی۔

مَیں نے آمنا و صدقنا کہا۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا۔

عبداللہ تم بڑے خوش نصیب ہو۔ مَیں دیکھتا ہُوں کہ تم اور تمہاری بیوی دونو ہی ولی اللہ ہو۔ یہاں تک کہ تم دونو کے ماں باپ آبا و اجداد بھی ولی اللہ ہیں۔ اسی اعتبارِ ولایت سے تمہاری اولاد نجیب الطرفین ولیوں کی اولاد ہوگی۔ مَیں نے عرض کیا حضرت میرا ایمان ہے۔ کہ ایسے ہی ہو گا۔

جیسا کہ آپ کی زبان فیضبار سے ارشاد ہو رہا ہے۔ حضرت میرے ہاں ابھی تک اولاد نہیں ہوئی فرمایا کچھ مدت بعد دعا کروں گا۔ پھر بشارت دوں گا۔

ایک عرصہ کے بعد آپ کی مجلس اقدس میں چند ہمراہیوں کے ساتھ برائے اولاد دعا کے لئے حاضر ہُوا۔ آپ نے دُعا فرمائی۔ اور بشارت دی۔

کہ تیرے گھر اللہ کی عنایت سے تین لڑکے پیدا ہوں گے۔ اِس وقت آپ پورے جلال میں تھے مجلس میں کسی صاحب نے شُبہہ کیا۔ تو سخت جلال کے عالم میں فرمایا۔ کہ قسم ہے اللہ تعالےٰ کی جِس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ کہ عبداللہ کے گھر تین لڑکے ہوں گے۔ یہ لوگ شک کرتے ہیں۔ مَیں اُن کے نام بھی بتائے دیتا ہوں۔ فرمایا۔

تمہارے بڑے بچے کا نام محمد عبدالجلیل ہو گا۔ اور تمہارے منجھلے لڑکے کا نام محمد عبدالخالق ہو گا اور تمہارے سب سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد عبدالمجید احمد ہو گا۔ یہ چھوٹا بچہ وہ ہو گا۔ جس کے ذریعہ دین کی تائید ہو گی۔ جس کو تمہاری تدریس کے علاوہ علومِ دینیہ خدا کی غیبی تائید سے حاصل ہوں گے۔ مدبرین ومفکرینِ عصر اس سے دین و عرفان کا سبق لیں گے۔ اکابرینِ وقت اِس سے فیضِ دین و ایمان پائیں گے اس کو کسی مکتب و مدرسہ میں نہ بھیجنا۔ دریاؤں کے کناروں اور دشت میں اُس کا معلمِ خاص اس کا انتظار کرتا ہے۔ یہ معلم صدہا برس کے بعد اللہ کی خاص رحمت و کرم سے کسی بندۂ خاص کے نصیب میں آتا ہے۔ یہ فرمایا اور مبارک باد دی۔ اور فرمایا۔

"اپنے لختِ جگر و نورِ نظر محمد عبدالمجید احمد کو میرا سلام دینا۔ اور میری دعا دینا۔ یہ پہاڑی علاقے مردانِ خدا سے کبھی تہی دامن نہیں ہوں گے یہ علاقہ جبال اللہ کے بندوں سے ہمیشہ آباد رہے گا۔"

ایک دفعہ آپ نے دورانِ کلام فرمایا۔

"میں دیکھتا ہُوں۔ کہ ہمارا پہاڑ لعل و جواہر سے بھرا ہے۔ مَیں نے عرض کی۔ حضرت اِس سے کیا مُراد ہے۔ فرمایا۔ دریائے معرفت کے وہ وہ انمول موتی و گوہر اِس میں مخفی ہیں اور جن کی قیمت خدا کے اونچے بازاروں میں ہو سکتی ہے۔ جس کا خریدار خود پروردگارِ عالم ہوتا ہے۔ یہاں بازارِ عرفان کے یوسف چھُپے بیٹھے ہیں۔ اِن گدڑیوں کے لعلوں کی قیمت دنیا کے بازاروں میں نہیں ہوتی"۔

پھر فرمایا۔ دیول سے مجھے شرافت کی خوشبو آتی ہے۔ یہ شیرانِ غاب کا مسکن ہے۔

یہ بادشاہوں کی منزل گاہ ہے۔ اور فقر و شاہی کا گہوارہ ہے۔

حضرت مرشدی اباجان نے ایک دفعہ میرے سامنے ایک خواب بیان فرمایا۔ کہ میں اپنی مسجد شریف میں سویا ہوا تھا۔ غالبًا قیلولہ کی نیند کا ذکر فرمایا۔

کیا دیکھتا ہُوں۔ کہ مسجد کی شمالی کھڑکی سے شیر کے غرانے کی آواز آئی۔ اور آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ کہ شیرِ ببر اپنے دونو پنجوں کو کھڑکی کے اندر رکئے ہُوئے ہے۔ اور اس کا پُر جلال مُنہ اور چمکدار آنکھیں میری طرف پوری آب و تاب سے متوجہ ہیں۔ مَیں گھبرا کر بیدار ہُوا۔ ابھی اُٹھ کر بیٹھا ہی تھا۔ کہ حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ کے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ اور گھوڑا مسجد کے سامنے کھڑا تھا۔ حضور بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ اِس پر سوار تھے۔ مَیں فورًا استقبال کے لئے صحنِ مسجد کے باہر آگیا۔ اور گھوڑے کی لگام پکڑلی۔ فرمایا۔

عبداللہ قسم ہے اللہ کی کہ مَیں صرف تجھے ہی ملنے آیا ہُوں۔ اور صرف یہ بشارت دینے آیا ہُوں۔ کہ تیرے گھر وہ بچہ عنقریب پیدا ہونے والا ہے۔ جس کی مَیں نے بشارت دی ہے۔ عبداللہ تم بڑے خوش نصیب ہو تمہارا یہ بیٹا اسلام کی پاسداری کرے گا۔

باب دوم

حسب و نسب

میرے والدِ بزرگوار حضرت عبداللہ القادری رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے عظیم ترین مدبرین و مفکرینِ دین سے تھے۔ اور صاحبِ قلب و نظر، صاحبِ زمان، صاحبِ قلم، صاحبِ طریقت اور صاحبِ حال و قال تھے۔ آپ کی زندگی میں آپ کو سب سے بڑی نعمت یہ میسر آئی، کہ آپ کو زندگی کا جو ساتھی مِلا وہ یقیناً آپ کے لئے وجہ عروج وجہ اتقا اور وجہ طمانیت ثابت ہُوا اِن دو نفوسِ قدسیہ نے مِل کر اس انداز سے زندگی اور زندگی کے اُن صفاتِ عالیہ کو جو اُنہیں ورثہ میں ملے تھے محفوظ رکھا جس طرح ساحلِ سمندر کے ریگزاروں میں گوہرِ بے بہا محفوظ رہتا ہے۔ اور وہ کِسی خوش نصیب کے حصۂ قسمت میں آتا ہے۔ اور وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ بالکل اِسی طرح آپ نے اپنے اوصافِ حمیدہ کو اپنے محدود وسائل کے ساتھ گمنام ہو کر پہاڑوں کے دامنوں میں چھُپ کر محفوظ رکھا۔ تاکہ وہ سینہ بہ سینہ بعافیتِ تمام اولادوں اور نسلوں میں منتقل ہوتے رہیں۔ اور انسانیت باقیات الصالحات کی صورت میں متواتر استفادہ کرتی رہے۔

حضرت والدِ بزرگوار نسباً علوی النسل تھے۔ مگر تفاخرِ نسبی سے اِس قدر گریزاں و ترساں رھتے تھے۔ کہ کبھی آپ اپنی زبان پر بھولے سے بھی نسبی الفاظ نہیں لائے۔

فرمایا کرتے تھے۔ کہ نسب اگرچہ پاک لوگوں سے ہی کیوں نہ منتفق ہو۔ تاہم فیصلہ اعمال پر ہوگا۔ ورنہ بصورتِ دیگر بھی نیک اعمال ہی کام آسکتے ہیں۔ محض زبان سے نسبی طور پر اظہارِ تفاخر کرنا بے سُود ہوگا۔ بلکہ وبالِ جان ہو جاتا ہے۔ حسب و نسب کے ذکر میں اکثر یہ حدیثِ پاک پڑھ

کر سنایا کرتے تھے۔

كُلُّكُمْ بَنُوْ آدَمُ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ -

یعنی تم سب اولادِ آدم ہو۔ اور آدم کی اصل مٹی تھی۔

اس پر فرمایا کرتے کہ اچھے خاندان اپنی نیک روایات کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کی شرافت دنیا میں کئی اچھے خاندان بناتی ہے۔

مَیں نے والد بزرگوار کے اِن نصائح کو کتاب وسنت کی روشنی اور تاریخ بنی نوع انسان کی روشنی میں بنظرِ غائر دیکھا۔ تجزیہ کیا۔ تو اولادِ آدم کی حیثیت میرے سامنے آگئی۔ یعنی افرائیش نسل کے ساتھ ہی اولادِ آدم کو فروغ مِلتا ہے۔ اور اعمال کے مطابق درجات مِلتے ہیں۔ نہ کہ نسبًا۔ اور پھر بعض لوگوں نے شرافت وشجاعت کے نیک کارناموں کے ساتھ انسانوں میں تاریخی شہرت پائی۔ پھر اُنکی معروف شخصیات کے ساتھ قبائل بننے شروع ہُوئے۔ اُن میں سے جو لوگ ضرب المثل کے طور پر نیک نام ہُوئے۔ اُن کو سیادت کے ساتھ یاد کیا جانے لگا۔ درحقیقت یہ شہرت کسی عملی تاریخ پر مرتب ہوتی ہے۔ نسلاً بعد نسلاً یہ تفاخر بھی کیا جانے لگتا ہے۔ کہ مَیں بڑے اعلیٰ حسب ونسب کا آدمی ہُوں۔ مگر اعلیٰ حسب ونسب کے لئے بُری اولاد ننگِ خاندان ہوتی ہے۔ اور اچھی اولادیں بہزار حیلہ پوشیدہ رہنے کی کوشش کریں۔ مگر فطرت اُنہیں پوشیدہ نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ اُن کو زمانہ میں اِس طرح نمایاں اور ظاہر کیا جاتا ہے۔ جِس طرح خزاں زدہ اشجار سے بہاروں کے ساتھ کونپلوں، پھلوں اور پھولوں کو عیاں کیا جاتا ہے۔

ہر بہار کے بعد خزاں آتی ہے۔ خزاں پت جھڑ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مگر جن درختوں میں نمود پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اُن میں پھل پھول مستور ومحجوب ہوتے ہیں۔

جوں ہی کاروانِ بہار کا اِن پر گذر ہوتا ہے۔ اُن کی مستور ومحجوب صلاحیتیں کونپلوں اور پھل پھول کی صورت میں عیاں ہو جاتی ہیں۔ وہی خزاں زدہ اشجار جو چند ایام پہلے بے پھل اور بے پھُول نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا یہ تہی دامن ہیں۔ مگر آج ساری نظروں کے سامنے اُن کا دامنِ زندگی پُر بہار نظر آنے لگتا ہے۔

بالکل اِسی طرح اچھے لوگوں کی اچھی اولادیں اگر اپنی نیک صلاحیتوں کو اپنے وجود میں محفوظ

رکھتی ہوئی چلی آئیں ۔ تو راہِ زندگی پر اگر بظاہر وہ کسی اُفتادِ زمانہ کا شکار ہو کر بھی وجہ سے انسانیت میں مستور ہو جائیں ۔ تو جب بھی رحمتِ خداوندی بہاروں کی صورت میں اِن پر گذرے گی ۔ تو یقیناً ایسے لوگوں کی مخفی صفات بہاروں کی طرح سر سبز و شاداب ہو کر سامنے آجائیں گی ۔ اور مجرموں کا انجام بُرا ہوتا ہے ۔

یہ کہ بُرائیوں کا پیہم شکار ہونے والی نسل اپنے خاندانی اثرات نیک کچھ مُدت کے بعد زائل کر بیٹھتی ہے ۔ ایسی نسلیں ننگِ خاندان ہو کر شریف خاندانوں کی بدنامی کا باعث بن جاتی ہیں ۔ مگر یہ بدنامی صرف اُن ہی بداعمال لوگوں تک محدود رہتی ہے ۔

اُن کے اسلاف کا نام بدستور اپنی تاریخ کے ساتھ زندہ رہتا ہے ۔

صرف تعبیراً لوگ ان کی بدنام نسلوں کو ننگِ خاندان کہہ کر خاندان کے تاریخی حیثیات کو اُن سے الگ کر دیتے ہیں ۔ جس طرح صحت مند جسم کے کسی ایک عضو کے بیمار ہونے سے سب وجود کو مریض نہیں کہا جاتا ۔ بلکہ جسم کے اُسی ٹکڑے کو بیمار کہا جاتا ہے ۔ جو بیمار ہوتا ہے ۔ اُسکو صحت مند کرنے کے لئے وجود کی پوری صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں ۔ مگر ناکامی کی صورت میں بعض دفعہ طبعیتِ انسانی اِس بات پر اُتر آتی ہے ۔ اور یہ فیصلہ قبول کر لیتی ہے کہ اِس بے حد بیمار حصّہ جسم کو جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے ۔ تاکہ یہ وجود کی ہلاکت کا باعث نہ بن جائے ۔

جیساکہ حضرت نوح علیہ السّلام کے لختِ جگر نُورِ نظر نے نافرمانی کی ۔ اور خاندانِ نبوت کے خلاف عادتِ مذمومہ کی پیروی کی ۔ اور بُرے لوگوں میں جا مِلا ۔

جس کے نتیجہ میں حضرت نوح علیہ السلام جو اپنے کردارِ نبوت کے ساتھ اپنے جداعلیٰ شیث علیہ السّلام کے مذہب پر کاربند تھے ۔ اور سلسلۂ تاریخ نبوت من حیث الخاندانِ نبوت تعمیر کر رہے تھے ۔ کہ آپ کے جسمِ پاک سے اولاد کی ایک شاخ پھوٹی ۔ جس کا نام آپ نے کنعان رکھا ۔

یہ بیٹا اصلاً اولادِ نوح علیہ السّلام تھا ۔

مگر عملاً نافرمان اور سرکش تھا ۔ ہر چند کہ باپ نے نصیحت فرمائی ۔ اُس نے ایک نہ سُنی ۔ اور اپنی عادت کو پیہم بگاڑتا چلا گیا ۔

نتیجہ یہ ہُوا ۔ کہ اس پر امتحان کا زمانہ آپہنچا ۔ طوفانِ نوح علیہ السّلام نے آگھیرا ۔ لوگ

پہاڑوں کی طرف بھاگے۔

حضرت نوح علیہ السّلام نے ایسی نازک ترین گھڑی میں نہایت شفقت کے ساتھ اپنے لختِ جگر بیٹے کو سمجھایا۔ اور وہ الفاظِ مبارکہ جو آپ نے اُس وقت اپنے نورِ نظر کو بطورِ نصیحت بازگشت کے لئے ارشاد فرمائے۔ قرآنِ کریم اُن کو من وعن بیان کرتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔

یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا۔

اے میرے بیٹے اِس طوفانی حالت میں مَیں نے بچاؤ کے لئے جو کشتی بنائی ہے۔ اِس میں میرے ہمرکاب ہو جا۔ مگر بیٹے نے جواب دیا۔

قَالَ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ۔

کہا اے باپ مَیں پہاڑ پر جا کر اپنا بچاؤ کروں گا۔

چنانچہ وہ اِسی نافرمانی کی دوڑ میں طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ ایسی حالت میں نوح علیہ السّلام کی نظریں اُس پر پڑیں۔ شفقتِ پدری جوش میں آئی۔ تو اپنے پروردگار کے حضور میں یوں التجا کی۔

اے اللہ تو نے وعدہ فرما رکھا ہے۔ کہ نبیوں کی اولادوں کو دردناک ہلاکتوں سے مامون رکھوں گا۔ مگر مَیں دیکھ رہا ہوں۔ کہ میرا لختِ جگر میری آنکھوں کے سامنے شکارِ طوفان ہو رہا ہے۔ اور غوطے کھا رہا ہے۔ اور ہلاک ہونے والا ہے۔ پروردگارِ عالم نے اپنے بندے نوح علیہ السّلام کو جواب دیا۔

قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ۔

اے نوح علیہ السّلام یہ درست ہے۔ کہ میں نے نبیوں کی اولادوں کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ چونکہ وہ نیک ہوتے ہیں۔ مگر یہاں اِس کے خلاف ہے۔ اگرچہ تیرا بیٹا تیرا ہی لختِ جگر ہے۔ مگر تیری خاندانی روایات کے خلاف بدعملی کا شکار ہوگیا ہے۔

اِس واسطے یہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔

نوح علیہ السّلام کا بیٹا عظمتِ نسبی کو بھول کر بدکردار لوگوں سے جا ملا تو اپنی نسبت خاندانِ

نبوت کو اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھا۔

دنیا ایک پُراسرار جگہ ہے۔ اور یہ اللہ کے انعامات کا دستر خوان ہے۔ اور اِس میں جو کچھ ہے۔ سب سامانِ زیست ہے۔ اور اِس دستر خوان کا میز بان اللہ ہے۔ اور اُس کے مہمان انسان ہیں۔ اور انسان خاندانِ آدم ہیں۔ میز بان کی نظر میں عموماً اپنے مہمانوں پر مروّت و الطاف کرتی ہیں۔ مگر میز بان اچھے اور بُروں میں تمیز بھی کر لیتا ہے۔

جو مہمان اچھے ہوتے ہیں۔ اُنہیں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر میز بان کوئی بادشاہ ہو۔ اور مہمان رعیت ہو۔ تو بخوبی و بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ بُرے مہمانوں کا ورود میز بان کے لئے کس قدر شاق ہو گا۔ یقیناً ایسا مہمان بادشاہ کی نگاہوں میں معتوب ہو گا۔

اور اس طرح معتوب ہونا رعیت کے لئے سخت بد قسمتی کا باعث ہوتا ہے۔ اور ایسی بُری رعیت چاہے کیسی ہی اولوالعزم کیوں نہ ہو۔ اپنے میز بان اور مربی کی نظر سے گر جائے گی۔ اور ایسی بے عقل و نادان رعیت بادشاہ کی نظر میں معتوب ہو کر یقیناً پسرِ نوح کی طرح ہلاک ہو جائے گی۔ اِس طرح جو لوگ اپنے میز بان و مربی کی نظر میں پسند آجائیں۔ اُن کو بڑی بڑی مراعات سے نوازا جاتا ہے۔

جِس سے اِس کی عزت و تکریم سعادت مند خاندانوں کی صورت میں صفحۂ ہستی پر اطمینان بخش ظہور کرتی ہے۔ ایسے خاندان جنہوں نے بارگاہِ فطرت کے دستر خوانِ نعمت سے گونا گوں استفادے کئے۔ اور اپنے میز بان و مربی کا شکرانہ ادا کیا۔ وہ اہلِ وفا سے ہیں۔ اُن کی اپنے مربی و محسن سے وفا شعاری ہی ان کو اعلیٰ خاندان بننے کی حیثیت دیتی ہے۔

خاندان از خود نہیں بنتے۔ بلکہ خدا کی رحمت و رافت سے بنا کر سامنے لائے جاتے ہیں۔ اور جب تک وہ اپنے مالک و مولا کے فرمانبردار رہتے ہیں۔ اُس وقت تک اُن میں خاندانی سعادت مندیوں کے اثرات موجود رہتے ہیں۔ جب بھی یہ لوگ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے ادائیگی شکر میں تغافل شعار ہو جاتے ہیں۔ تو رفتہ رفتہ اُن کا مالک و مختار اُن کی پُر تاثیر صلاحیتوں کو اُن سے چھین لیتا ہے۔

جب خاندانوں کی نیک صلاحیتیں مفقود ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ تو یہی

فقدانِ سعادت خاندانوں کو اپنی خداداد بلندیوں سے نیچے گرا دیتا ہے۔ پھر وہ مہتر سے کہتر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں شرافتِ نسبی کا ماخذ انبیائے کرام ہیں۔ جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے نسلاً بعد نسلاً اصلاب و ارحام میں سفاحِ جاہلیت سے پاک رکھا۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی پُشت مُبارک تک اُن کو غلیظ اور پراگندہ اصلاب و ارحام سے مامون رکھتے ہُوئے رحمِ مادر تک اُن کو پہنچایا۔ چونکہ آپ فطرۃً پاک تھے۔ ہر پاک چیز، ہر پاک نظریہ، ہر پاک عمل، ہر پاک جسم و جان اور ہر پاک نطفہ کو اللہ تعالےٰ ہمیشہ ناپاکی سے بچاتے ہیں۔

ہر حلال جانور کا دودھ اپنے مقام پر دودھ ہے۔ جب تک وہ جسموں میں رہتا ہے۔ اُسے قدرت پاک رکھتی ہے۔ جب اُسے دودھ لیا جاتا ہے۔ اور کسی دوسرے برتن میں اُسے منتقل کیا جاتا ہے۔ تب اس کے ناپاک ہونے کا اندیشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

مگر پاکیزگی پسند لوگ دودھ کو پاک برتن میں دوھ لینے کے بعد بھی اُسے پاک رکھتے ہیں۔ بحفاظت پاک برتن میں دودھ پاک رہتا ہے۔ اس کی شرافتِ اصلیہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر کسی غیر پاکیزہ خصلت کے ہاتھوں میں جا کر وہی پاک و صاف دودھ اُن خطرات کا شکار ہو جاتا ہے۔ جو پاکیزگی کی ضد یعنی ناپاک ہوتے ہیں۔

دودھ کو ناپاک چیز لگنے یا داخل ہونے سے دودھ واقعتًا ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور اُس پر بحیثیت دودھ ہونے کے ناپاکی کا پورا پورا اطلاق ہو جاتا ہے۔

دودھ ہو کر اگر ناپاک ہو سکتا ہے۔ تو انسان زادہ نسلِ آدم ہو کر خاندانِ نسل انسانی کی پاک حالت کو بھی بد احتیاطی سے غلیظ و ناپاک کر سکتا ہے۔

دودھ اصلی حالت میں بہتر ہوتا ہے۔ مگر ناپاک ہو جانے سے کہتر بن جاتا ہے۔

اسلام میں بہتر انسان کی تمیز تقوٰی پر ہے۔ اسلام اِسی واسطے دینِ فطرت ہے۔ کہ وہ ہر چیز کو پیمانۂ فطرت میں پرکھتا اور ماپتا ہے۔ وہ بِلا صفتِ تقوٰی کسی حسب و نسب کا قائل نہیں۔ البتہ اسلام اچھے خاندانوں کی تعریف تاریخِ انبیا کے ساتھ کرتا ہے۔

حسب ونسب اچھی چیز ہے۔ اُس سے صفاتِ خاندانی کا پتہ چلتا ہے۔ کہ کتنی مدت العمر تک فلاں خاندان اپنی نیک روایات پر کاربند رہا ہے۔ اور اس روایاتی خاندان نے نسلِ انسانی میں کتنے بہتر خاندانوں کا اضافہ کیا ہے۔

خاندان دنیا میں تفاخرِ خاندانی بیان کرنے کے لئے نہیں آئے۔ بلکہ خاندان دنیا میں نسلِ آدم کے بہت سے خاندانوں کو بنانے اور تعمیر کرنے کے لئے آئے ھیں۔

آدم علیہ السلام کا سلسلۂ خاندانِ نبوت شیث علیہ السلام تک باصفاتِ کریمانہ اور شیث علیہ السلام کا نوح علیہ السلام تک اور نوح علیہ السلام کا آگے چل کر ابراھیم علیہ السلام تک اور ابراھیم علیہ السلام کا سلسلۂ خاندان کریمانہ صورتوں میں منتقل ہوتا ہُوا آخر الزمان سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم تک اپنی پوری نیکیوں کے ساتھ آ پہنچا۔

چنانچہ فرمانِ خداوندِ ذُوالجلال ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔

یہ انتخاب صرف وجودِ خاکی ہی کے لئے نہ تھا۔ بلکہ بالصفات بھی تھا۔ فضیلتِ کریمانہ نے اُنہیں اِصْطَفٰی کا مقام دیا۔ یہ بزرگانہ انتخاب خاندانِ انبیاء کے لئے تھا۔ تاریخِ نبوت سے ثابت ہُوا۔ کہ انسانیت کے جدِ اعلےٰ آدم علیہ السلام تھے۔ جو صفتِ نبوت کے حامل تھے۔

اگر آدم علیہ السلام صفتِ نبوت کے بغیر محض خاکی آدم ہوتے۔ تو آدمیت صرف جنسِ آدمیت ہوتی۔ جس پر تکرم کا اطلاق نہ ہو سکتا۔

معلوم ہُوا۔ کہ خاندانِ انسانی کی جبلت شرافتِ نبوت سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ شرافتِ نبوت تقوٰی ہے۔ ہر نبی کا تقوٰی اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ بلند و برتر ہوتا ہے۔ اِس واسطے اُس کا خاندان بھی سب سے اونچا ہوتا ہے۔

فرعون نمرود و ہامان اپنے زمانہ کے اولوالعزم بادشاہ تھے۔ مگر اُن کی خاندانی بوجہ تفاخرِ نفسانی ننگِ انسانیت ٹھہری آج اگر اُن کی اولادیں فخر کریں گی۔ تو فراعنہ کی تاریخ استکبار تاریخ ظلم و عدوان کے سوا اُنہیں کوئی چیز سوائے تفاخر کے نہیں مِل سکے گی۔ اور ایسے تفاخرِ نسبی سے سوائے طاغوتیت

کے اور کچھ بھی میسر نہیں آسکتا۔ اولادِ آدم میں سب سے بڑے اور اونچے، سب سے بلیغ و ممیز، سب سے ارفع و اعلیٰ، سب سے زیادہ حسین و جمیل ترین شخصیت حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس طرح خاندانِ نبوت کی بنیاد رکھی۔ وہ اسلام میں اظہر من الشمس ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ خاندانِ نبوت کے صفات امت میں کس طرح منتقل ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے یہ حدیث دلیل ہے۔ کُلُّ تَقِيٍّ نَقِيٍّ فَهُوَ مِنْ اَهْلِيْ یعنی ہر متقی و پرہیز گار میری اہل سے ہے۔

اس حدیث سے قدرتی طور پر یہاں دو قبیلے بن جاتے ہیں۔ ایک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ اہلِ جسمانی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقربین ہیں۔ اور ایک آپ کی اہل اسلامی اُمت کے متقی ہیں۔ جو تعمیلاً آپ کے قریب ہیں مگر جسماً بعید۔

دونوں کی نیکی کے لئے حضور علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ ہر نبی کی اولاد جہاں نبی اللہ کی اولاد ہوتی ہے۔ وہاں وہ اولاد اُمت بھی ہوتی ہے۔

ایک اُمت من حیث القرابت اور ایک اُمت من حیث البُعد اسلامی برادری۔ اِن دونوں پر احکاماتِ خداوندی یکساں طور پر عائد ہوتے ہیں۔ احکامات کا نفاذ سب کے لئے برابر ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے۔ کہ اہل جسمانی نسبتاً زیادہ تاثیراتِ نبوت کی حامل ہوتی ہے۔ وہ جلدی احکامات کی بجا آوری اِس واسطے قبول کرتی ہے کہ اس کے اجزائے جسمانی قربتِ جسم و جان کی وجہ سے نسبتاً زیادہ قبولیت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اہل البیت کے الفاظ اسی قربت پر دال ہیں۔ اسی قربت کی وجہ سے وہ امتیازی حیثیت بصورتِ خاندان رسولِ پاک حاصل کر لیتے ہیں۔ جو کسی دوسرے کو نہیں مل سکتی۔

باب سوم

تقویٰ

عملی اعتبار سے جو زیادہ متقی ہوگا۔ وہی مقربِ خدا اور مکرم ہوگا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے۔

یَاۤ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔

یعنی اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت کے جوڑے سے پیدا فرمایا۔ اور تم میں مختلف گروہ اور قبیلے بنا دیئے۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک وہی شخص بزرگ ہے۔ جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

تاریخی اعتبار سے خاندانی تعارف کے بغیر نسلِ انسانی کی باہمی دقتیں، باہمی معاملات، باہمی تعلقات، باہمی کاروبار مشکل تھے۔ اِس واسطے خاندانوں کی ضرورت کا وجود بھی ملتا ہے۔ شعوب و قبائل میں اِن کا وجود ہے۔

مگر تعارف میں خاندانوں کی عملی تاریخ کا بھی دخل ہوتا ہے۔ تعارف کے معنی پہچاننے کے بھی آتے ہیں۔ جاننا علماً بھی ہو سکتا ہے۔ مگر پہچاننے میں حسب و نسب، رہنا سہنا، علم و عمل رنگ وطن خد و خال سب داخل ہیں۔

لہٰذا خاندانی روایات کا اولادِ آدم کے ساتھ موجود رہنا تعارف کے لئے اشد ضروری ہے۔ مگر حاصل کلام تکرم انسانیت تقویٰ پر ہے۔ اس تعارفِ خاندانی کے علاوہ بڑی صفت خاندانوں کی اللہ پر ایمان لانا اور اُس کے بتائے ہوئے نیک اعمال کی بجا آوری کے ساتھ ہے۔ اِس پر فضیلتِ انسانیہ کا انحصار رکھا گیا ہے۔ یہ حصر تقویٰ کے لئے ہے۔

خاندانی روایات جن کا ظاہری تعلق صرف نسلاً بعد نسلٍ چلتی پھرتی مٹی کی صورتوں سے ہے۔ جو رنگ و نسل کی صورت میں موجود رہتی ہیں۔ اور ایک روایاتِ خاندان عمل الصالحات ہیں۔ جِس میں گورے و کالے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ جس میں بلال حبشی النسل اور قریش عربی النسل کے لئے میدانِ عمل میں تقوٰی کو معیارِ شرافت قرار دیا جاتا ہے۔

اور فرمانِ مصطفےٰ اِس طرح صادر ہوتا ہے۔

لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ اِلَّا بِالتَّقْوٰی ۔

سوائے تقوٰی کے کسی عربی النسل کو کسی عجمی النسل پر کوئی فضیلت و بزرگی نہیں۔

مسلمانوں کے لیے بجائے اپنی ذات اپنے خاندان اپنے علم و ہُنر پر فخر کرنے کے خدا و رسول پر فخر کرنا چاہیئے۔ جِن کی بدولت وہ اشرف المخلوقات کے مرتبہ کے ساتھ خیر الامم ہُوئے۔ اسلامی شرافت یہ ہے۔ کہ انسان اپنی انسانیت کے جوہرِ اصلیہ کے ساتھ بندگی کرے۔ اور اُسے چاہیئے۔ کہ ہمیشہ اپنی ہر تعریفی حیثیت کی نفی کرے۔ اور اپنے آپ کو منفی جانے۔ اور اللہ تعالےٰ کو مثبتِ حقیقی گردانے۔

وہ زندگی کی تمام قوتوں کا منبع خدا کی ذات کو قرار دے۔ فی الحقیقت فقر و غنا ہی وہ خالصتاً نیکی ہے۔ جس کا ظاہر و باطن تزکیۂ نفس کے ساتھ پاک ہو کر اتنا خالص ہو جاتا ہے۔ کہ اُس سے کسی طرح بھی مضرات کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

بشرطیکہ اِس فقر و غنا کی بنیاد تقوٰی ہو۔ اور جستجوئے حقیقت ہو۔ ایسا فقر آئینہ بندگی میں جس قسم کی آسودگی چاہتا ہے۔ وہاں دوسروں کے لئے بھی اطمینان پسند کرتا ہے۔

انبیائے کرام کی بنائے عمل تقوٰی تھا۔ اِسی وجہ سے وہ انسانیت کے مونس و غمگسار تھے۔ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اُنہوں نے جو بھی تزکیہ و ریاضت کی اُس کا منشا خدمتِ انسانی سے دُوری نہیں تھا۔ بلکہ وہ اُن نفسیاتی مہلکات کے خلاف بصورتِ جہاد مشق کرتے تھے۔ جو انسانیت کے دلوں کو کسی طرح بھی دُکھ دینے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

تمام انبیاء و مرسلین کے نزدیک اللہ کو پانے کے دو ہی ذریعے تھے۔ ایک خالصتاً اللہ کے لئے عبادات دوسرے خالصتاً اللہ کی خوشنودی کے لئے اُس کی مخلوقات کی خدمات جن کی انسانوں کو

ضرورت درپیش آسکتی ہے۔

تمام انبیار نے فقر و غنا کو اپنا اساسی دستور اس واسطے بنایا تھا۔ کہ اس طرز میں طبائع انسانیہ پر ملوکانہ دباؤ نہیں پڑتا۔

ریاضتوں کے زمانہ میں انہوں نے نورِ باطن کے ساتھ اللہ کی اتنی خوشنودی اور تقرب حاصل کر لیا۔ کہ خدا نے انہیں انسانیت میں درجۂ امامت پر فائز کیا۔ اور امامت کے فرائض سونپنے کے بعد انہیں عبادات و معاملات عطا فرمائے۔ اور دونوں کی ادائیگی کا حکم لوجہہ اللہ کی بنا پر دیا۔ اور انہیں بتایا۔ کہ اللہ سے ڈرنے والے ہی اِن احکامات کی بجاآوری کر سکتے ہیں۔

اُن کو طرزِ خدمت کے انداز سکھائے۔ جو فقر و غنا کی صورت میں بیک وقت عبادات کی انجام دہی۔ اور بیک وقت خدمتِ خلق کی انجام دہی میں اُن کی راہبری کرتے تھے۔

جہاں جاہ و حشمت سے حکمرانی کی جائے۔ وہاں دلآزاری کے زیادہ امکانات موجود ہوتے ہیں اس واسطے کہ انسانی طبائع دبدبۂ شاہی سے سینوں کے اندر دبک جاتے ہیں۔ جس سے انسانیت لرزہ براندام رہتی ہے۔ یہی لرزہ براندام ہونا انسانیت کو دکھ میں ڈالنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ اُس خوف کی علامت ہوتی ہے۔ جو اپنے جیسے ایک انسان کی طرف سے پیدا ہوئی ہو۔ بالآخر یہی دبدبہ انسانیت میں ایک عظیم مردم آزاری اور جذبات کشی بن جاتا ہے۔ جس سے انسانی حقوق بے دردی سے پامال ہوتے ہیں۔

بادشاہت کسی رنگ میں بھی ہو۔ چاہے آج کے جمہوری طریقوں سے ہی کیوں نہ ہو۔ حکمرانوں میں تزکیۂ نفس اور ضبطِ نفس کے فقدان کی بنا پر دبدبۂ شاہی پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر وہ مدت العمر تک حکمرانی کرنے میں کامیاب بھی کیوں نہ ہو جائیں۔ انسانیت اپنے دلوں میں اُن کی طرف سے اذیت محسوس کرتی ہے۔ اور اُن کی ناکامی میں مسرت پاتی ہے۔ کہ اُسے ایک کرب ناک دباؤ سے نجات ملی ہے۔ برخلاف اِس کے فطرت کے مقاصد کو جاننے والی ہستیاں اور صالحانہ تہذیب سازی کا صحیح اندازہ لگانے والی شخصیات اگر حکومت کریں گی۔ تو اُن سے صرف وہی ذہن اختلاف کریں گے۔ جو جارحیت پسند ہوں گے۔ مگر عوام الناس بہرحال اُن سے مطمئن رہیں گے۔

ایسے لوگ اگر کامیاب ہو جائیں۔ تو عوام الناس کی خوشیاں اُن کی عاطفت میں پھلتی پھولتی اور سکون پاتی ہیں۔ اور اگر کسی وجہ سے انسانی اضداد کے غالب آنے پر ناکامیاب ہو جائیں۔ تو ایسی حالت میں عوام الناس کی رُوحیں سخت مایوس ہو کر پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی اچھے لوگوں کی تاریخ نہایت اچھائی کے ساتھ لکھی اور یاد کی جاتی ہے۔

انبیائے کرام سے اکثر و بیشتر برگزیدگانِ رب العالمین اسی راہِ حق میں قربان ہوئے۔ مگر اُن کی تاریخِ مقدس عوام الناس کے ذہنوں میں محفوظ اور راز بر رہی۔ جس کو نہایت حفاظت کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لا کر لوگوں تک پہنچایا گیا۔

وہ تمام شخصیات جنہوں نے بر بنائے تقویٰ تزکیۂ نفس کیا۔ اور ہمہ وقت وہ ایک ایسی طاقت کے سامنے جواب دہ ہونے کے متعلق سمجھاتے رہے۔ جو انجام کی مالک ہے۔

بس اس میں اُن کا یہی منشا تھا۔ کہ لوگ خلوت و جلوت میں اُس مالک و مختار سے ڈریں۔ جس کے سامنے انہیں اپنا اور دوسرے لوگوں کے حقوق کے متعلق جواب دینا ہے۔ اور اُسی کے بتائے ہُوئے راستہ پر چل کر حیاتِ دوام پالیں۔

اور یہ کہ فطرت کی ناگہانی تعزیرات سے بچتے ہُوئے نسلِ انسانی کی حفاظت کریں۔

یہ وہ فقر و غنا تھا۔ جس نے تخت و تاج پر بھی اپنے غیر جارح وطیروں کو فراموش نہیں کیا۔ اور چٹائی پر بیٹھ کر بھی وہ وہ انسانیت نوازیاں کیں۔ جن کی مثال نہیں مل سکتی۔

اُن تمام نے اپنے سادے لباسوں، سادے مکانوں اور سادے حالات کے ساتھ عوام کا ساتھ دیا۔ اور دن بھر کی خدمت سے فارغ ہو کر رات بھر اللہ کی عبادت کی۔ اور مخلوقات کی نجات و فلاح کے لئے دعائیں مانگیں۔

یہ لوگ قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔ اکثر آبادیوں سے ویرانوں کی طرف زیادہ غور کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک دُنیا ایک ویرانہ تھی۔ جس کی ابتداء ویرانی سے ہُوئی۔ اور جس کی انتہا ویرانی پر ہوگی۔ اس واسطے وہ تجسّس کے لئے پہاڑوں، بیابانوں اور خلوت گاہوں میں چلے جاتے تھے۔

آخر میں سرورِ کائنات سُلطانِ دو عالم محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ سب سے بڑی سطوت و جلالت کے مالک نے سب سے بڑی عاجزی کا اظہار فرمایا۔ آپ کے

فقر و غنا کا یہ عالم تھا۔ کہ آپ نے کبھی ایک مرتبہ بھی دنیا کو اِس پسندیدگی سے نہیں دیکھا۔ کہ اُس سے کچھ خواہش پوری کر سکیں۔

اگر دنیا میں رہے۔ تو محض اس واسطے کہ اِس میں اولادِ آدم آباد ہے۔ جس کو ایک آخری اور کامل و مکمل خدمت کی ضرورت ہے۔

آپ نے مکہ و مدینہ کی پہاڑیوں میں جو عبادات انجام دیں۔ اور جو جو تفکرات فرمائے۔ اُن سب کا منشا اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے ساتھ انسانیت کے لئے نجات حاصل کرنا تھا۔

آپ نے بال بچوں میں اور مکانات میں اِس واسطے زندگی بسر کی۔ کہ لوگ رہبانیت سے بچیں۔ اور خدمتِ انسانیت سے فرار نہ کریں۔

اِس فقر و غنا نے دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہوں کے ایوانوں میں رعشہ پیدا کر دیا۔ اور انسانی عوام کی آنکھیں بینا ہوئیں۔ انہوں نے زندگی میں خوشی حاصل کرنے کی فرصت پائی۔ ایک آخری فقر و غنا نے پوری انسانیت کو عبادتِ ربانی کے ساتھ آئینِ حکومت دیا۔ جس کے ساتھ ساری انسانیت امان پا سکے۔ اور بغیر کسی خوف و خطر کے راہِ نجات پر مسلسل اپنا سفر جاری رکھ سکے۔

آپ نے آخری نبی ہونے کی حیثیت میں جس فقر و غنا کا مظاہرہ کیا۔ وہی درحقیقت دستورِ فطرت ہے۔ سلطانِ دوعالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آخری مرسلانہ فقر و غنا کا مطلب سمجھ جانے سے خدا کی خدائی اور خدا کا راز مِل جاتا ہے۔

کامل فقرائے اسلام کے نزدیک دنیا میں ہر چیز میراث ہو سکتی ہے۔ مگر فقر و غنا صرف اُسی کا ورثہ ہو سکتا ہے۔ جو عقل و دِل اور نگاہ سے اللہ تعالےٰ کا بندہ ہو جائے۔ اور صرف اُسی کا ہو جائے۔ دنیا اور اہلِ دنیا سے صرف اِسی اُمید پر موافقت کرے۔ کہ شاید اِس طرح لوگ راہِ راست پر آ سکیں۔

اگر اللہ کے سِوا اس کے خیالات ماسوا اللہ کی طرف مرتکز ہو جائیں۔ تو اپنے آپ کو غیر اللہ کا غلام تصوّر کرے۔

غلامی بہت سی صورتوں میں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں سب سے

اونچی منزل و مقام بادشاہت ہے۔ سب لوگ بادشاہوں کے غلام ہوتے ھیں۔ اور بادشاہ کسی کے غلام نہیں ہوتے۔

مگر ایسا نہیں۔ بلکہ نفسانی حکمران اپنے نفس اور اُس کی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں۔ اور وہ انسانوں پر حکمرانی اس لیئے کرتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرسکیں۔ اِس طرح بادشاہ و حکمران بھی غلام ہوئے۔

نفس وجودِ انسانی میں سب سے زیادہ غلیظ مقام ہے۔ جس طرح انسانی آبادی اور انسانی معاشرے میں انسانیت نے کراہیت کے اعتبار سے عفونت ناک چیزوں کو نچلا درجہ دے رکھا ہے۔ اور کوئی شخص بھی کسی عفونت ناک چیز کی غلامی برداشت نہیں کرتا۔ اس واسطے کہ غلاظت سے سب لوگ اجتناب کرتے ہیں۔

بالکل اِسی طرح وجودِ انسانی میں نفس کا مقام ہے۔ کہ وہ ہر وقت غلاظت سے بھرا رہتا ہے۔ اُس کا غلام چاہے شاہ ہو یا گداگر رہے۔ انسان کا یہ تصوّر کہ بادشاہ غلام نہیں ہوتے۔ یہ احساسِ کمتری ہے۔ جو اللہ تعالےٰ سے جدا ہونے پر انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔

عالمِ دنیا میں بھنگی سے اجتناب ناجائز ہوسکتا ہے۔ اِس واسطے کہ وہ معاشرے کی نہایت ذلّت کے طور پر خدمات انجام دیتا ہے۔ وہ معاشرے کا ایک ناقابلِ فراموش عنصر ہے۔

مگر نفس کی غلامی ہزار بیماریوں اور ھزارِ خرابیوں کی جڑ ہے۔ نفس کا غلام خود غرضی کا شکار ہو کر مکر و فریب میں اُتر آتا ہے۔ نفس کا غلام مخدومیت کا پرستار ہو کر خادموں کی بہتات چاہتا ہے۔ اور جب بھی خدام کو خدمت میں کِسی طرح بھی کم پائے۔ اُن پر دستِ ظلم دراز کرتا ہے۔

اور خدام کی طویل خدمات کو فراموش کرتا ہے۔ جس سے خدام کے دِلوں کو بے حد صدمہ پہنچتا ہے۔ گویا کہ وہ جیتی جاگتی ظلم و ستم کی تصویر بن جاتا ہے۔

نفس پرست بخیل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کا حق کھا کر بھرا اُنہیں بھوکا رکھتا ہے۔ تاکہ وہ کمزور ہو کر اُس کے مقابل نہ آسکیں۔

نفس پرست کام چور ہوتا ہے ۔ اُس کی عادت ہو جاتی ہے ۔ کہ وہ اپنے ذاتی کام جو اُس پر خود فرضِ منصبی کے طور پر لازم ہوتے ہیں ۔ اور قابلِ ادائیگی ہوتے ہیں ۔ دوسروں کے کندھوں پر ڈالتا ہے ۔

اس کے مختصر سے دھندے جو صرف اس کی ذات یا اُس کے خاندان تک محدود ہوتے ہیں ۔ اُس کی خود غرضی کی بنا پر ہزار کندھوں کے لئے وبالِ جان بنے رہتے ہیں ۔

نفس پرست عیش و طرب کا خوگر ہو جاتا ہے ۔ اور اِس عیش و طرب میں وہ بہتات سے ضیاعِ مال کرتا ہے ۔ اور اِس ضیاع میں جوں جوں وہ بڑھتا جاتا ہے ۔ اُس کے بے جا اصراف میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ۔ جن کو پورا کرنے کے لئے اُسے خدام کے گاڑھے پسینے کی کمائی اپنی طرف کھینچنا پڑتی ہے ۔ اس کھینچاؤ میں وہ ہزار حیلے بہانوں کی راہ نکالتا ہے ۔

وہ اپنے اس دجل و کینہ اور فریبانہ ظلم کو مکمل کرنے کے لئے منصوبے بناتا ہے ۔ اور اُن کو جامہ پہنانے کے لئے نمائندے پیدا کرتا ہے ۔ اور بہت سے شریفوں اور سادہ لوح جانوں کو اذیت دینے کے لئے اُن سے کام لیتا ہے ۔

اِس طرح بہت سے لوگ اخلاق باختہ ہو کر اس کی جماعت بن جاتے ہیں ۔ وہی نمائندے ہاتھوں ہاتھ لے دے کر عادتِ شنیعہ کا سبق سیکھ لیتے ہیں ۔ اُن میں پیشہ ورانہ فریب بار بار ظلم و عدوان کو پھلنے پھولنے کا موقع مہیا کرتا ہے ۔

نفس پرست دادِ عیش حاصل کرنے کے لئے بھی اُن ہی مظلوموں کی طرف رجوع کرتا ہے ۔ جو اُس کے جور و ظلم سے نڈھال نیم جان ہو کر بے بسی کی زندگی بسر کرتے ھیں ۔

وہ اِس قابل نہیں ہوتے ۔ کہ اپنی گوناگوں مصیبتوں میں کسی نفس کے بندے عیش و طرب کے دلدادے کو دادِ عیش دیں ۔

چونکہ ایسا کرنے میں اُن کے زخموں پر نمک پاشی ہوتی ہے ۔

مگر نفس پرست اِن دلوں کے زخمیوں ، مجروحوں ، بے بسوں اور بے کسوں سے ضرور دادِ عیش

لیتے ہیں۔ اِس طرح وہ ہمہ گیر ظلم کرنے کے موجد و مؤید بن جاتے ہیں۔

نفس پرست حلم و تواضع سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اُن کا تبسم، اُن کی مرّوت محض نمود و نمائش کے لئے ہوتی ہے۔

اور وہ صرف اُن لوگوں سے ہی مصنوعی برتاؤ کرتے ہیں۔ جن کے ذریعہ اُن کا نفس خوش ہو۔ اُن کی اِس مروت سے خدام کو کہیں جزوی حصہ بھی نہیں مل سکتا۔

نفس پرست ضمیر کے جھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ بہت سے ایسے بھیانک جرائم کرتے ہیں۔ اور ایسے گھناؤنے گناہ کے عادی ہوتے ہیں۔ کہ معاشرے کا کوئی فرد اُن کو برداشت نہیں کر سکتا۔

چنانچہ وہ اُن کو پورا کرنے کے لئے زبان کی چوری، ہاتھ کی چوری، خلوت و جلوت کی چوری، کسی کے مال و جان اولاد اور آبرو پر معاصی کے ساتھ ناکہ بندی کرنے کی چوری پر پردہ ڈالنے کے لئے جھوٹ بولتے ہیں۔

اپنی مصنوعی شرافت منوانے کے لئے دوسرے کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور اپنے عیب کو چھپانے کے لئے اپنے ساتھ بہت سے جھوٹوں کو نشوونما دیتے ہیں۔

دنیا میں جھوٹ نے جتنا فروغ حاصل کیا ہے۔ اُس کے بانی نفس کے پجاری اور نفس پرست ہیں۔

عیش جرائم کی ماں ہے۔

حدیث شریف میں شراب کو اسی واسطے اُمُ الخبائث کہا گیا ہے۔ کہ شراب عیش کی طرف لے جانے والی ہے۔ اور شرابی عیش پرست ہونے کے بعد ضمیرؔ اخلاق سے محروم ہو کر ظاہرؔ انفسانی تہذیب کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔

اس کا مذہب صرف یہی ہوتا ہے۔ کہ معاشرہ میں معزز مقام حاصل کر د۔ اور شریف کہلاؤ۔ اور نفس کی خواہشات کو پورا کرتے چلے جاؤ۔ یہ خیال بنیادِ کذب پر قائم ہوتا ہے۔ اور اس خیال سے برائیوں کی افزائش ہوتی ہے۔

نفس پرست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طرف سے اایسا مخترع مذہب پیش کرتا ہے۔ جس

میں تن آسانی کی گنجائش ہو۔ اور سختیِ منزل سے نجات مِل سکے۔

اِس کے لئے وہ تاویلات سے کام لیتا ہے۔ اور اُن حقیقی راہوں کے نقوش ختم کرنے کے لئے ہر نئی سے نئی چال اختیار کرلیتا ہے۔ جن کے حق ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔

اِس طرح دنیا میں مذاہبِ حقہ میں رخنہ اندازی کی تمام تر ذمہ داریاں بھی نفس پرستوں پر عائد ہوتی ہیں۔

اگر یہ نفس پرست سانپ کی طرح خوبصورت زہریلے ناگ دنیا میں نہ ہوتے۔ تو انسانیّت مذاہبِ حقّہ پر چلتی ہوئی آخرالامر ضرور مذہبِ اسلام کے دامنِ عافیّت میں پناہ لے کر نجات پالیتی۔

اِس برگشتگیٔ حق وصداقت کی ذمہ داری بھی اِنہی نفس پرستوں پر عائد ہوتی ہے۔

باب چہارم

نظریۂ اسلام اور

تقویٰ

مذہبِ اسلام ایسا نظریۂ حق ہے۔ جس کی پہلی ضربِ کاری نفسِ امارہ پر لگتی ہے۔ اسلام نفس کے مخالف نہیں۔ بلکہ نفس کی اُن عادات کے خلاف ہے۔ جو انسان کو بہمیت کی طرف لے جاتی ہیں۔

اسلام کے نزدیک نفس کے جائز مطالبات پورا کرنا بھی تقویٰ میں داخل ہے۔ وہ نفس پر نظریات حقہ کے تابع لگام ڈالتا ہے۔ اسلام کے نزدیک اگر نفس پر ضوابط کی لگام نہ ڈالی جائے۔ تو یہ لوگوں کی حق تلفی کرنے سے باز نہیں آسکتا۔

نفس کی عادت آگ کے مانند ہے۔ کہ اِس کے سامنے جو ایسی چیز آجائے۔ جس کو آگ لگ سکتی ہو تو وہ اُسے جلا ڈالتی ہے۔

یہ آگ کا قصور نہیں۔ بلکہ آگ اہلِ عقل وارادہ کے ہاتھوں میں آنے کے بعد اگر کسی چیز کو جلائے تو یہ قصور وجرم آگ لگانے والے کا ہوتا ہے۔

بعینہٖ نفسِ انسانی ارادۂ عقل کی معیّت میں اگر جُرم کرے۔ تو یہ نفس کا قصور نہیں۔ بلکہ اس ارادہ وعقلِ انسانی کا جرم ہے۔ جس کی تحویل وتصرّف میں نفس ہوتا ہے۔ یہ نفس بہائم وچرند وپرند کے پاس بھی ہوتا ہے۔ مگر غیر مکلّف۔

اِس واسطے کہ وہ عاقلانہ ارادہ سے مستثنٰی ہوتے ہیں۔ اُن کا نفس نفسِ محض ہوتا ہے۔ جو

فارغ عن العقل ہونے کی حالت میں اُن تکلفات وقیود سے مبرا ہوتا ہے۔ جن تکلفات میں نفسِ انسان مبتلا ہے۔

اسلام نے نفسِ انسان کو بہمہ وُجوہ معراجِ تقویٰ کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ نفس جنوّں اور انسانوں کو بقیدِ عقل وفکرِ فہیمانہ تفویض ہُوا۔ تاکہ فرشتوں کے بعد ایک ایسی مخلوقات کی قسم بھی میدانِ عمل میں آئے۔ جو نفس وشیطان کی کشمکش کی حالت میں تعمیلِ احکامات کی بجاآوری کر کے یہ ثابت کر سکے۔ کہ خلافتِ ارضی کے صحیح حقدار انسان ہیں۔

جنّات بھی ذی عقول ہیں۔ اور نفس کی وجہ سے مکلف بھی ہیں۔

مگر آتشی ہونے کی وجہ سے وہ مغلوب الغضب اور مغلوب الہوس ہیں۔ اِس واسطے وہ انسان کے مقابلے میں مفضول ہیں۔ اور مقابلتاً تمام مخلوقات سے زیادہ انسانی معاشرت دشوار تر ہے۔

اِنسان تمام مخلوقات سے افضل ہے۔ اِس واسطے کہ اُس کی راہِ حیات میں نسبتاً زیادہ ترددات ہیں۔ وہ خاکی جسم رکھتا ہے۔ وہ خزینہ معرفت ہے، وہ آئینہ حق نما ہے۔

وہ سینۂ گیتی کی آبرو ہے۔ وہ ارض وسما کا نورِ نظر ہے۔ آتش آب و باد و خاک اس کے چاکر ہیں۔ وہ بحر وبَر پر متصرف ہے۔ سمندر کے سینے پر حکمرانی کرنے والا ہے۔ آسمان کی بلندیاں بھی اس کی رفعتِ حکیمانہ کے سامنے سرنگوں ہیں۔ جنّات جیسی مہیب ترین مخلوق بھی اس کی کرامت کے سامنے عاجز اور دم بخود ہیں۔

اِس کے درِ عالیہ پر چرند وپرند اور جنّات نے گدائی کی۔ یہ خاکی اپنی مُشتِ خاک میں وہ وہ اعجاز انگیز واقعات چھپائے ہوئے ہے۔ کہ ساری خلائق اس کے اعجاز کے سامنے ایک پابہ زنجیر نوکر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اِسی واسطے عقیدۂ توحید کی امانت کا بار زیادہ اسی انسان زادے پر ڈالا گیا ہے تاکہ ایک ازلی وابدی عقیدہ کے ساتھ انسان زادہ ہی بالآخر مقصدِ زیست کو جامۂ عمل

پہنا سکے۔

اگر انسان نفس کی لااُبالی کا شکار نہ ہو۔ بلکہ نفس پر حکمران ہو جائے۔ تو یقیناً وہ اللہ کی قدرت کا مظہر بن جائے۔ اور نیکیوں کا سرچشمۂ حیات۔

دنیا میں جتنے قبیح ترین جرم پیدا ہوئے۔ اُن کا بانی مبانی نفس ہے۔ اور نفس پرست لوگوں کے ہاتھوں میں نفس بداخلاق ہوتا ہے۔ جس نے نفس پر قابو پالیا۔ اُس نے مقاصدِ حیات پر فتح پالی۔ وہ بامراد ہُوا۔ فطرت کی تمام تائیدات اس کے شامل ہیں۔ وہی صاحبِ تواضع ہے۔ مردِ حق ہے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۔

قرآنِ کریم کی یہ آیت جنت کی بشارت اُن ہی اہلِ ایمان کو دیتی ہے۔ جنہوں نے خوفِ خدا کی بنا پر اپنی خلوت گاہوں میں بھی گناہ کرنے کی جرأت نہ کی۔ اور گناہ سے اجتناب کیا۔ اور اس سے دست کشی کی۔ اور نفس کو بُری خواہشات سے روکا۔ پس جنت اُن کا ٹھکانہ ہے۔

اِس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالےٰ نے نفس کے گناہ سے بچنے پر جنت کی بشارت دی ہے۔ جس کے کرنے کا کھُلا موقعہ مِل رہا ہو۔ اور کوئی روکنے والا نہ ہو۔

مگر اس گناہ سے صرف اِس واسطے اجتناب کیا جا رہا ہو۔ کہ خدا دیکھتا ہے۔ یہ اجتناب عن المعاصی اسلامی تقوٰی سے مِلتا ہے۔ جو بر بنائے ایمان باللہ میسّر آتا ہے۔ اور متقی کے معنے ڈرنے والوں کے ہیں۔ اور خدا سے ڈرنے والوں کو ہی پرہیزگار کہا گیا ہے۔

اسلامی تقوے کی بنا خوفِ الٰہی پر رکھی گئی ہے۔ جو متقی کے دِل پر مسلط ہو کر حکومت کرتا ہے۔ اور دل کو ہمیشہ اور ہمہ وقت خوفِ الٰہی میں مبتلا رکھتا ہے۔ اور جملہ وساوسِ شیطانی سبیلِ نفس پر دِل کو متاثر کرتے ہیں۔

اور اگر دِل اُن سے متاثر ہو جائے۔ تو اقلیمِ جسمانی کا کوئی حصّہ معاصی سے متاثر ہوئے بغیر

نہیں رہ سکتا۔ اور لامحالہ گناہ کی زد میں آ کر ارتکاب جرم کر لیتا ہے۔

جب قلب و نظر اور جسم کے مختلف اعضا و جوارح گناہ کرنے پر متحدہ طور پر کمربستہ ہو جائیں۔ اور بار بار ایسا کریں۔ تو اُن کا متفقہ ارتکاب پورے وجود کو گناہ کرنے کا عادی بنا دیتا ہے۔ اور کچھ مدت بعد وجود عادتاً جرم پسند ہو جاتا ہے۔

یہ ڈرنے کی عادت پروردگارِ عالم نے فطرتاً ہر چرند و پرند اور ہر انس و جان حتیٰ کہ ہر ذی جان اور غیر ذی جان کو عطا کر رکھی ہے۔ اِسی ڈر کی بدولت ہر چیز سے خوف ختم ہو جائے۔ تو وہ اپنے ضوابط سے الگ ہو کر بکھر جاتی ہے۔ اور یہی بکھرنا استقامتِ شے کو متزلزل کر دیتا ہے۔ اور یہی متزلزل انجام کار اس شے کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔

مگر انسانی خوف و رجا اور دوسری چیزوں کے خوف و رجا میں بڑا عظیم فرق ہے۔ دوسری چیزوں کا بے خوف ہونا صرف اُن کی ذاتی تباہی تک ہی محدود ہوتا ہے۔

مثلاً پتھر کا اپنی جگہ سے لڑھک کر گر جانا آگ کا بجھنا۔ چرند پرند کا تزلزل صرف اُن کی نجی زندگی تک ہی محدود ہوتا ہے۔

مگر انسان کا بے خوف ہو کر متزلزل ہونا پورے انسانی معاشرہ کو منتشر اور پراگندہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

اِسی طرح عوام سے خواص کی لغزش کہیں زیادہ معاشرۂ انسانیہ کے لئے پراگندگی اور زوال کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

عالم و فاضلِ قوم کی لغزش پورے عالم کی لغزش کا پیشِ خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

اِذَا ضَلَّ الْعَالِمُ ضَلَّ الْعَالَمُ ۔

اسلام میں تقویٰ کی زیادہ ذمہ داری علمائے اُمت پر رکھی گئی ہے۔ اہلِ اسلام کو قران مجید کی زبان مبارک میں علمائے اُمت کے بارے میں وضاحت کے ساتھ تعلیم دی گئی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔

یعنی تم میں ایک ایسے گروہ کا ہونا ضروری ہے۔ جو تمہیں نیکی کی طرف بلاتا رہے۔ اور بدی سے

منع کرتا رہے۔ اور امت کو بھی اسی تقوٰی کی بنا پر بہتر اُمّت قرار دیا گیا۔

اور فرمایا۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔

یعنی تم ہی تمام امتوں سے بہتر امت ہو۔ اس واسطے کہ تم لوگوں کو اچھائی کی طرف بلاتے ہو۔ اور بُرائی سے منع کرتے ہو۔

خود متقی ہو کر لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا اور بُرائی سے منع کرنا ہی تقوٰی ہے۔ تقوٰی کے شرعی معنی خوفِ خدا کی بنا پر ہر قسم کی بُرائی سے بچنے اور ہر قسم کی نیکی کو اختیار کرنے کے آتے ہیں۔ اسلامی تقوٰی اطاعتِ امیر سے منسلک ہونے کے بعد ہی صحیح خطوط پر چلنے کے قابل ہوتا ہے۔

تقوٰی کوئی معمولی مضمون نہیں۔ بلکہ یہ مرجع العلوم والاعمال ہے۔ تمام علومِ اسلامیہ صرف تقوٰی کی تعلیم دیتے ہیں۔ تقوٰی صرف نماز ہی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مومن کی نیت سے لے کر جملہ باطنی خیالات اور اُس کے ظاہری حرکات و سکنات اور اُس کے اعمالِ صالحہ پر مکمل ہوتا ہے۔

اس کو ہر کام میں ملحوظِ خاطر رکھنے کی تاکید ہے۔ یہ نہیں کہ صرف بوقتِ نماز ہی خوف کرے۔ اور بوقتِ معاملات اُس کو فراموش کر دے۔

بلکہ اسلام میں ہر شعبۂ زندگی میں چھوٹے بڑے عمل کے ساتھ ساتھ اُسے جاری و ساری رکھنے کا حکم ہے۔ اسلام میں تقوٰی چونکہ اساسِ اعمال ہے۔ لہٰذا اس کے لوازم بھی نسبتاً دوسرے امور کے زیادہ ہوں گے۔ اِن لوازمات میں روحانی و مادی دونوں لوازم داخل ہیں۔

کچھ تو ارکانِ تقوٰی ہیں۔ اور کچھ معادنِ تقوٰی ہیں۔

اللہ تعالٰے اور اُس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کی پابندی کرنا، آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنا۔ یعنی تورات، انجیل، زبور اور آخری کتابِ مقدس قرآن مجید پر اور قیامت پر کہ وہ ضرور آئیگی۔ جہاں سب نے جواب دہی کرنی ہے۔

یہ تقوٰی کے بنیادی ارکان ہیں۔ اِن میں اول الذکر اور ثانی الذکر کی عدم موجودگی میں ایمان حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا معدوم الایمان اِس تقوٰی کا جو مخصوص بالایمان ہے۔ دعوٰی

ہی نہیں کرسکتا۔ جس کی اسلام تاکید کرتا ہے۔

بنابریں تقوٰی کے لئے سب سے مقدم اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے۔

اولیائے اُمّت اور صلحائے اُمّت نے فرمایا۔

کہ ہمہ وقت اپنے باطن میں جھانک کر دیکھ لیا کرو۔ کہ خدا اور رسول کے بارے میں کہیں ایمان میں تزلزل وضعف تو واقع نہیں ہُوا۔

اور اِس بات کے معلوم کرنے کا بہتر طریقہ یہی ہوسکتا ہے۔ کہ دنیائے فانی کی محبت اللہ اور رسول سے بڑھتی ہُوئی معلوم ہو۔ اور خلافِ شریعت چلنے پر خوفِ خدا نہ رہے۔

پس ایمان کے قوی اور ضعیف ہونے کی یہی دو علامات کافی ہیں۔ کہ کیا شریعت پر چلنے کے لئے رغبت ہے۔ اور دورئ شریعت شاق گذرتی ہے۔ کیا خوفِ خدا کی کمی ہے۔ اور شریعت پر چلنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

پس ایک حالت ایمان کے صحت مند ہونے کی علامت ہے۔ اور دوسری حالت ایمان کے ضعیف ہونے کی علامت ہے۔

اگر ایمان قوی معلوم ہو۔ تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور اُس کی حفاظت کے لئے باوضو ہوکر حرام سے بچنا چاہیئے۔ اور نماز قائم کرنی چاہیئے۔ اور سچ بولنے کی عادت پیدا کرنی چاہیئے۔

پھر بار بار توبہ کے ساختہ کردہ اور ناکردہ گناہوں سے رجعت الیٰ مغفرت کرنی چاہیئے توبہ واستغفار انسانی بدن کا وہ جھاڑو ہے۔ جس سے روزمرہ بدن کے گھر کو پاک وصاف کیا جاتا ہے۔

جس طرح گھر کو جھاڑو سے صاف کیا جاتا ہے۔ گھر میں جتنا زیادہ جھاڑو دیا جائے۔ گھر اتنا ہی زیادہ پاک وصاف رہتا ہے۔ جھاڑو جتنا کم دوگے اتنا ہی صفائی کم ہوگی۔

بالکل بعینہٖ مومن جتنا زیادہ استغفار پڑھتا ہے۔ اُتنا ہی زیادہ اُس کا باطن صاف و شفاف رہتا ہے۔

مومن کا دل عام نہیں۔ بلکہ وہ اللہ تعالےٰ کا مسکن ہونے کی بنا پر خاص الخاص ہے۔

حدیث شریف۔

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللهِ۔

مومن کا دِل اللہ کا گھر ہے۔

اور کون ایسا صاحب ہوگا۔ جس کو اپنے گھر آنے کا شوق نہ ہو۔ ہر مالکِ خانہ اپنے گھر میں آنا پسند کرتا ہے۔ ہر مالک کی تمنا ہوتی ہے۔ کہ اُس کا گھر نہایت پاک و صاف ہو۔ تاکہ وہ جب بھی گھر آئے۔ تو گھر کی صفائی و پاکیزگی اُس کے لئے مزید وجۂ طمانیت ہو۔ یہ مثال تو مجازاً ہے۔

ایک مالکِ خانہ طبعاً طہارت پسند ہو۔ اور وہ اپنے بال بچوں کو اور چاکروں کو یہ تلقین کرے۔ کہ میں اُسی وقت گھر آیا کروں گا۔ جب میرا گھر بار اور اُس کے گلی کوچے بے حد صاف و شفاف ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہُوا۔ تو میں گھر نہیں آیا کروں گا۔ میرا نہ آنا تمہاری غلطی و نادانی پر محمول ہوگا۔

چنانچہ مالکِ خانہ کی اِس شرط کو پورا نہ کیا گیا۔ اور زمانۂ دراز گذر جانے تک مالک گھر واپس نہ تشریف لایا۔ تو اِس شرط بالمشروط کے ایفا نہ ہونے پر مالک کا نہ آنا عین صداقت پر مبنی ہوگا۔

یہاں قصور اہلِ خانہ کا ہے۔ جنہوں نے شرطِ طہارت کے مواعید پورے نہ کئے۔ اور اس طرح مالکِ خانہ کو روکا یا ناراض کیا۔

اتفاق سے بعض دفعہ مالکِ خانہ اپنی ذاتی التفات کی بنا پر گھر کی جانب آتا ہے۔ مگر گھر کے قرب و جوار کو غلاظت سے پٹا پاتا ہے۔ تو وہیں سے واپس چلا جاتا ہے۔

چونکہ وہ طبعاً طہارت پسند ہے۔ اس کی تمنا تھی۔ کہ وہ اپنے گھر جائے۔ بال بچوں سے ملے۔ مگر اس کے بال بچوں نے یا چاکروں نے اُس کی منشا کے مطابق اُس کے احکامات کی تعمیلاً بجا آوری نہ کی۔ جس

کی بنا پر مالکِ خانہ واپس ہو جاتا ہے۔

اِس واپس جانے میں مالکِ مکان کا قصور نہیں۔ بلکہ اہلِ خانہ کا قصور ہے۔ جنہوں نے گھر کو بوجوہ حکم ومنشائے مالک کے پاک و صاف نہ کیا۔

یہ مثال تو مجازاً پیش کی گئی ہے۔ حقیقتاً مومن کا دل اللہ تعالےٰ کا گھر ہے۔

یعنی اللہ تعالےٰ کا مومن کے دل میں گذر رہتا ہے۔

اور یہاں قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰہ فرمایا۔ قَلْبُ الْاِنْسَانِ عَرْشُ اللّٰہ نہیں فرمایا۔

اِس عرش اللہ کی قید بالایمان ہے۔ اور اسلام نے صاحبِ ایمان پر ہی ظاہری و باطنی طہارت کی قید لگائی ہے۔

قدرتی طور پر ایمانِ باللہ سے نجاستِ کفریہ تو معدوم ہو جاتی ہے۔ صرف نجاستِ بدنیہ ظاہریہ کا حکم اِس پر مستزاد ہوتا ہے۔ تاکہ مومن ہمہ وقت ظاہری و باطنی طہارت کا پیکر و مجسمہ رہے۔

اِس حالتِ مطہرہ میں پروردگارِ عالم مومن کے دل پر اُترتے ہیں۔ اور اجلال فرماتے ہیں۔ جس سے مومن کے دل میں زیادہ خشیت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ ذکر و فکرِ الٰہی میں حظ پاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اُسے طمانیت ملتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

خبردار یاد رکھو۔ کہ اطمینانِ قلبی کا دار و مدار ذکرِ الٰہی پر موقوف ہے۔ یہاں ذکرِ الٰہی کی ادائیگی سے مُراد ذکرِ مومن ہے۔

ویسے تو ساری مخلوقات اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ مگر سوائے مومن کے اللہ تعالےٰ کسی کے دل پر اپنی محبتِ خاص سے متمکن اور جلوہ افروز نہیں ہوتے۔

ایمان کے بعد عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے اور پیہم استغفار سے ہی مومن کا دِل پاک و صاف رہتا ہے ایسی حالت میں مومن کا دل زیادہ سے زیادہ یادِ الٰہی اور توجہ الٰہی کا مرکز ہو جاتا ہے۔ اور اللہ بار بار مومن کے دِل پر اُترتا اور اجلال فرماتا ہے۔

اِس کیفیت سے مومن کو بار بار معراجِ ایمانی نصیب ہوتی ہے۔ اور وہ نماز پڑھتا ہے۔

اور دوسرے حقوق ادا کرتا ہے ۔ اُس کا دل نورانیت رحمت سے عرفان پاتا ہے یہی معرفت کی اصل ہے ۔

اگر کیفیتِ ایمانی میں سرِ مو بھی فرق واقع ہو ۔ تو نورِ معرفت قلب و نظر میں کمی واقع ہو جاتی ہے جس سے طمانیت قلب مومن بھی کم ہو جاتی ہے ۔

مومن کی مطہرانہ عملی زندگی اور اُس کے کم و بیش ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی طمانیت و نورانیتِ قلب میں بھی کمی بیشی واقع ہوتی رہتی ہے ۔

جب وہ طہارت کے ساتھ اعمالِ صالحہ کی ادائیگی کرتا ہے ۔ تو اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کے زیادہ قریب پاتا ہے ۔ جب وہ اِن اوصافِ حمیدۂ مومنانہ میں کمی کرتا ہے ۔ تو اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ سے دُور پاتا ہے ۔

یعنی اِس میں اللہ تعالےٰ کی محبت و اطاعت کم ہو جاتی ہے ۔ ایسا کرنے سے دل کورانہ مرض کا شکار ہو کر یادِ الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالےٰ کی ذات پر شبہہ کرنے لگتا ہے ۔ یہ زوالِ ایمان کا دور دورہ ہوتا ہے ۔ اللہ تعالےٰ بچائے ۔ اور ایمان پر ثابت قدم رکھے ۔ آمین

باب پنجم

نفسِ امّارہ اور نفسِ لوامہ

نفس کی بے ہودگی، نفس کی طفلانہ خیالی، نفس کی بے جا ضد، نفس کی عادتِ قبیحہ، نفس کی طغیانی، نفس کا جوش و مستی، نفس کا فکرِ ثواب اور خوفِ عذاب سے تغافل۔ نفس کی حق سے برہمی، اور حق کے سامنے دیدہ دلیری۔ نفس پرست کو ہر برائی کا شکار بنا دیتی ہے۔

اور وہ بُرائی کو اپنا مستقر اور ٹھکانہ اور اپنی جائے رہائش بنا لینے پر مصر ہو جاتا ہے۔ اور اِس کی جملہ آمادگیاں بُرائی ہی کے لئے وقف ہو جاتی ہیں۔

وہ زہر ہلاہل کو تریاق سمجھ کر کھا لیتا ہے۔ اور پھر اِس پر فخر کرتا ہے۔ وہ تہذیب و تمدن انسانیت کی بلندیوں سے گر کر بد اخلاقی کو ہی اپنا ملجا و ماوٰے گردان لیتا ہے۔ وہ ہر سعادت کو سخت کرخت نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر نیکی سے چیں بجبیں ہو کر اس سے اجتناب کرتا ہے۔ وہ نیکی پر ٹھٹھا کرتا ہے۔

اِس طرح وہ فطرت کو ناراض کر لیتا ہے۔ اور ایک ایسے بے وفا نفس کی دوستی کو دوستیِ حق و صداقت پر ترجیح دیتا ہے۔ جو کسی طرح بھی اس کے لئے سود مند نہیں ہو سکتی۔

وہ حق کو چھوڑ کر ایسے دوست کو اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ جو آسودگی میں اُس سے مختلف اور بے جا مطالبات کے ساتھ ھل من مزید کے نعرے لگاتا ہے۔ جو اپنی عارضی تشنگی، خواہش کو

بجھانے کے لئے اپنی قوت سے کہیں زیادہ مطالبات منواتا ہے۔

مگر غیر آسودگی کی حالت میں یعنی بیماری و کلفت میں منزلِ مقصود سے پہلے ہی کسی سخت ویرانے میں ساتھ چھوڑ دینا اس کی عادتِ قدیمہ ہے۔ جب ضرورت نہیں ہوتی مانگتا ہے۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے۔ تو انکار کرتا ہے۔

سخت مرض کے عالم میں طبیب کی رائے پر دوائی سے انکار کرتا ہے۔ اور اپنے لاڈلے پن کی طفلانہ صورتیں بنا بنا کر دوائی یا کھانے پینے کی چیزوں سے تیوروں کے ساتھ تنفر کا اظہار کرتا ہے۔

سخت خوفناک منزل میں جب انسان کو صبر و استقامت، ہمت و جرات اور عظیم حوصلہ کی راہنمائی کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ وہاں انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور راہِ راست پر شدائد کے مقابلے سے جی چرا کر پیٹھ دکھا کر فرار اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

بیماری میں دوائی سے اجتناب۔ میدانِ جنگ اور شدید حالات میں پیٹھ پھیرنے کی دعوت سب ہلاکت میں ڈالنے والے مشورے ہیں۔ اور ظاہر ہے۔ کہ ایسی آرا ہلاکت خیز ہوتی ہیں۔

سب سے بڑا مکار، عیار، کام چور، بے وقت مصیبت میں ڈالنے والا اور ناگہانی آفات میں معاً ساتھ چھوڑنے والا، منزلِ زیست میں سخت مشکل ترین منازل میں ساتھ چھوڑنے والا، اپنوں سے بیگانہ کرنے کے بعد تنہا چھوڑ کر بھاگ جانے والا اور اغمام میں اضافہ کرنے والا، بے بسی کے عالم میں اُوندھا گرا کر دبک جانے والا بے وفا دوست نفس ہے۔ یہ محض لذّات کا خوگر ہے۔

اور قدرت نے تو نفسِ انسانی کو جائز طریقوں پر رکھنے کے بعد ایک بہلا دے کا سامان بنایا تھا۔ تاکہ انسان اس مسافر خانۂ عالم میں تھک کر رُک نہ جائے۔

بلکہ بوقتِ ضرورت جائز طور پر اُس کے پاس مطالبات کا ہونا بھی ضروری ہے۔

وہ جائز طور پر بحالتِ بلوغ شادی کرلے۔ اور جائز اولاد حاصل کرئے۔ اور اُن سے مانوس ہو۔

اچھی روزی کمائے۔ خود بھی کھائے۔ اور ساتھ اپنے بال بچوں کو کھلائے۔ دوسرے حاجتمندوں کی حفاظت برآری کرتا رہے۔

اپنے احباب واعزا کی بھی مدد کرے۔ اِس سے یتیموں، بے کسوں، مفلسوں اور قلاشوں کی خدمت بھی انجام دے۔ پڑوسیوں کے حقوق کی بھی نگہداشت کرے۔ والدین اور ذوی القربیٰ کا حصّہ بھی ادا کرے، مسافر اور بیمار پر بھی نظر رکھے۔

تاکہ وہ ایک طرف جائز مطالبات کے ساتھ ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ تو دوسری طرف منزلِ مقصود پر اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ نہ ہی نفس کو مار دے۔ اور نہ ہی نفس کے ہاتھوں مارا جائے۔

نفس کی تخلیق کا منشا درحقیقت یہی تھا۔ مگر انسان زادے نے شیطان کے وسوسہ پر ہمیشہ نفس کی بے ہنگم باتوں اور اس کی چاپلوسیوں کی حمایت و تائید کی۔

بار بار اُس کے ہاتھوں فروخت ہوتا رہا۔ اور بار بار اُس کے ہاتھوں شکست کھاتا رہا۔ پھر بھی باز نہ آیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کو راہبرِ کامل کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اور راہبر بھی ایسا ہو۔ جو اُس کی نفسانی شوخیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اُسے بار بار ہدایت کی طرف بلاتا رہے۔

جب بھی اُس کے ذہن میں اچھی بات اثر کرے گی۔ تو سنبھل جائے گا۔ اور راہِ راست پر چلنا شروع کر دے گا۔

نفس اچھا بھی ہے۔ نفس بُرا بھی ہے۔ قرآن مجید میں اس کو دو ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

نفسِ امّارہ بُرا نفس جو بُرائیوں کا شکار ہو جائے۔ اور نفسِ لوامہ نیک نفس جو نیکیوں کا حامل ہو۔ اور نیکیوں کا خوگر ہو۔ اور نیکیوں پر ایمان رکھتا ہو۔ کہ نیکی انجام کار نجات کا قطعی ذریعہ ہے۔

نفس جب نیکیوں کا عقیدۃً خوگر ہو جاتا ہے۔ تو وہ ضوابط پر اس لئے مطمئن ہو جاتا ہے۔ کہ

اُس کا انجام عافیت والا ہو گا۔ وہ اپنے حال کو مستقبل کی اُمید پر نیکی کے لئے مستعد رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ نفسِ مطمئنہ ہو جاتا ہے۔

بہت سے مطمئنین کی تعریفیں تذکرۃ الاولیاء میں مذکور ہیں۔ چنانچہ حضرت مائی رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کا ذکر ہے۔

کہ آپ جب قریب الوصال ہوئیں۔ تو ایک کمرہ میں صاحبِ فراش تھیں۔ اور زبانِ پاک پر بار بار اپنے مولا کا نام جاری ہو رہا تھا۔ معاً اپنے مصاحبوں سے ارشاد فرمایا۔

کہ میرے مہمان آگئے ہیں۔ لہٰذا تم لوگ باہر تشریف لے جاؤ۔ سب باہر تشریف لے گئے۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

لوگوں نے دیکھا۔ کہ دروازہ از خود کھُل کر پھر بند ہو گیا۔ اندر سے حضرت مائی رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھنے کی آواز بلند ہُوئی۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۔

یعنی اے نفسِ مطمئنہ اپنے پالنے والے کی طرف اپنی رضا و رغبت سے رجوع کرلے۔

موت تمام مہیب حالات سے مہیب تر حالت ہے۔ اور حالتِ موت میں اطمینان کلفتِ موت کے سبب معدوم ہو جاتا ہے۔ ہذیان و پریشانی کی انتہا ہوتی ہے۔

جب کہ سوائے درد و کرب و آہ و بکا اور خوفِ نزع کے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اپنے عزیز بھی بھول جاتے ہیں۔ بس موت جان پر آپڑتی ہے۔ اور موت ہی موت کا گھراؤ باؤ مُسلط ہوتا ہے۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔

ایسی حالت میں زندگی کی بحالی کے لئے ایک موہوم اُمید کے ساتھ مرنے والا ہاتھ پاؤں مارتا اور ایڑیاں رگڑتا ہے۔ چہرہ پر خوف و ہراس کے آثار ہویدا ہوتے ہیں۔ جس سے ہر ایک دیکھنے والا بخوبی اندازہ کر لیتا ہے۔ کہ مرنے والا اپنی اِس حالتِ زار سے سخت پریشان اور بیکل ہے۔

یہ حالت کسی پر بھی واقع ہو سکتی ہے۔ مگر مطمئنین اِس حالت کو بھی زندگی کا ایک مرحلہ قرار دیتے ہیں اور اُن کے نزدیک یہ مرحلہ محبوب کے ملنے کی آخری منزل ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ ہونے والا تھا۔ اور ہو رہا ہے۔

اُن کے نزدیک اُن کی موت بے مقصد نہیں ہوتی۔ وہ اُس کو ناگہانی نہیں سمجھتے۔ بلکہ قادر وقیوم کی رضا تصوّر کرتے ہوئے بالاستقامت اِس منزل سے گذرنے کی دعا کرتے ہیں۔

اور قادر وقیوم کی قدرت کے مظاہر میں سے اِس ہیبت انگیز واقعہ کو بھی ایک مظہر جانتے ہیں۔ اُس کا نام لے کر اُس سے اعانت چاہتے ہیں۔ اور مسنونہ دعا پڑھتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ فِیْ سَکَرَاتِ الْمَوْتِ۔

اے اللہ سکراتِ موت میں میری مدد فرما۔

یہ لوگ ہمیشہ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کو ہی نظریہ حیات جانتے ہیں۔

یعنی میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت پروردگارِ عالمین کے لئے ہے اور ہمیشہ ہر حال میں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ کا وِرد کرتے ہیں۔ اور کلمہ طیبہ اِس لئے ہمہ وقت وردِ زبان رکھتے ہیں۔ کہ خدا جانے کب موت آجائے۔ اور اللہ کے نام سے محروم ہو جائیں۔

اُن کے نزدیک سب سے بڑی کمائی ذکرُ اللہ ہے۔ وہ ذکرُ اللہ پر ہی زندہ رہتے ہیں۔ اور ذکرُ اللہ ہی اُن کی خوراک ہوتی ہے۔ ذکرُ اللہ ہی اُن کا زادِ راہ ہوتا ہے۔

وہ اِس ذکر کے ساتھ موت سے ملتے ہیں۔ اور اسی ذکر کی معیت میں قبر، حشر و نشر کے خواستگار ہوتے ہیں۔

چنانچہ انجام کار اُن کو اِس ذکرِ پاک کے ساتھ ظفرمندی ملتی ہے۔ اور موت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اپنے محبوب سے مل لیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی موت یا شہادت کی موت سے ہر طرح اپنے محبوب کے درِ اقدس پر حصولِ دیدار کے لئے دستک دیتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ نفسِ مطمئنہ کے مالک ہوتے ہیں۔ یہی لوگ فرحین و متبشرین کہلاتے ہیں۔ یہی لوگ نیکیوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔

انہی کی حکومت اللہ تعالےٰ کو پسند ہوتی ہے۔ یہی لوگ حزب اللہ ہوتے ہیں۔ انہیں کے متعلق ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۔

یعنی خبردار کہ اللہ کی جماعت ہی وہی جماعت ہے۔ جو غالب و کامران ہے۔

فی الحقیقت وہی گروہ اللہ کا گروہ کہلانے کا مصداق ہو سکتا ہے۔ جو اُس کا مقتضی ہو جائے۔ اور مقامِ بندگی کو ہمہ وجوہ جانتا اور پہچانتا ہو۔

اللہ کی جماعت اپنے تعمیلی اوصاف کی بنا پر اللہ کو راضی کر لیتی ہے۔ اور اللہ کو راضی کر لینا ہی اس کی سب سے بڑی فتح مندی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی جماعت جب اپنے اور مولا کے مابین راضی نامہ کر لیتی ہے۔ تو اُسے اپنے مالک و مختار کی جانب سے جو بڑا تحفہ ملتا ہے۔ وہ ذکرِ خدا بالفکرِ صالحہ ہوتا ہے۔

جب اللہ کے بندوں کی جماعت خفی و جلی حالتوں میں اپنے خدا کی یاد کو ہی اپنے لئے ذریعۂ نجات گردان لیتی ہے۔ اور ذکر و فکر ہی اس جماعت کی خوراک بن جاتی ہے۔

تو اس حالت میں اللہ کی ذاکر و متفکر جماعت کو اپنے مالک کی طرف سے دوسرا تحفہ جو مقصدِ بندگی کی جزائے خیر کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ یعنی اطمینانِ قلب جیسی نعمتِ عظمیٰ اُسے دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ خود خدائے لم یزل کا وعدہ ہے۔

اہلِ ذکر و فکر کو اطمینان و سکون بھی ہوتا ہے۔ یہ اطمینان اصل سے متعلق ہو کر دلوں میں راہ پاتا ہے۔

بندوں کی جماعت اس متاعِ طمانینت کی معیت میں مزید بندگی کی راہ پا لیتی ہے۔ اس طمانینت سے مراد خدا کو پا کر اُس کی حمد کو پا لینا مُراد ہے۔

غلبہ پانے کی کئی حالتیں ہیں۔ اصل غلبہ وہی ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کی تائید سے حاصل ہو۔ ورنہ انجام کار ہر غلبہ صاحبِ غلبہ کے لئے علامتِ زوال بن جاتا ہے۔

جیسا کہ اہلِ نمرود بندگانِ نفس کے غلبہ کا حال آخر اُن کے لئے مہلک ہُوا۔ اور انہیں مختلف ہلاکتوں سے دوچار ہو کر تباہیوں اور بربادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

باب ششم

بندگی اور اُس کی عملی تقسیم و تفصیل

درحقیقت بندگی ہی وہ رازِ عظیم ہے۔ جس کے لئے انسانی تخلیق کا آغاز ہوا۔ تاکہ بندگی کا اصل مقصد مفہوماً پورا ہو کر انسانوں کو راہ بندگی پر چلنے کے لئے خوشی کے ساتھ آمادہ کرسکے۔

اور اللہ تعالےٰ نے صرف لفظِ بندگی مکمل کرنے کے لئے ساری کائنات کو اس کے عوامل کے ساتھ پیدا فرمادیا۔ تاکہ وہ اس بندگی کا تجربہ کرسکے۔

اللہ تعالےٰ انسانی شعور سے بالاتر ہے۔ اُس کے منشا نے انسانی صلاحیتوں کو اور باقی کائنات کو اِس انداز سے تخلیق فرمایا۔ کہ انسانی جذبات اُن کو محسوس کرنے میں دسترس حاصل کرکے اُنکو تحت الشعور کرلیں۔

اسی لئے خدا نے اپنے آپ کو مخفی رکھا۔ اور انسانوں کو ظاہر فرمایا۔ یہ اس کا بڑا احسان ہے اب انسان پر لازم ہے۔ کہ وہ خود کو فنا کرکے اُس کو ظاہر کرے۔ جس نے اُس کو ظاہر کرکے اپنے آپ کو مخفی کیا۔

تحت الشعور رہنے والی جملہ اشیائے عالمین انسان کے سامنے خدا کو پہچاننے کے لئے ایسے اچھوتے نشانات ہیں۔ جن کی بدولت وہ اپنے فوق الادراک مالک ومختار کا علم وعرفان حاصل کرنے میں کامیابی پائے۔

احساس ومحسوس دونوں انسان کے لئے ہیں۔ یہی احساس ومحسوس انسان کی پہلی اور

آخری منزل ہے۔ ہر چیز محسوس ہے۔

کائنات اور اُس کے جملہ عوامِل انسانی ادراک کے سامنے مدرِکات ہیں۔ یہ انسانی پرِ پرواز کی زمین ہیں۔ جِن سے وہ خدا کی طرف پرواز حاصِل کرتا ہے۔

اِنسان کی اِس پرواز کی راہ میں بہت سے خفی وجلی جہاں آباد ہیں۔ جِن کو عقبات بھی کہا جاتا ہے۔ منازل مادی و مدارجِ روحانی بھی کہا جاتا ہے۔ جِن کی ابتدا ر خواہش سے ہوتی ہے۔ اور خواہشات مطالبات کے زینے ہوتے ہیں۔

یہی زینے حق و باطل میں امتیازی فرق پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ زینے صرف نفسیات کی خواہشات اور رغبات و لذات تک محدود کر دیئے جائیں۔ تو بنیادِ احساس باطل ہو جاتی ہے۔ جِس کی وجہ سے اُس کے جملہ فروعات بھی بطلانِ محض ہو جاتے ہیں۔

یہ طرز و اطوارِ زندگی محدود طور پر اہلِ دنیا کا حصّہ ہے۔ جِن کا مقصود صرف حصولِ دنیا اور اُس کی جلبِ منفعت ہے۔

اُن کی خواہشات کی اصل و فرع دونوں بظاہر نہایت نازک تر اور حسین تر ہوتی ہیں۔

مگر یہ نوعیت خزاں آور ہے۔ اِس پر بار بار خزاں آ پہنچتی ہے۔ ایک پودِ انسانی فنا کے ساتھ نابود ہو کر مایوسی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور دوسری پودِ انسانی پھر دوبارہ اُسی بہارِ ناپائیدار کی طلب میں آگے بڑھ کر پامالِ خزاں نمود و نمائش پر آسائشِ ناتمام کی عمارت قائم کر لیتی ہے۔

جِس سے مایوسیوں پر مایوسی کی تعمیر کا سلسلہ رواں دواں رہتا ہے۔ اِس مایوسانہ کڑی کو اہلِ دنیا تسلسل دینے کو دوام گردانتے ہیں۔

اور یہی مزاج اُن کو اُس منزلِ زیست پر نہیں آنے دیتا۔ جِس سے اُن کی زندگی راہِ دوام کا سراغ لگا سکے۔

اور حالِ دنیا فرزانوں کے نزدیک ایک ڈھلتے سائے یا خواب یا باد کے جھونکوں کے مانند ہے۔ اختتام کے بعد یہ موہوم کہانی ہو جاتی ہے۔

ہر چیز جو ماضی میں منتقل ہو جائے۔ اور مستقبل میں ساتھ نہ دے سکے۔ وہ بھول جانے والی داستان

ہوتی ہے۔ چاہے وہ کتنی حسین و جمیل داستانِ زندگی ہی کیوں نہ ہو۔

مگر دنیا میں کچھ حالات ایسے بھی ہیں۔ جو مستقبل کی راہنمائی اِس طرح کرتے ہیں۔ جن سے مستقبل کی جانب بڑھنے کی ایک ایسی اُمید انگڑائی لیتی ہے کہ صاحبِ دانش انسان کو دوامِ حیات کے لئے شادمانی کی راہ مِل سکتی ہے۔ اور یہ کہ وہ دائمی اطمینان پا سکتا ہے۔

یہ نظریہ تقریباً سب انسانوں کے پاس کسی نہ کسی طرح ضرور موجود رہتا ہے۔

مگر دنیاوی لذات کے دباؤ اُسے یکسر خاموش کر دیتے ہیں۔ اگر اس اُلٹے دباؤ کے بجائے سیدھا دباؤ یعنی حقیقت پسندانہ دانش کے دباؤ سے احساسات کو اُبھرنے دیا جائے۔ تو عارضی اور ناتمام انجام کی بجائے مستقل اور پائیدار جہانِ انسانی ادراک کے سامنے آجاتے ہیں۔

مگر نفسیاتی علوم بڑے بڑے علوم و معلوماتِ زندگی میں آڑے آکر صرف مادی ترقیات کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

حالانکہ علمِ نفسیات جو صرف حالات کی کچھ موہوم نشان دہی کرتا ہے۔ دامن عقلِ انسانی سے قدرت نے باندھ دیا ہے۔ جس میں منشائے فطرت یہ تھا۔ کہ انسان روزمرہ کی گذران میں اِس علمِ موہوم کو استعمال میں لائے۔

یک قلم خوفِ دشمنی اور اس سے بچاؤ کی تیاری سناٹے کے عالم میں دہشت اور اُس سے بچاؤ کے لئے خیالات کا سامنے آنا۔ اپنے اور بے گانوں کے چہروں کی حالت کا جائزہ!

کہ یہ میرے ہمدرد ہیں۔ یا نہیں۔ خفا ہیں یا راضی پھر اُن کے لئے تدارک کرنا وغیرہ۔ بیوی بچوں کی مزاج شناسی۔ مہمانوں کی کیفیت کا اندازہ لگانا۔ موسم کے حالات کا جائزہ۔ اور اُس کے انتظامات سفر و حضر میں حالات کا جائزہ۔ اور سخت حالات کے اندازہ پر اُسکے لئے تدارک حالات کے مشکل یا مشکل ترین سوالات کا حالات کے ساتھ حل۔

انسانی معاشرے کے مجموعی تاثرات کا حال جنگ و جدال کا اندازہ لگانا۔ اور بچنے بچانے پر غور و خوض۔

محبّت و نفرت میں جسم کا پھیلاؤ یا سمٹنا وغیرہ اِن ہی حدود تک اپنی دوڑ جاری رکھ سکتے ہیں۔

مگر یہ فیصلے قطعی نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی انسانی برادری اِس کی قطعیت کی دلیل مہیّا کر سکی ہے۔

جہاں تک علمِ نفسیات کا تعلق ہے۔ اور اُس کی معلومات کا پھیلاؤ ہے۔

بس وہ اِس مختصر سے موہوم احساس کے گرد گھومتا رہتا ہے۔

یہ علم اللہ تعالےٰ نے انسانوں کو محض اس لئے عطا کیا تھا۔ کہ اِس علمِ موہوم سے انسانی جسم اپنے قریبی حسن و قبح کا کم از کم جائزہ لیتا رہے۔ اور اُس کی طبیعت اِس عالمِ فانی سے لگی بندھی رہے۔

ورنہ اِس ذیلی علم کی شاید ضرورت ہی درپیش نہ آتی۔ مگر اس کے درپیش آنے سے بھی کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اِس طرح تو ہم اِس نفسیاتی علم کو چاکرِ راہ بنا کر اُس کو اپنا امدادی دستہ بنا لیتے ہیں۔

صرف ایسی حالت میں انسان شکست کھاتا ہے۔ جب حیاتِ جاوداں سے آنکھ بند کر کے صرف اِسی علمِ نفسیات کا ہی مرہونِ محض ہو جائے۔

ایسے عالم میں انسان اپنے اُن حقیقی علومِ روحانیہ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ جو اُسے عالمِ ہست و بود میں عظیم مقاصد کی راہنمائی کے لئے مقصودِ حقیقی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

اور ایسی راہنمائی سے انسانی محرومی دائمی راحت سے حرماں نصیبی پر محمول ہو کر بیگانہ حق بنا دیتی ہے۔

نفسیات کے ماہرین نے اپنے موہوم علم کو مقاصدِ حقہ پر مسلط کرنے کے لئے آج تک جو مساعی انجام دیں۔ وہ سب لاحاصل ثابت ہوئیں۔

اگر واقعتاً نفسیات کے ماہرین کو علمِ نفسیات نے مطمئن کر دیا ہوتا۔ تو وہ بیماری اور حادثات میں، زلزلوں اور برق و باد میں، آندھیوں اور طوفانوں میں لفظِ فنا و برباد سے لفظِ ہلاکت یا لفظِ انقطاعِ حیات سے لرزاں و ترساں نہ ہوتے۔ اُن کا لرزہ براندام ہونا نفس کی آوازِ باطن ہے۔ جو

مستقبل کی ترجمانی ہے۔

چونکہ جیسے شام کو گھر واپس لوٹ آنا ہوتا ہے۔ وہی رستہ میں چلتے ہوئے بچاؤ کا خیال کرتا ہے۔ اور آفات و مصائب آنے پر لرزتا ہے۔

اِس کی یہ لرزش جانِ عزیز کے بچاؤ کو اپنے محبوب تک پہنچانے کی علامت ہوتی ہے۔ ہر صاحبِ نفسیات، صاحبِ ماضی اور صاحبِ حال بھی ہوتا ہے۔ اور ہر حال مستقبل کے لئے مختص ہوتا ہے۔

اِن تینوں حالتوں میں صاحبِ نفس کا پسِ منظر بھی اُس کے ہمراہ ہوتا ہے۔

مگر اس کا فیصلہ کون کرے؟۔

وہ تو محض اپنے محدود موہوم علمی نظریات میں سُکڑ کر مستقبل کی لازوال نعمتوں کی نوید سے آنکھیں بند کر چکا ہے۔ وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بس اپنوں اور پرایوں کے لئے وہم اور شک کرتا رہے۔

علم النفسیات اگر علومِ حقہ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تو چشمۂ آب کے گرد و نواح کا کیچڑ بن کر رہ جائے۔ یا بچے ہوئے دسترخوان کا پس خوردہ۔ یا کھائے ہوئے پھل کی گٹھلی۔ یا خزاں زدہ باغ دبستان کی مثالِ موہوم یا آباد ہو کر اُجڑے ہوئے دیار۔ یا گئے گذرے آثار کا نشان۔ یا بستے ہوئے محلات کے اُجڑنے کے بعد کھنڈرات کا ڈھیر۔

اصلاً علمِ نفسیات ایک علامتی علمِ حکیمانہ تھا۔ جس کو نسخۂ حکمت کہا جا سکتا ہے۔ لوگوں نے اُسے حکیم گردان لیا۔

یہ ظاہر ہے۔ کہ حکیم نسخہ نہیں بن سکتا۔ اور نسخہ حکیم کا مقام نہیں پا سکتا۔ نسخہ تو حکیم کی ایجاد بن کر اہلِ نفس کی کلفتِ جسمانی کی دوا بنتا ہے۔ جس سے اہلِ نفس استفادہ کرتے ہیں۔

بہرطور علمِ حکمت کا درجہ نسخہ اور بیمار دونوں پر فضیلت رکھتا ہے۔

بعینہٖ پروردگارِ عالم حکیم کائنات ہے۔ اور اس کائنات میں بسنے والی مخلوقات کا مربی و محسن ہے۔

اِس نے اپنی حکمتِ کریمانہ سے انسان کو جسم و جان جیسی نعمت غیر مترقبہ عطا فرمائی۔ پھر اُس نے اُسے لاتعداد لوازم بخشے۔ تاکہ وہ اپنے لوازم کے ساتھ ایامِ زندگی گذار سکے۔

جسم و جانِ انسانی کو روح و مادہ کی ترکیب سے پیدا فرمایا۔

بس زندگی کے یہی دو بنیادی ارکان ہیں۔ جن سے انسان کی نبضِ زندگی متحرک ہوئی اور اُس نے آنکھ کھولی۔ اور سُننے لگا، اور چلنے پھرنے لگا۔ زندگی کے لئے اُسے احساساتِ ظاہریہ اور احساساتِ باطنیہ عطا فرمائے۔ عقل و دل و نگاہ تفویض فرمائے۔ تب وہ صاحبِ علم ہُوا۔ اور کارگہہ زیست کا مکرم ترین شاہکار بن کر ساری مخلوقات پر فضیلت دیا گیا۔

علمِ نفسیات احساساتِ عقلیہ کے فروعات سے ہے۔ نہ کہ بنائے احساسات۔

اِس طرح جس طرح ناخنِ تدبیر ہاتھ نہیں ہوتے۔ بلکہ ہاتھ کی ایک فرعی حیثیت پر مبنی ہو کر ہاتھ کے کام آ سکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح قدرت نے انسانی عقل و روح کے دانشمندانہ ہاتھوں پر علمِ نفسیات کو ناخنِ تدبیر بنا دیا۔ تاکہ جسم کے حالاتِ حاضرہ کا اس علم کے ذریعہ جائزہ لیا جا سکے۔

اور یہ کہ علمِ نفسیات انسانی دانش میں ناخنِ تدبیر بن سکے۔ اِس نوعیت میں علمِ نفسیات اصل دانش نہیں۔ بلکہ فروعِ دانش سے ہے۔

مگر جب انسان اپنے جسم تک ہی اپنے آپ کو محدود کر لیتا ہے۔ تو روح بس اُس کو زندہ رکھتی ہے۔ اور اس کی معیشت میں اُسے فہم رسا دیتی رہتی ہے۔ جس سے وہ خورد و نوش کے سامان پیدا کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔

پھر اُس کے آگے فوق الادراک معلومات میں جو حال اور مستقبل کے لئے ہوتے ہیں۔ اُن سب کے حل کے لئے علمِ نفسیات کو ہمیشہ عقل، دلِ و نگاہِ عارفانہ کی احتیاج ہوتی ہے۔ وہ کبھی فوق الادراک حالات کا جائزہ لینے پر قادر نہیں ہو سکتا۔

چونکہ وہ نفسیاتی حالات میں مفید ہے۔ اگر انسان نفسیاتی علوم پر ہی اکتفا کر کے اپنی معیشت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا چاہے۔ تو معیشت بہتر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

چونکہ انسان بوجہ دانشِ انسانی کے مکرم ہے۔ اس کا چاہے کوئی زاویۂ نگاہ ہو۔ بہرکیف عقلِ انسانی اُس کے زاویۂ نگاہ پر اُس کی مدد کرتی ہے۔

عقل کی عادت ہے۔ کہ وہ افکارِ انسانی کی لازماً راہنمائی کرتی ہے۔ اِس طرزِ عمل پر انسانی گروہ جس طرح چاہے۔ اور جس منزل پر چلنا پسند کرے۔ عقل اسی سبیل پر اُس کی گتھیاں سلجھانے میں اُس کی ممد ہو جاتی ہے۔

جس سے انسانوں کے مختلف طبقے مختلف نظریات کے ساتھ مختلف ترقیات کرتے ھیں۔ یہاں تک کہ چور، ڈاکو اور رہزن بھی اپنی عقلِ انسانی سے کام لے کر اپنے اپنے جرائم میں بڑی کامل مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور انسانی دنیا میں اپنے کمالاتِ مجرمانہ سے بدامنی کا باعث بن جاتے ہیں۔

عقلِ انسانی ہر قسم کی معیشت میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ حسین و قبیح دونوں قسم کی معیشتوں میں مددگار ہو کر انسانوں کے زاویۂ نگاہ کی تائید کرتی ہے۔

یہ اصطلاح کہ فلاں گروہ بد اخلاق ہے۔ جس کا ترجمہ بُری گذران والا ہے۔ اور فلاں زمرۃ الانسان جمیل و حسین و شریف معیشت کا حامل ہے۔ جس سے کسی معاشرے کی اچھائی ظاہر ہوتی ہے۔

یہ دونوں اصطلاحات معیشت میں خواہشِ نفس پر یا تہذیب اخلاق پر مرتب ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

اِس انسانی کردارِ بد اور کردارِ نیک کی تاریخ سے ثابت ہُوا۔ کہ عقلِ انسانی مجوزہ نہج پر تائید و حمایت کرتی ہے۔

لہٰذا محض انسانی معیشت کا معراجِ کمال تک پہنچ جانا بر بنائے نفسِ امارہ بھی ممکن ہے اور معیشت کا بر بنائے تہذیبِ روحانیہ بھی معراجِ کمال تک پہنچ جانا ممکن العمل ہے۔ دونوں معیشتوں میں سے ایک معیشت کا الگ انتخاب کر کے اُسے بندگی میں داخل کرنے کے لئے بنیادی

دلائل کی ضرورت ہے۔

اور ایک معثیت کی معراج کو عیش وطرب پر منتج کرنا پڑے گا۔ اور دوسری معثیت کو معثیت خیر وصلاح پر یہ ضروری نہیں۔ کہ صرف ایک ہی قسم کی معثیت یک طرفہ معراج پا سکتی ہے۔

یہاں یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ کہ عقل ودانش، نیک وبد دونوں معثیتوں میں دستگیری کرتی ہے۔

فرق صرف اتنا ہے۔ کہ ایک معثیت انسانوں کو بد اخلاقی پر مجبور کرتی ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ بنیادی نظریات کی غلطی ہوتی ہے۔ اور ایک معثیت نیک اخلاق پر انجام مترتب کرتی ہے۔ اور امینِ عافیت ہوتی ہے۔ اور اُس کی بڑی وجہ نیک نظریات ہوتے ہیں۔

باب ہفتم

معیشتِ انسانیہ

دنیا میں بداخلاق قوموں کے نظریات بنیادی طور پر خواہشِ نفس پر تعمیر ہو کر تہذیب و تمدّن کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

صورتاً بظاہر وہ بھی گذرانِ انسانیّت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مگر اُن کی تبلیغ عیشِ محض کے لئے ہوتی ہے۔

بعض کمزور طبائع نیک معاشرہ کے پروردہ ہونے کی حالت میں بھی مغلوب ہو کر ایسی بداخلاق تہذیب کا شکار ہو کر دین و ایمان کھو بیٹھتے ہیں۔

بندگی کا آئین و منشور معیشت کے لئے نہیں۔ بلکہ معیشت بندگی کے زادِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بندگانِ خدا کی معیشت صرف اُن تک ہی محدود نہیں ہوتی۔

بلکہ وہ ریاست کو خود کفیل کرنے کے بعد ریاست سے باہر دوسروں تک پھیل کر بھلائی کرتی ہے۔ جس کی نوعیت خیراتی ہوتی ہے۔ اور اس پھیلاؤ یا خیرات کا کوئی سود یا معاوضہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اِس پر دباؤ کی صورت اختیار کی جاتی ہے۔

جیسا کہ آج کل اقوامِ عالم کی مصنوعی اور بظاہر کامیاب معیشت اپنے پھیلاؤ پر سود لیتی ہے۔ اور کئی طریقوں سے منافع در منافع حاصل کرتی ہے۔

یہ معاملاتِ انسانی کی ایک سخت بدنما صورت ہے۔ منافع تجارت میں جائز ہے۔ لین دین کی اُس صورت میں جس میں تجارت مطلوب ہو۔ اور ذرائع کو جائز طور پر وسیع کرنا مطلوب ہو۔

بیع و شرح کے منافع کی ایک ایسی جائز اور غیر مضر حد مقرر و قائم کر دی جاتی ہے۔ جس سے بائع و مشتری دونوں مطمئن ہو سکیں۔ نہ ایک کو خسارہ ہو۔ اور نہ دوسرے کو نقصانِ مال و جنس ہو۔

اسلام میں ایسا معاملہ بندگی قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی بندگی ہر جزوِ زندگی میں پھیل کر صلہ رحمی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسلام کی بندگی کا آغاز اِس نیت پر ہوتا ہے۔

کہ ہر چیز خدائے علیم و بصیر کی دین ہے۔ غلط مصرف پر وہ ناراض ہوگا۔ چاہے یہ مصرف لسانی ہو۔ یا بدنی، یا انفاقِ مال و جان و اولاد سے ہو۔ بہر صورت مصرف اللہ کے لئے ہے۔ جس کے سامنے سب نے جواب دِہ ہونا ہے۔

جس معاشرے کی بنیاد یہ ہو۔ وہ ضمیرًا خوش اخلاق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے لئے اور کسی دوسرے کے لئے بداخلاقی اس واسطے نہیں کرتا۔ کہ اُسے اپنے اور دوسروں کے متعلق خدائے تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب دینا ہے۔

ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی عبادات کی تکمیل کے ساتھ انسانی معاشرہ میں وہ تمام کام سرانجام دیئے۔ جن کا معیشتِ انسانیہ سے تعلق ہو سکتا ہے۔
مگر ان اُمور کی ادائیگی اِس حسن و خوبی سے سرانجام دی۔ کہ اگر کسی نے ایک ذرہ برابر بھی بُرائی کی تو اُس کو اُسی قدر وعید سُنائی گئی۔ اور اگر کسی نے ذرہ برابر بھی بھلائی کی۔ تو اُس کو جزائے خیر کی بشارت سُنائی گئی۔

اِس دستور العمل کو آپ کے پیروکاروں نے عملاً ثابت کر دیا۔ کہ بندگی کی پرواز دو پروں پر ہوتی ہے۔ ایک خالصتاً پروردگارِ عالمین کی سچی عبادات کے ساتھ۔ اور ایک انسانی حقوق کے ساتھ۔

مومن اِن دونوں پروں پر بلندئ ایمان پر اُڑتا ہے۔ جس تک غیر بندے نہیں پہنچ سکتے۔
ایک پَر کے ٹوٹ جانے سے مومن بلندئ ایمان سے نیچے گر جاتا ہے۔ مومن پر حق لازم آتا ہے۔ کہ وہ بندگی کے یہ دونوں فرائض باحسن وجوہ تمام انجام دے۔ تاکہ اس کی معیشت فارق الکفر والاسلام ہو۔ جس سے بوضاحتِ تمام بااخلاق اور بداخلاق معیشت انسانیت

گے سامنے آجائیے۔

بندگی روحانی اور جسمانی معیشت کو مستحکم کرتی ہے۔ جو بندگی پروردگار کے لئے کی جائیے۔ ایک تو وہ طمانیت بن کر دل کو مطمئن کرتی ہے۔ کہ تو ضمیرًا اُس خدا کا بندہ ہے۔ جو نہ صرف تیرا ہی مربی و محسن ہے۔ بلکہ ساری خلائق کا مربی ہے۔

دوسرے وہ اپنے حقیقی فیصلہ کی قطعیت پر ایمان رکھتا ہے۔ اِس واسطے کہ وہ جِس خدا پر ایمان لایا ہے۔ وہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔

وہ بندگی کا آغاز۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

سے کرتا ہے۔

کہ مَیں عبادت کے لئے اپنا منہ اُس معبودِ مطلق کی طرف کر رہا ہوں۔ جو زمینوں اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور یہ کہ مَیں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بھی نہیں گردانتا۔

اِس عقیدہ سے وہ قطعی ایمان کے ساتھ قطعی فیصلہ کر لیتا ہے۔ اور یہ قطعی فیصلہ اسے خشیت کا پیکر بنا کر عبودیت کا درجہ دیتا ہے۔

ایسی خشیت جِس کی نُمود خالقِ مطلق کی ذات پر ایمان لانے کے بعد وقوع ہو کر عبادت میں شریک ہو۔

ایسا عابد اپنی عبادت سے کیوں نہ مطمئن ہو۔ ایسا عابد معاشرہ کیونکر تغافل شعار ہو سکتا ہے۔ جِس کی قلبِ ماہیت خوف و رجا ہو اور خوف و رجا میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں شامِل ہوں۔

وہ تو اپنے صالح نظریہ کی بنا پر نیکیوں کا چشمۂ جاریہ بن جاتا ہے۔ جِس کے ایمانی اور عملی تسلسل سے گردوپیش میں ایمان انگیز روئیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

پانی مختلف نوعیت کی زمینوں پر سے گذرتا ہے۔ مختلف جڑی بوٹیوں کو جو مختلف انواع کی حامِل ہوتی ہیں۔ سب پر یکساں اثر کرتا ہے۔ ہر زمین اپنے مزاج کے مطابق اُس سے استفادہ کرتی ہے۔ ہر بیج کا استفادہ پانی کی تاثیر پر منحصر ہے۔ ہر بیج

جس رنگ وروپ اور ذائقہ کا متحمل ہوتا ہے۔ اُن ہی صلاحیتوں کے ساتھ نمود پاکر شاخ بن جاتا ہے۔

گھاس بھوس سے لے کر کھلکھلاتے اور مسکراتے ہوئے چمن مختلف رنگوں، پھلوں پھولوں سے لدے ہوئے باغ وبستان، پانی کے عمل جاریہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

چونکہ پانی کا استفادہ دلیلِ قدرت ہے۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔

یعنی ہر چیز کا مدارِ حیات پانی ہے۔

اگر کائنات کی ہر چیز اپنا عمل جاری نہ رکھ سکے۔ وہ زندہ ہی نہ رہ سکے۔ تو معیشتِ انسانی کا سوال ہی لاحاصل ہو جائے۔

اہلِ ایمان اپنے مقام میں قانونِ فطرت کے جاری کردہ اور فیض یاب کرنے والے چشمۂ جاریہ کے مانند ہیں۔ ہر مومن قطعی یقین وایمان پر اعمال کو جاری رکھتا ہے۔ جس پر اُس کے گرد وپیش کی انسانی صلاحیتیں پرورش پاکر نمود پاتی ہیں۔

ہر مومن حقیقتِ حقہ کی ایک کھلی دعوت اور کتابِ ہدایت ہوتا ہے۔ اُس کی ہر ہر حرکت۔ اُس کا ہر جزوِ زندگی دعوتِ حق ہوتا ہے۔

وہ ایسی کتابِ زندگی ہے۔ جس کو جہاں سے اور جس صفحہ سے پڑھو گے۔ بس صداقت، نجابت عافیت اور حقیقت ہی ملے گی۔

جب مسلمان معاشرہ اپنی اِس فطری نوعیت پر منظم ہو کر سامنے آجائے۔ تو ایسی حالت میں جو معاشرہ جس تہذیب وتمدن کے ساتھ ظہور پذیر ہوگا۔ اُسی پر بندگانہ معیشتِ صادقہ اور معیشتِ صالحہ کا اطلاق ہو سکے گا۔ ورنہ معاشرہ اور اُس کی معیشت غیر قطعی بنیادوں پر کبھی صداقت شعار نہیں ہو سکتے۔

اصل مقصد ان دلائل سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے۔ کہ اہلِ دنیا اکثر اپنی معیشت کو اچھا ثابت کرنے کے لئے اسے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

جس کسی معاشرہ کی ظاہری معیشت اچھی ہوگئی - اور اِس معاشرت کو اپنے گردو پیش کی اقوامِ عالم پر شہرت مِل گئی - تو ایسی حالت میں وہ دوسروں کی معیشت پر بیشتر قسم کے دباؤ ڈالنے کے قابل ہو جاتے ہیں - اور ناجائز طور پر لوگوں کو اپنے غلط نظریات منوانے کی سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں -

اِس ظاہری دورانِ غلبہ میں اکثر مجبور و بے بس لوگ یا تو دفع وقتی کے لئے اُنکے نظریات کو قبول کر کے اُن کے معاون بن جاتے ہیں - یا کمزوریٔ ایمان کی بدولت آسائشِ نفسانی کے حصول کے لئے اپنے مذہبِ حقّہ سے متردک ہو کر معاشرتی دلچسپیوں کو ہی اپنا مذہب بنا لیتے ہیں -

ایسے لوگوں کے ترکِ مذہب کے لئے ہمیشہ ظاہری معیشت ہی ذریعہ فرار بنتی رہی - اول الذکر متروک جس نے اپنے مذہب پر ایمان رکھتے ہوئے دفع وقتی کے لئے ترکِ مذہب کیا تھا - اِس قسم کے لوگ بھی قدرتی طور پر دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں -

اگر صرف دفع وقتی کے طور پر ترکِ مذہب ظاہراً امراد تھا - تو اضطرار دُور ہونے پر وہ فوراً رجعت الی اولیٰ کر لیں گے -

اگر دفع وقتی کے ساتھ وہ مغلوب المعیشت ہو گیا، تو بھی اُس کا نظریہ خطرہ میں پڑ جائے گا - یا تو وہ فرداً اسیرِ غیر ہو کر حاصل شدہ آسائش سے بیگانگی اختیار کرنے میں وقت پائے گا - یہ تاخیر اُسے کسی وقت بھی خارج از ایمان ہونے کے لئے مہلک ہو سکتی ہے -

اگر بالفرضِ محال وہ خود اضطراراً ایسے غلط معاشرہ میں دفع وقتی کے اضطرار سے فراغت پانے کے بعد بھی اِس معاشرہ سے جدا نہیں ہوتا - اور محض اس خیال پر کہ میں اپنے نظریہ ایمان پر ثابت قدم رہنے والا ہوں - میں اچھی بھلی معاشرت میں دن گذار رہا ہوں - بلا وجہ اِس سے الگ ہو کر معیشی بدحالی مول لینے سے بھلا ہے - کہ مَیں اِس غیر معاشرہ میں رہ کر زندگی گذار لوں -

اس حالت میں انجام کار اس کی نجی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی - اور اس کی اولادوں کو پیدائشی طور پر معاشرۂ غیر کا لازماً حصّہ ہونا پڑے گا - انجام کار وہ اور اس

کا خاندان غیر نظریات کا شکار ہو کر یا تو اپنے سچے مذہب کو خیر باد کہہ دے گا۔ یا صرف نام کا مذہبی کہلائے گا۔

مگر مذہبی روح سے قطعی بے گانہ ہو کر اپنوں سے بیگانگی۔ اور غیروں سے دلچسپی اس کا مشغلہ بن جائے گا۔ ایسا طبقہ کہیں خوش بختی ہی سے بچ سکے۔ ورنہ اس کا بچنا دشوار تر مراحل میں داخل ہو جاتا ہے۔

اہل اللہ نے فرمایا۔

کہ کسی بداخلاق نظریہ زیست کے پابند فرد یا خاندان یا معاشرہ یا قوم کی قرابت وہ راسخ الایمان کر سکتا ہے۔ جس کا ایمان اس قدر مضبوط ہو۔ کہ وہ کائنات کی ہر چیز پر اپنے نظریہ ایمان کو محبوب ترجان کر ترجیح دینے والا ہو۔ اور اُس کا مطمحِ نظر صرف اخلاقِ ایمانی کے ساتھ دوسروں کو بھی ہمنوا بنانا مقصود ہو۔

ایسی صورتِ حال میں کوئی فرد یا خاندان یا قوم کسی غیر معاشرے یا اُس کے فرد و خاندان سے دو چار ہو بھی جائے۔ تاہم وہ اپنے دامن عفتِ ایمانی کو بچا لینے میں کامیابی پاتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے اثراتِ نیک غیر معاشرہ میں منتقل کرنے میں کامیابی بھی پالیتا ہے۔

آج تک اقوامِ عالم اِسی دستور العمل کے تحت بگڑتی اور سنورتی رہی ہیں۔ ایک قوم نے متمدن ہو کر اپنی تہذیب کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش اپنی معیشت کے عروج کی مدت تک جاری رکھی۔

مگر جونہی ایسی معاشرت موت کی آغوش میں سو گئی۔ تو دوسری قسم کی اُبھرتی ہوئی معیشت نے لوگوں کو آگھیرا۔

اِس تسلسل نے حق و باطل کی رزم گاہیں بنائیں۔ کبھی حق غالب آیا۔ اور کبھی باطل۔ باطل کے اُبھرنے کا بس ایک ہی ذریعہ تھا۔ اور وہ عیش و طرب کو فروغ دینے کے لیئے آسائش ڈھونڈھتا ہے۔

ہر انسانی دِل کے ساتھ نفسانی خواہشات ملوث ہوتی ہیں۔ اِس واسطے اکثر و بیشتر

لوگ عیش و طرب کا دیکھتے دیکھتے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل پاتے۔

انسانی معاشروں پر سنجیدگی سے غور کرنے پر صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ یہ معاشرہ صحیح یا غلط بنیادوں پر قائم ہے۔

جیسا کہ ہندو قوم میں خیرات بھی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ صلہ رَحمی کے سلسلے بھی جاری ہیں۔ اُن کے اخلاق میں ہر کس و ناکس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بات کرنے کی دلپذیر رسم بھی پائی جاتی ہے۔ اور مخاطب کرنے کے وہ وہ دلنواز انداز موجود ہیں۔ جو ہر خاص و عام کو دعوت ستائش دیتے ہیں۔ وہ ساز و سُرور سے بھی اپنی مجالس کو پُر کیف بنانے کے عادی ہیں۔

اِس کے ساتھ وہ اپنے عبادت خانوں میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ مجوزہ عبادات کے لئے جمع بھی ہو جاتے ہیں۔

وہ اپنی مذہبی کتاب کو پڑھنے کے علاوہ ظاہراً غایت درجہ ادب بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے معابد کو نہایت نفاست کے ساتھ سجاتے اور اسلاف کی بڑی بڑی دلنواز تصاویر آویزاں کرتے ہیں۔

اور بزرگانِ قوم کی مردانہ تصاویر اور بزرگ عورتوں کی تصاویر اُن احوال کی ترجمان ہوتی ہیں وہ اپنی عقیدت کو زندہ رکھتے ہیں۔

یہ سب صورتیں بظاہر بھولی بھالی دِل اندوز ادائیں۔ ساز و سُرور اختلاطِ مرد و زن۔ اُن کی شادی و غمی کی رسومات۔ اُن کے تہوار۔ اُن کے بھجن۔ اُن کے نغمات۔ اُن کا ادب۔ اُن کا علِم و ہنر۔ سب کے سب میدانِ عمل میں اُن کے ساتھ ساتھ اُن کی منزلِ زیست پر عیاں نظر آتے ھیں۔ جِس سے طبائع مسحور ہوتی ھیں۔

مگر اِن مذکورہ مظاہراتِ اخلاقیہ کے حاملین اِن تمام ظاہری حالات کی موجودگی میں ایک غریب کی دولت ایک مختصر سے عرصہ میں ہنسی اور مذاق میں اُڑا

لیتے ہیں۔

ایک بے بس بے کس غریب، جس دِن آسائش ذاتی سے قطعی تہی دامن ہو جاتا ہے۔ اور جملہ وسائل اُس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ قرض اُس کی ذات پر بالکل ایک نیم جان کے سَر پر وزنی پتھر کے مانند ہوتا ہے۔

اُس کی ننھی منی اور محبوب ترین اولاد، اُس کی رفیقۂ حیات اُس کی آنکھوں کے سامنے روٹی کے ایک ٹکڑے اور دو ٹکوں اور معمولی کپڑوں اور چھوٹی سے چھوٹی ضروریاتِ زندگی سے محروم بلک بلک کر اپنے مالکِ خانہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ جو اُن کی اُمیدوں کا اِس دنیا میں آخری سہارا ہے۔

مگر جب اُس کو بے بس بے حال، پَر نوچے ہُوئے پرندہ کی طرح بے سہارا پاتے ہیں۔ تو اُن کی رہی سہی اُمیدیں بھی بُری طرح پامال ہو جاتی ہیں۔ اُن کے آنسو ترازوئے فطرت میں تولے جائیں گے۔

مگر یہ بعد کی بات ہے۔

حال یہ ہے۔

کہ نااُمیدی اُن کے آخری آنسو بھی خشک کرکے لوٹ لیتی ہے۔ تاکہ دیکھنے والا اُن کو مُردہ تصوّر کرے۔ اُن کی اُمیدوں کے سہارے نیم جان مالکِ خاندان نے تعمیر کے لئے بڑی اُمیدوں پر خشتِ اول رکھی تھی۔ اور اِس خاندانی تعمیر کے لئے مشفقانہ محبّت و مشقت کی تھی۔

جب آسائش کا سانس لینے کے قابل ہُوا۔ اور خاندان کی اُمیدیں بندھ گئیں۔ معاً اُس کے پُرامن ماحول میں بسنے والے خاندان کے دروازہ پر ایک ہنستا، مُسکراتا اور کِھلکھلاتا ادباً کمر خمیدہ چہرہ سادے سے لباس میں ملبوس ہاتھ جوڑے کھڑا نظر آتا ہے۔ اور بڑے حلم و ادب سے آداب بجالاتا ہُوا سلام کہتا ہے۔ اور مالکِ خانہ کو سرکار کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔

اُس کی اِس دِل آویز سادگی اور فروتنی سے ایک سادہ لوح، نیک دِل، صاحبِ مروت

مالکِ خانہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہ اُس نووارد ساہوکار کا پُرتپاک خیرِ مقدم کرتا ہے۔ اُسے اپنے قریب بٹھاتا۔ اور عزت و تکریم کرتا ہے۔

مگر اُسے کیا معلوم کہ یہ تبسم یہ بھولا پن یہ دستورِ اخلاق میری نیائے امن کا لٹیرا ہے۔ یہ طریقے سب کے سب دوسروں کو ذبح کرنے کے اوزار ہیں۔ کسی نووارد مہمان کا یہی تبسم، محنت کش مردِ غیور کو اپنے دامنِ تزویر میں پھانس لینے کے بعد ایک دن اپنے شفیق میزبان کو اِس طرح بے دست و پا کر دیتا ہے۔

کہ وہ اپنی بے بس بیوی، بے بس بچوں، ننھے شیر خواروں سمیت اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے حاضر ہوکر اپنی پُردرد الم ناک شکست اِس طرح بصورت فریاد پیش کرتا ہے۔

کہ اب تو میرے پاس سوائے مکان اور زمین کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ آپ ہم پر رحم کریں اور مزید کچھ مدد کریں۔

اِس حیران کُن مرحلہ پر بھی وہ ہاتھ جوڑ کر ابتدا کرنے والا مہاجن اُن کی پھر مدد کرتا ہے۔ جب مکان اور زمین بھی گرو لے لیتا ہے۔

تو یہ اُس خاندانی دہقان یا خاندانی زمیندار یا خاندانی پیشہ ور یا خاندانی معزز گھرانوں کی آسائش کا آخری دم ہوتا ہے۔

جس کے بعد وہی لوگ مہاجن کے چاکر ہوکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس قوم کے نظریاتِ مذہبی کا پھیلاؤ یہ ہو۔ اور وہ کارسازِ عالم میں پورا عملی پروگرام بھی رکھتی ہو۔ وہ معبد خانوں میں بھی نظر آتی ہو۔ وہ گوسالہ کو پتھر کی مورتیوں، پیتل، لوہے اور چاندی کے بُت بنا کر اُن کے سامنے سجدہ ریز بھی ہو۔

اگر مال و زر کمانے اور خوبصورت شہر و محلات بنانے۔ اور صرف زیب و زینت کا نام بہتر معیشت ہو۔ جس معیشت میں کوئی خوف بھی موجود نہ ہو۔ اور حسین و جمیل شہروں پُرشکوہ محلات میں بسنے والے ہوں۔ اور پھر کسی دُکھیے کی مدد تک نہ کرسکیں۔ تو اُس کا صحیح ترجمہ یہی ہو سکتا ہے۔

شہر و محلات آسائش اور خوبصورت رنگارنگ زیب و زینت اُس سانپ کے مانند ہیں۔ جو بظاہر بڑا خوبصورت ہو۔ اور خوبصورت باغ دبستان میں رہتا ہو۔ اور نشۂ زہر میں مخمور ایسا معلوم ہوتا ہو۔

کہ وہ بالکل بھولا بھالا اور بے ضرر ہے۔ اور نادان اُسے خوبصورت جان کر اُس سے کھیلیں اور ہلاک ہو جائیں۔

تہذیب و تمدن کی بنا نیکی پر استوار ہو کر ہی اُسے صحیح تہذیب و تمدن بنا سکتی ہے۔ ورنہ خدا جانے اِن بھرے شہروں میں یہ خوش گذرانیں کتنے ہی معصوم دلوں کا مذبح بن جانے کا باعث بن جاتی ہیں۔

اسلام نے اللہ کے خوف پر ہر چیز کی بنیاد رکھی ہے۔ اور خوف کے ساتھ رجا دیا ہے۔ تاکہ اپنے کئے کی جزا کی اُمیدوں پر مزید نیکیاں سرانجام دی جا سکیں۔

اسلام ایمان و بندگی کو اولیت دے کر پھر معاملات کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ پہلے تزکیۂ نفس کے ساتھ عجبِ ذاتی کی بیخ و بن اُکھاڑتا ہے۔ ایمانِ باللہ، عبادات اور معاملات تینوں صحت مندانہ راہ پر چل کر معیشتِ حقّہ کی صورت میں نمودار ہو کر باہمی آسائش بن جاتے ہیں۔

اِسلام کی معاشی تشکیل اِن اوصاف پر مرتب ہو کر امن کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ جب اسلامی معاشرہ اپنے اِن متذکرہ صفات پر کاربند ہو جائے۔ تو نتیجہ کے طور پر اُس سے اخلاقی قدریں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

جس طرح گلستان سے خوشبو پیدا ہو کر گلشن اور صحنِ گلشن سے باہر نکلتی ہوئی قرب و جوار سے گذر کر دور دراز تک اپنے اثرات پھیلا دیتی ہے۔ اور اُس کے تاثرات خوش کن ہوتے ہیں۔

اِسی طرح دیگر مذاہب جن کی بنیاد نیکی پر رکھی گئی تھی۔ مگر مابعد آنے والی نسلوں نے بنیادی نظریات کو فراموش کر دیا۔ اور محض بندۂ نفس ہو کر نفسانی خواہشات میں بٹ گئے۔ اُنہوں نے بھی اپنی راہ وہی بنالی۔ جو محض حصولِ منفعتِ ذاتی تک پہنچانے کا

ذریعہ بن سکے۔

یہ سب قسم کے لوگ معیشی حالت کی بنیاد اقتصادیات پر رکھتے ہیں۔ اور اقتصادیات چند افراد تک محدود ہو کر بڑی تنگ رفتاری سے معاشرے تک اپنے اثر و نفوذ کو جاری رکھتی ہیں۔

جس سے لوگ تنگ ہو جاتے ہیں۔ کمزور زیادہ کمزور اور طاقتور زیادہ طاقتور ہو جاتے ہیں شہر بارونق ضرور ہو جاتے ہیں۔

مگر عام لوگوں کے قلوب سخت نالاں ہوتے ہیں۔ ہر غریب اپنے زورِ بازو پر اپنی طاقت سے زیادہ کام کرتا ہے۔ مگر اُسے معاوضہ بہت کم ملتا ہے۔

اِس طرح آسائش غیر متوازن ہو کر چند گھروں کی لونڈی بن جاتی ہے۔ اسلام ایسی معیشت کو جو بظاہر حسین ہو۔

مگر بباطن ناانصاف اور اذیت ناک ہو۔ سخت ممانعت کرتا ہے۔ اُس کی تعلیم یہ ہے۔ کہ خود جھونپڑوں میں رہو۔ مگر عام لوگ خوش گذران سے آسودگی پائیں۔

اسلام نے جو نظامِ اقتصادیات کا درس دیا ہے۔ وہ نہایت سادہ عام فہم اور آسودگی کی مساوی تقسیم کرتا ہے۔

اسلام میں ظاہر و باطن کے تمام معاملات اور معاشرے کی فردی اور اجتماعی خوشحالی محض خدا کی رضامندی کے لئے بروئے کار لائی جاتی ہے۔ اُس کے نزدیک بندگی کا پھیلاؤ نیت سے زبان، زبان سے بدن اور بدن سے انفاقِ مال کے ساتھ ہے۔

وہ بندگی کے لئے زبانی صدق و صفا کے ساتھ حمدِ باری تعالےٰ بیان کرنے اور لوگوں سے میٹھی بات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور بدن سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ ایسی محنت و مشقت کی تعلیم دیتا ہے۔ جس سے لوگوں کی ضروریات میں مدد مِل سکے۔

وہ انفاقِ مال کی مرضیات خداوندِ ذوالجلال کے ساتھ اس طرح تقسیم کرتا ہے کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہو سکیں۔

اسلام نے مسلمانوں کی زبان اور ہاتھ کو اذیت سے منع کیا ہے۔

اسلام کے نزدیک تحیاۃ لسانی کا اتمام بغیر نیکی کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور تحیاۃ بدنی بھی بغیر مجوزہ نیکیوں کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتے۔

اور انفاقِ مال بھی لوگوں کی خدمت کے بغیر انفاقِ صادقہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام مومن کے دِل کو نیّت سے باندھ کر عالمِ روزگار میں نیک کاموں کے ساتھ معیشت درست کرنے کا حکم دیتا ہے۔

بصورتِ دیگر ایسی معیشت کو معیشتِ محض کہہ کر راہِ حق سے الگ کر دیتا ہے۔ جہاں انسان کے خون و پسینہ کی قیمت کچھ نہ ہو۔ اور انسان کو معصوم برّوں کی طرح ذبح کیا جاتا ہو۔ جہاں انسان سے بیلوں اور حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہو۔ جہاں انسانی احساسات کو بُری طرح کچل دیا جاتا ہو۔ ایسی معیشت سے اسلام میں الاماں کی تفہیم دی گئی ہے۔

باب ہشتم

رازِ زندگی

بندگی ایک ہمہ گیر رازِ زندگی ہے۔ محض ظاہری بندگی تو سخت ریا ہے۔ اور ریا ظلمِ عظیم ہے۔ ریا صداقتِ باطنیہ کی قاتل ہے۔ ریا آئین کُش ہے۔ ریا خلاف فطرت ہے۔ ریا ہی نیت کو خراب کرتی اور ظلم پر آمادہ کرتی ہے۔ ریا دل سے اُٹھ کر زبان، بدن اور مال و دولت کو نمود و نمائش بنا دیتی ہے۔

اِس طرح انسان زادہ محض نمود و نمائش کا پُتلا بن جاتا ہے۔ ایسے پیکرِ ظلم کو اسلام کی زبان میں بہیمیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بندگی کا پھیلاؤ ارض و سما پر محیط ہے۔ حضور سرورِ کائنات کی بندگی نے سینۂ گیتی میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ اور عرشِ عظیم نے آپ کے قدوم میمنت لزوم کو چوما۔ اور خدائے لم یزل نے آپ کو اپنا مہمان بنایا۔ اور اپنے پاس بلایا۔

یہ بندگی کا کمال تھا۔ بندگی جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین میں پھیلی۔ تو وہ سب مظہرِ خُلقِ عظیم کی تصویر بن گئے۔ خداوند تعالےٰ مربی و محسن ہے۔ اس کی اس صفتِ پاک کا مظہر حضور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام ہوئے۔ اور متخلق باخلاقِ باللہ ہو کر آپ نے انسانیت کی راہنمائی انسانی خدمات کے ساتھ کی۔

اور صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ کے خُلقِ عظیم سے سبق لیکر انسانیت تک اِس طرزِ اسلام کی آواز پہنچائی۔

اور اسلامی طرزِ خدمت اور طرزِ عمل کے ساتھ معیشت کی بنیاد رکھی۔ عجم کے بلالِ حبشی

رضی اللہ تعالےٰ عنہ اور ایک عربی النسل میں کوئی فرق نہ چھوڑا ۔ محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ۔

یہ وہ طرزِ عمل ہے ۔ جس کی تکمیل یا خدمت بندگی کے بغیر نہیں ہو سکتی ۔ اللہ سے ڈر کر بندگی کرنا زبان ، بدن اور انفاق کے مصرف کے صحیح ہونے پر نظر رکھنا ۔ اور آگے بڑھ کر دامنِ رحمت تھام لینا ۔ یہ طرزِ حیات اپنے لئے ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے طمانیت ہے ۔

بندگی وہ ہے جو محض اللہ تعالےٰ کے لئے ہو ۔ بندگی کرنے والا ہر چیز کو معہ اپنی ذات کے ماسوا اللہ قرار دینے کے بعد ہی بندگی کا راز پا سکتا ہے ۔

اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ استکبارِ نفسی ہے ۔ بندگی کا مقصد ہر قسم کی بڑائی سے اجتناب کے ساتھ حصولِ عجز و نیاز ہے ۔ اگر بندگی بھی حصولِ عجز و نیاز حاصل نہ کر سکے ۔ تو یہ علامت ہے ۔ کہ استکبارِ نفسی مخل بندگی ہو رہا ہے ۔

ایسی حالت میں بندہ کو چاہئے ۔ کہ وہ اپنے نفس میں جھانک کر دیکھے ۔ کہ اس میں کسی قسم کا تکبر آ گیا ہے ۔ اس کو سمجھے اور سبب معلوم کرے ۔ علاج کے لئے اہل اللہ کی طرف رجوع کرے ۔

بہر حال استکبار کو اپنے جسم سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کرنا بندگی ہے ۔ تاکہ سبیلِ بندگی سے ہٹ کر اللہ تعالےٰ سے دور نہ ہو جائے ۔ اللہ تعالےٰ اور رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دور ہونا ہی گمراہی ہے ۔

بندگی نے جب حکمِ الٰہی سے بصورتِ آخر الزمان سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام آغاز کیا ۔ تو اُس وقت بندگی کی ادائیگی پر فرشتوں کو رشک ہُوا ۔

اِس واسطے کہ انہوں نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش پر نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ کہہ کر تعارض پیدا کر دیا تھا ۔

مگر سرورِ کائنات نے اپنی بندگی کے ساتھ آخری عجز و نیاز کا اظہار فرمایا ۔ اپنی خدا داد بڑائیوں کو جو آپ کو افضل الخلائق کا مقام دیتی ہیں ۔ خداوند تعالےٰ کے حضور سب

کو بھول کر صرف اور محض عبدہٗ ہو کر اُس کی عبادت کے ختمی فرائض کی انجام دہی کی۔

در حقیقت آپ کی آخری اور ختمی بندگی ہی اِنِّیۤ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ کی عملی تفسیر تھی۔

اگر مخلوقاتِ خدا میں کوئی مخلوق اپنی برتری پر اظہارِ فخر کر سکتی تھی۔ تو یقیناً فخرِ موجودات سرورِ کونین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے اولیٰ تر اور جائز تھا۔ کہ وہ اپنی برتری پر بجا طور پر افتخار کرتے۔

مگر آپ نے فرمایا۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔

مجھے اللہ کے حضور اظہارِ فقر میں فخر ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی بندگی میں۔

آپ کی ذات باعثِ تخلیقِ کائنات تھی۔ آپ صفات میں بعد از خدا کا مرتبہ رکھتے تھے۔ مگر باوجود ان صفاتِ کریمانہ اور صفاتِ ختمیہ کے بھی آپ نے کبھی استکبارؔ الفظِ افتخار تک بھی نہ فرمایا۔

اگر آپ نے کہیں افتخار فرمایا۔ تو صرف اپنی عاجزانہ بندگی پر۔ آپ نے اپنی آخری فضیلت کا شکرانہ ہمیشہ اپنی زبان پاک سے اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرنے اور اپنے بدنِ پاک سے عبادت کرنے اور اپنے خداداد مالِ پاک کے خرچ کے ساتھ ادا کیا۔

حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دن رات کے ہر ہر لمحہ کے ساتھ اپنی پوری زندگی کیساتھ اللہ تعالےٰ کی بندگی کو آخری طور پر مکمل فرمایا۔ شبہا شب اپنے پائے مبارک پر کھڑے ہو ہو کر عبادات انجام دیں۔ آپ کے پائے مقدسہ میں ورم آجاتا۔ یہاں تک کہ محبوبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت پر اللہ تعالےٰ کو محبانہ رحم آگیا۔ اور فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا

اے کملی پوش حبیب پاک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم آپ رات کی عبادت میں جو قیام فرماتے ہیں۔ وہ تھوڑا کر دیں۔ نصف رات یا اس سے کم و بیش۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ساری زندگانی اللہ تعالےٰ کی عبادت میں گذار دی۔ اور اسی پر تبلیغِ دین کا اتمام فرمایا۔

بندگی نے عقیدۂ توحید سے ابتدا کی۔ اور عبادات و معاملات کو مکمل ـــــ معاشرت کی تکمیل اور اخلاقِ کریمانہ کا اتمام کرتی ہوئی اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیمٍ کے ساتھ معراجِ کمال تک فائز المرام ہوئی۔

یہ حضور علیہ السلام کی بندگی تھی۔ جس نے انسانی تہذیب و تمدن کی بنائیں دلوں میں استوار کیں اور بازارِ انسانیت کو بہمہ وجوہ بندگی ہی بندگی بنادیا۔

آپ کے تاثراتِ بندگی یہاں تک پھیل کر وسیع ہوئے۔ اور یہاں تک انسانوں کو متاثر کیا کہ معصوم بچیاں توحید و رسالت کے نغمے گانے لگیں۔ ہر زبان پر الحمدللہ، سبحان اللہ کا وِرد جاری ہوگیا۔

لوگ ہمہ وقت باوضو رہتے۔ رات باوضو سوتے تاکہ نیند میں بھی اللہ تعالےٰ کی یاد سے غافل نہ ہوں۔

عورتیں گھاٹ پر بندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پردہ نشیں عورتیں پردوں میں عباداتِ الٰہی میں مشغول ہوگئیں۔ کوئی کام بے طہارت اور بغیر بسم اللہ کے نہ ہوتا۔ خلوت و جلوت میں ذکر و فکر کے مشغلے جاری ہیں۔ سفر میں حضر میں، دشت و جبل میں اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو گئیں۔ جدھر نظر اُٹھاؤ بس اللہ کے بندوں کی بندگی کے حسین و جمیل مناظر ہی نظر سے گذر رہے ہیں۔ گویا کہ یہ ساری بستی ہی پیکرِ بندگی ہوگئی ہے۔

بندگی کے اس پھیلاؤ نے بندوں کو چشمِ بینا عطا کردی۔ دِل بینا کر دیئے۔ علم و عمل سے آراستہ کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگ عرفانِ باللہ سے ہمکنار ہو گئے۔

اِس منظرِ حقیقی کی پُر تاثیر اداؤں سے اپنے تو اپنے غیر بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ گویا کہ یہ لوگ آسمانِ بندگی کے تابندہ ستارے ہو گئے۔

جنہوں نے پوری انسانیت کو خدائے لم یزل کی طرف دعوتِ بندگی میں راہنمائی کے فرائض انجام دیئے۔ اور مسلمان عشقِ خدا و عشقِ رسول میں فنا ہو گئے تھے۔

اور اکثر اللہ تعالےٰ کی بندگی کے ساتھ خدمتِ خلق کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ اِن کے قول و عمل سے ثابت ہوا۔ کہ مسلمان اگر پانچ گانہ نماز کے ساتھ اسلامی معاملات کو بھی بندگی

قرار دے کر فرضِ بندگی ادا کریں۔ تو نظریۂ اسلام کی ہمہ گیر افادیت بنی نوع انسان کے سامنے آسکتی ہے۔

اور اسلام نے ایسے لوگوں کو ولی اللہ کہا۔ یوم بلوغ سے لیکر تادمِ واپسیں ہر مسلمان مرد و عورت کو عبادات و معاملات کے ساتھ بندگی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اسلام نے خدمتِ خلق کو حقوق العباد کا نام دیا ہے۔ جس سے معیشت کو کمال تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اِسی واسطے بندوں کے حقوق کو بندوں کی معافی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اسلام میں انسانوں کے اتلافِ حقوق کی معافی بغیر اُن لوگوں کی معافی کے نامقبول قرار دی گئی ہے۔ جن کی حق تلفی ہُوئی ہو۔ اور ایسے لوگوں کو معاشرے کا مجرم کہا گیا ہے۔ اور اُن کی بندگی کو بے سود کہا گیا ہے۔ جو بظاہر بندگی کرتے ہوں۔ مگر بندوں کے حقوق پامال کرتے ہوں۔

یہ لوگ بخیل قرار دیئے گئے ہیں۔

کہ لوگوں سے جلبِ منفعت کریں۔ مگر لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اُلٹا اُن کی حقوق تلفی کریں۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمان ہے۔ کہ اگر یہ لوگ بر و بحر کے زاہد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔ بخشے نہیں جائیں گے۔

ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ کہ وہ نماز کے ارکان یاد کرے۔ تاکہ نماز کی ادائیگی میں کوئی فرق پیدا نہ ہو۔ نماز اُس بادشاہ مطلق کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ جس کی جلالت کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا۔

اتنے بڑے بادشاہ کی نماز ادا کرتے ہُوئے اگر اُس کی بڑائی اور جلالت کو دِل میں جگہ دیجائے تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ نمازی نماز کے لوازمات اور ارکان سے غفلت کرے۔ مگر اِس کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا لازمی خیال رکھے۔

جس طرح کامل نماز کے لئے کامل طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِسی طرح کامل طہارت کے لئے کامل ایمان، کامل طہارت، کامل نماز اور کامل خدمتِ خلق کے جذبہ پُر

کامل بندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔

مگر خواص کے لئے تفقّہ کی بھی ضرورت ہے۔ وہ حلال وحرام کے باریک مسائل پر اور عبادات و معاملات پر عبور رکھتے ہوں۔ عبادات ومعاملات کے روحانی مدارج پر بھی نظر رکھتے ہوں۔ اور اپنے نفس اور عوام الناس کی خدمات کے عارف ہوں۔

یہ طریقہ بندگی کو خاص الخاص بنا دیتا ہے۔ اور خاص الخاص بندے اپنے خدا کو دیکھ لیتے ہیں۔ اور عام مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ وہ اپنے دِل میں یہ گمان کریں۔ کہ وہ جس خدا کی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ اُن کو دیکھ رہا ہے۔ تاکہ اُن کے دِل میں خوفِ خدا موجود رہے۔ اور جب خوفِ خدا موجود ہوگا۔ تو وہ اپنی نماز درست کرنے میں باخبر رہیں گے۔ اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی نگہداشت کریں گے۔

چھوٹے بچوں پر اسی طرح نماز اثر انداز ہو سکتی ہے۔ جب کے گھر اور شہر کا ماحول اِس انداز میں نماز پڑھ رہا ہو۔ کہ گویا خداوندِ ذوالجلال کی حکومت کارِ فرما ہے۔ اور یہ کہ ہمارے سب کاروبارِ زندگی صرف اللہ کے حضور نماز اور خدمتِ خلق کے لئے ہیں۔

اگر ہم اِس مجوزہ بندگی کی ادائیگی نہیں کریں گے۔ تو دنیا کے سارے دھندے بے کار اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ اور ہماری ہستی کی قیمت خدا کے حضور میں ختم ہو جائے گی۔

اگر بندگی کا یہ سلسلہ اپنا تواتر جاری رکھ سکے۔ تو ایک غریب کے جھونپڑے سے لے کر ایوانِ حکمران تک خشیت ربانی کے ساتھ اسلامی تحریک کا باقاعدہ نفاذ ہو سکے۔

یہ وہ دستورِ اسلام ہے۔ جس سے ایک طرف پوری ریاست بندگی کا مظہر ہو کر عالمِ انسانیت کے سامنے آجائے۔ اور دوسری طرف انسانی معاملات یعنی انسانی باہمی تعلقات خوفِ خدا پر استوار ہو کر ایک ایسی صالح تہذیب وتمدن کی صورت اختیار کرے۔ جس کا نتیجہ خلقِ عظیم کی اطاعتِ اجتماعی کی تفسیر بن جائے۔

کتاب وسنت میں مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ کا یہی ترجمہ ہے۔

کہ جو کچھ تمہیں اللہ کے رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملے۔ اس پر عمل کرو۔ اور جس کام سے وہ تمہیں منع فرمائیں۔ اُس سے باز آجاؤ۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مسلمانوں کو نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کے احکامات ملے ہیں۔ کہ خدا اور رسول پر ایمان لانے کے بعد اِن ارکانِ اسلام کی پابندی کرو۔ اِن مذکورہ پانچ بنیادوں پر اسلامی ریاست کے تہذیب وتمدن کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

یہ وہ طرزِ تمدن ہے۔ جس کی بنیاد خوفِ خدا پر قائم ہوتی ہے۔

اوّلاً یہ کہ تم سب انسان خدا کی مخلوق ہو۔

دوئم یہ کہ تم سب کا پالنے والا ایک خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔

سوئم یہ کہ وہ اپنی رحمتِ خاص سے تمہیں اِس دنیا میں تدریجاً ترقی دے کر صلاحیتوں کے ساتھ کمال تک پہنچاتا ہے۔

کہ اُس کی رحمتِ خاص انجام کار بھی تمہیں کام آئے گی۔

اور یہ کہ دنیا وآخرت کا وہی مالک ہے۔ سزا وجزا کے دن کا مالک ہے۔

یہ صفاتِ باری تعالےٰ جس تہذیب وتمدن کے ذہن میں جاگزیں ہوں۔ وہ بھلا کسی اور کی عبادت کر سکتا ہے ؟۔

یقیناً اس تہذیب وتمدن میں دینی ودنیوی عروج محض سجدوں پر استوار ہوگا۔ اُنکا معبود وحدہٗ لاشریک ہوگا۔ اُن کی مُستحانِ حقیقی وہی ایک ذات ہوگی۔ وہ اُس کو ہادیٔ مطلق گردانتے ہوئے سب کام اُسی کے لئے کریں گے۔ یہی اُن کی صراطِ مستقیم ہوگی۔ جملہ انبیاء کا یہی مذہب تھا۔

اور صدیقین وشہداء اور صالحین کا یہی مسلک رہا ہے۔ اور اسی مسلک پر صراطِ مستقیم کا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔

جس قوم کی معیشت اِن بنیادوں پر تعمیر پاکر سامنے آئے۔ اُس سے بہتر اور کون سی معیشت

ہوگی۔ یہ کامل ترین معیشت جو مالک و مختار کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مرتب ہو۔ اِس سے بہتر کوئی معیشت نہیں ہو سکتی۔

اقوام عالم میں جن قوموں نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک بنایا۔ اُن ہی لوگوں نے انبیار کی ہدایت سے انکار کیا۔ اور انبیائے کرام کی ہدایت سے انکار کے نتیجہ میں وہ شرکِ باللہ کی مجرم ہوئیں۔

اُن کی تہذیب و تمدن نے جس معیشت کی تخلیق کی۔ اُس کا آغاز عیش سے ہُوا۔ اور اُن کا اختتام بھی اسی عیشِ نفس پر ہُوا۔

ایسی قومیں حالتِ اقبال میں بھی نگاہِ فطرت کی معتوب رہیں۔ اُن کا زوال و ہلاکت بھی عتابِ الٰہی کے نتیجہ میں واقع ہُوا۔ اور اہلِ حق اقبال مندیوں میں بھی مقبول و منظورِ حق رہے۔ اور کسی سخت آزمائش میں بھی اُنہوں نے اپنے مالک و مولا کی رضا جوئی و خوشنودی کو فراموش کیا۔ وہ سخت شدائد میں بھی مقبول و منظورِ حق رہے۔

جس تہذیب و تمدن کا منشا صرف نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کے ساتھ دِل کو بھلانے تک ہو۔ اُس تہذیب کے ضعف کا اندازہ وہی کر سکتا ہے۔ جس نے خدا کی لازوال قدرت پر ایمان کو مکمل کیا ہو۔

لہٰذا اسلام ایک آخری مذہب ہے۔ جس نے دلوں کو راست بازی پر ایمان لانے اور راست بازی پر کاروبارِ دنیا چلانے، راست بازی پر مرنے اور راست بازی پر انجام حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔

مسلمان اگر اسلام کو محض رسمی جان کر رسماً مسلمان ہونے کے عادی رہے۔ اور اُس پر یہ نہ سوچ سکے۔ کہ یہ فلاحِ دارین کا ضامن ہے۔ تو غالباً ملّتِ اسلامیہ کے لئے اِس سے زیادہ دنیا و عقبیٰ میں کوئی المیہ نہیں ہو سکتا۔

مسلمان جب تک زندہ رہے۔ پہلے اپنے وجود کی تہذیبِ باطن کو تقویٰ پر استوار کرے اپنے نفس کو قابو میں لائے۔ حرص و ہوا سے بچے۔ نفس کی معرفت حاصل کرنے کے لئے خدا کی بندگی کرے۔ اور ریا، کینہ، حسد و بغض کو اپنے سینہ سے ختم کر دے۔ پھر دوسروں کو تادمِ زیست اللہ

تعالٰی کی بندگی کی دعوت دیتا رہے۔

اور اسلامی تہذیبِ اخلاق کی ترجمانی کرے۔ اسلامی معاملات پر روشنی ڈالے۔ اسلامی معاشرت کا عملی درس دے۔ اسلامی اخلاقیات خود بخود ان احوال سے گذر کر سدھر جاتے ہیں۔ اخلاقِ اسلامی اس دنیا میں ثمرِ عمل ہے۔

جس طرح اچھے درخت سے اچھا پھل پیدا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اچھے اعمال سے اچھا ثمرِ اخلاقِ حسنہ پیدا ہوتا ہے۔

بہر کیف ساری زندگی عاجزی، انکساری، بندگی، مروت، خدمتِ خلق اور وعظ و نصیحت پر گذارنی چاہیئے۔ اس بندگانہ ماحول سے دِل پر بڑے بڑے نیک اور گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جو مومن کے جسم و جان کا خمیر بن جاتے ہیں۔

اِس طریق سے تائیدِ خداوندی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور انجام بالخیر ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ ورنہ دنیا دارِ فانی ہے۔ کوئی فرد یا قوم کتنی اعلٰی معیشت کے مالک کیوں نہ ہو جائے۔ بغیر اسلامی نظریہ حیات کے انجام کار سخت گھاٹا پائے گا۔

باب نہم

میرا متاعِ زیست

اور والدین کی عاطفت

اپنے والدین کی عاطفت میں مجھے دینی تربیت کے ساتھ ساتھ جذبۂ ایمان مِلا۔ جس پر میں نے بندگی کی باریک تر راہ پر قدم اُٹھایا۔ اُن کے پند و نصائح اور بزرگانِ طریقت و شریعت کی صالحانہ تاریخ کی روشنی میں اِس کتاب موسوم ابنِ عبداللہ لکھنے کے لئے اللہ تعالےٰ سے استعانت طلب کی۔ اور اِس باریک ترین اور احتیاط طلب راہ کو اختیار کیا۔ شاید کہ میں اللہ تعالےٰ کی ہدایت کا کِسی حد تک ترجمانِ باایمان ثابت ہوسکوں۔ اور اہلِ ایمان سے دعائے خیر وصول کرسکوں۔

اور یہ کتاب میرے لئے ذریعۂ نجات بن سکے۔ اور اسلامی مصنفین کے بازار میں اُس بڑھیا کی طرح خریداروں میں شامل ہوسکوں۔ جو بڑے بڑے مالداروں کی موجودگی میں ایک معمولی سوت کی اَنٹی لے کر حضرت یوسف علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے خریداروں میں شامل ہوگئی تھی۔ جس کا نام جریدۂ عالم کے خوش بخت خریداروں میں ابدالآباد تک روشن رہے گا۔

مجھے اپنے والدین کی نصیحت کے مطابق صرف اللہ تعالےٰ کی بندگی اور حقوق العباد کی نگہداشت پر کاربند ہوکر ہی تحریر و تقریر کی اجازت ہے۔ اور یہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ کسی مسلمان کے لئے اِس سے بہتر کوئی دوسرا سرمایۂ حیات نہیں ہوسکتا۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں صالحینِ اُمت نے جو کردار ادا کیا۔ وہ کتابِ حیات اور کتابِ ناطق ہے۔ اُس کو صحیح معنوں میں سرمایۂ عملوا الصلحت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

احکاماتِ الٰہی انسانی حیات میں بُرائی اور بھلائی کا تعین کرتے ہیں۔ اور اُن ہی تعینات پر کاربند رہنے اور کاربند رکھنے کے لئے تصنیفات اور مکالمہ کی ضرورت درپیش آتی ہے۔

تاکہ احکامات کے ذریعہ جو جو تعینات ہُوئے۔ اُن کو ذریعۂ نجات قرار دینے کے لئے زبان و قلم سے کام لیا جائے۔

اگر ذہنِ مصنف یا ذہنِ واعظ اِس مطمحِ نظر سے ہٹ جائے۔ تو اسلام میں ایسی بھٹکی ہوئی زبان و قلم کا کوئی اعتبار نہیں۔

ہمارے متقدمین صالحین اہلِ زبان و قلم نے جِس پابندیٔ تسلیم و رضا کے ساتھ زبان و قلم کے فرائض ادا کئے۔ وہ قابلِ تقلید ہونے کے علاوہ اِس میدان میں لاینحل عقدوں کی عقدہ کشائی بھی کرتے ہیں۔

لہٰذا اُن کی متقیانہ طرزِ تصنیف کی اطاعت میں ہی کوئی تصنیفی آغاز کیا جائے۔ تو وہ زیادہ قابلِ اعتبار اور قابلِ قبولیت ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالےٰ کی اور اس کے رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اپنے میں سے پرہیز گار کی اطاعت ہی مسلمانوں کی صفاتِ اعمال کو قابلِ سند بنا سکتی ہے۔

فلہٰذا مَیں اپنی اِس تصنیف کا موضوعِ اول حضرت والدہ بزرگوارہ کی اُس نصیحت کو بناتا ہُوں۔ جس میں آپ نے مجھے خوفِ عاقبت اور موت کا درس دیا۔ اور نماز کی تلقین فرمائی۔ اور نماز کو ترک کر دینے اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرنے پر قرآنِ مجید کے حوالہ سے اِس المیہ کو آثارِ قیامت قرار دیا۔ اور پھر قیامت کے چند اور آثار بھی بیان فرمائے۔

مگر چونکہ آپ کا مرکزِ پند و نصائح نماز تھا۔ اس واسطے کہ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ ختمِ رسالت کے بعد مسلمان پر سب سے پہلے جو فرض عائد ہوتا ہے۔ وہ نماز ہے۔

نماز کے حقوق وارکان کی حفاظت ورعایت پر ائمۂ اربعہ نے کتاب وسنت کی روشنی میں مکمل روشنی ڈال دی ہے۔ ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ کہ وہ سب سے اول نماز کو اس کے ارکان کی حفاظت کے ساتھ ادا کرے۔

میری والدہ جن کا اسمِ گرامی غیر معروف تھا۔ چونکہ اطراف وجوانب پہاڑ کے لوگ مذہبی پیشواؤں کی باحُرمت ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو ہمیشہ ادباً بی بی صاحبہ کے نام سے پکارتے ہیں بدیں وجہ اِس ادبی رواج سے اکثر مذہبی پیشواؤں کی ماؤں کے نام لوگوں کے زبان زدنہ ہونے کی بنا پر غیر معروف رہتے ہیں۔

مگر اماں جان کی ہمعصر خواتین آپ کے نام سے جزوی طور پر آشنا تھیں۔ اُن کا نام مبارک حافظ آمنہ تھا۔ مگر وہ صرف حافظ جان کے نام سے ہی جو پورے نام کا ایک حصّہ ہے۔ روشناس تھیں۔

آپ مغلیہ خاندان کے ایک عالم وفاضل اور متقی گھرانہ میں موضع سائن تحصیل مری میں پیدا ہوئیں۔ اور علم وفضل میں اپنے وقت کی ایک وحید خاتون تھیں۔ قرآن مجید اور احادیث شریفہ کے تفسیری علوم صرف نحو منطق ومعقول تک فضیلت علمیہ کی مالکہ تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو بڑی ذہانت وفطانت عطا کر رکھی تھی۔

آپ نے دیول کی سرزمین میں اکثر وبیشتر لوگوں کو تعلیم دین سے روشناس کرایا۔ آج بھی اُن کے شاگردوں کی کثیر تعداد دیول اور اکناف دیول میں پائی جاتی ہے

آپ نے سلسلۂ تعلیم وتعلم کے علاوہ تبلیغِ دین کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ آپ نہایت منکسرالمزاج، حلیم الطبع تھیں۔ کبھی آپ کی زبانِ مبارک سے غلیظ قسم کے الفاظ سُننے میں نہیں آئے۔ بڑی بااخلاق، بڑی عابدہ وزاہدہ اور شاکرہ باللہ تھیں۔ آپ بڑی متوکل وقانع وبردبار واقع ہوئی تھیں۔ غریبوں، بےکسوں، غم زدوں، بیماروں پر تلطف فرماتی تھیں۔

حالانکہ خود آپ کا گھرانہ اتنا آسودہ حال نہیں تھا۔ نہایت مختصر ذرائع ووسائل کے ساتھ آپ نے ایثار کے طور طریقوں سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا۔

پڑوسیوں سے آپ کے حسنِ سلوک کا یہ عالم تھا۔ جیسے اپنی حقیقی ماں بچوں سے تلطف فرمارہی ہو۔

دیول کی سرزمین علم وادب اور اخلاق کا گہوارہ رہی ہے۔ وہاں کے مردوزن بڑے معاملہ فہم اور نہایت سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔ یہ تدبر و فہم فراست خاندانی طور پر صدہا برسوں سے ان لوگوں کی میراث میں چلے آئے ہیں۔

ایسی باشعور مجلس میں اپنے اخلاق و تدبر، حسنِ مروت، حسنِ سیرت، حسنِ علم وعمل کو منوانا سوائے ذاتی اور فطری شرافت کے مشکل ترین امور سے ہے۔

مگر وہاں کے باشندوں نے آپ کی صفاتِ ذاتیہ اور خدماتِ دینیہ کے گن گائے۔ آپ کی تاریخِ اخلاق اب بھی لوگوں کے ذہنوں میں ایک نیک اور خدارسیدہ خاتون کی صورت میں موجود ہے۔ اور خاص وعام آپ کو یاد کرتے ہیں۔ اور آپ کو دعائیں دیتے ہیں۔

شاید آپ کی یہ تاریخ بہت سے وجوہاتِ کریمانہ کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے لوگوں کے دلوں میں محفوظ رہے۔ چونکہ فی الواقعہ آپ پارسارِ وقت تھیں۔ جنہیں بھولے سے بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ آپ کے بہت سے ایسے مقالات وکرامات ہیں۔ جو قابلِ ذکر ہیں۔

والدہ بزرگوارہ کے زہد واتقا نے ایک خدارسیدہ خاتون ہونے کی حیثیت سے جو جو اثرات میرے دل پر ڈالے۔ وہ بھی ایک طویل ترین داستان ہے۔ جس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

مگر آپ کے بعض سادے سادے فرمان اور بھولے بھالے نصائح اور عاجزانہ بسرِ اوقات۔ مفکرانہ نشست وبرخاست۔ حلیمانہ برتاؤ، نرم کلامی۔ جود وسخا، کم گوئی، عفت و عصمت، حیا و نگوں ساری، علم وعمل، کتاب وسنت کی پیروی، خدا اور رسول کی محبت۔ ہمہ وقت اولیاءِ اُمت کے تذکرے، اسلامی مسائل پر عام فہم تشریح، غریبانہ گذران، ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں سنتِ عظیمہ کی تکمیل۔ حیات وموت کے درمیان استقامت بار بار عزتِ نفس کے خلاف نفرت آمیز کلمات کے ساتھ نصیحت، بار بار اللہ کے سامنے اپنے آپ کو حقیر و پر تقصیر سمجھنے کی تلقین، ہر خوشی وغم میں شکرانۂ خداوند تعالےٰ کی بجاآوری، ہمہ وقت۔

خندہ پیشانی ۔ ہمہ وقت اللہ کے بارے میں گہری سوچ ۔ ہمہ وقت محبّتِ مصطفےٰ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اور نعتِ مصطفےٰ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا درس ، ایک دُرویشِ باللہ کے لئے جو صفات موزوں اور ضروری ہو سکتے ہیں ۔ اُن سب کا اُن میں پایا جانا وغیرہ ۔

یہ وہ متاعِ زیست ہے ۔ جو مجھے اپنی والدہ بزرگوارہ کی طرف سے میراث میں مِلا ہے ۔ مجھے گھٹی میں یہ عادات ملی ہیں ۔ میں کچھ نہیں ۔ نہ ہی میرا دعویٰ کچھ تھا ۔ مگر مجھ پر اللہ تعالےٰ نے سب سے بڑا احسان یہ فرمایا ۔ کہ مجھے بندگی کی بلندیوں پر اُڑنے کے لئے جو مقام مِلا ۔ وہ میرے والدین کی عاجزانہ اور دُرویشانہ زندگی ہے ۔

یہ وہ زندگی ہے ۔ جو صفات فقر کی حامل تھی ۔ اور کرامات کا گہوارہ ۔ اُن کے خوارقات جو میں نے بچشمِ خود دیکھے ۔ اُن کے لئے بھی ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے ۔ مگر بطور یادگار نصیحت و ثواب مختصرات کی صورت میں کچھ پند و نصائح جو ان بزرگانِ پاک کی طرف سے مجھے ملے ۔ بیان کرنا ذریعۂ نجات سمجھتا ہوں ۔ شاید میرے لئے اور اہلِ اسلام کے لئے ذریعۂ نصیحت اور ہدایت ثابت ہوں ۔

والدہ بزرگوارہ نے مجھے بچپن میں جب کہ میں سات آٹھ برس کا تھا ۔ قرانِ مجید کا پہلا رکوع یاد کرایا ۔ اور آخر کی دس سورتیں یاد کرائیں ۔ نماز کا سبق یاد کرایا ۔

اُس زمانہ میں انکی اور نصیحتوں کے علاوہ جو نصیحت مجھے یاد ہے ۔ اور میرے ذہن میں جس نے زیادہ اثر کیا ۔ وہ ذکرِ موت تھا ۔

فرمایا ۔ موت ضرور آئے گی ۔ اور اللہ تعالےٰ نے ہر ایک کی موت کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ بڑی عمر پاکر ہی انسان مرتا ہے ۔ فرمایا ۔ کسی کو موت چھوٹی عمر میں ہی آجاتی ہے ۔ کسی کو جوانی میں لے جاتی ہے ۔ اور کسی کو بڑھاپے میں ۔

مگر یہ گمان کر لینا کہ موت صرف بڑی عمر میں ہی آتی ہے ۔ ایک بڑی غلط فہمی ہے ۔ اِسی غلط فہمی کی بنا پر چھوٹی عمر کے بچے بے خوف ہو کر اس کی نماز نہیں پڑھتے ۔ چونکہ اُن کے ذہن میں یہ خیال آباد ہو جاتا ہے کہ ہم بڑے ہو کر ہی مریں گے ۔

حالانکہ یہ غلط ہے ۔ بلکہ چھوٹے اور بڑوں کے لئے ضروری ہے ۔ کہ وہ موت کو اپنے سامنے رکھیں ۔ تم نے دیکھا اور سُنا بھی ہے ۔ کہ کتنے شیر خوار بچے شیر خوری کے ایام میں ہی مَر جاتے ہیں ۔ اور کتنے ایسے بچے ہیں ۔ جو پانچ دس سال کی عمریں پاتے ھیں ۔ بعض پندرہ بیس سال تک ۔ بعض اس سے اوپر ۔ بعض چالیس سال تک یا اِس سے اوپر ۔ بعض پچاس تک ۔ بعض سو سال تک ۔

مگر یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے ۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کا فیصلہ ہے ۔ ورنہ کون ہے ۔ جو مرنا پسند کرے ۔ اگر کسی طاقت کے بل بوتے پر انسان موت سے بچ سکتے ۔ تو کسی بادشاہ یا اُس کے شہزادوں پر موت نہ آتی ۔ اور اگر غربت سے موت واقع ہوتی ۔ تو غریب لوگ کس طرح اِس دنیا میں اتنی طویل عمریں حاصِل کر سکتے ؟

فرمایا ۔ آج بھی ایسے غریب لوگ دنیا میں موجود ہیں ۔ جن کی عمریں سو سال سے بھی زائد ہو چکی ہیں ۔ یہ دستور العمل قدرت کے اِس فیصلہ کا قطعی اور علانیہ ثبوت ہے ۔ کہ موت امیر و غریب سب پر یکساں مسلط کر دی گئی ۔ اور وقتِ مقررہ پر آتی ہے ۔ جس میں ایک لمحہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا ۔ یہ وہ اٹل فیصلہ ہے ۔ جس سے کوئی تدبیر نہیں بچا سکتی ۔

فرمایا ۔ اگر بچپن میں ہی یہ عقیدہ دِل پر اثر انداز ہو جائے ۔ کہ خدا نے ہم کو پیدا کیا ۔ اور وہی ہم کو پالتا ہے ۔ اور اُسی کے فیصلہ کے مطابق ہم پر موت ضرور آئے گی ۔

اور یہ کہ اُس نے اپنی طرف سے اپنے نبی پاک کو ہماری ہدایت کے لئے بھیجا ۔ اور سچی ہدایت کا راستہ بتایا ۔ اور اللہ تعالےٰ نے اپنے سب سے برگزیدہ اور سب سے پیارے بندے سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بنایا ۔ اور اُن کے ذریعہ قرآن مجید جیسی آخری اور الہامی کتاب بخش دی ۔

جس میں ازل تا ابد سب کچھ لکھ دیا گیا ہے ۔ جس کتابِ مبین کے ذریعہ ہمیں دنیا میں اسلامی طریقہ پر رہنے سہنے کے جملہ طریقے بتا دیئے گئے ہیں ۔ اور اِس کتاب کے ذریعہ ہمیں بتایا گیا ہے ۔ کہ قیامت بھی ہو گی ۔ جہاں سب مخلوقات کو خدائے تعالےٰ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہو گی ۔ اُس دن صرف اللہ کی بادشاہی ہو گی ۔ یعنی سوائے اللہ تعالےٰ کے

اُس دِن کِسی کو کچھ اختیار نہ ہوگا۔

آپ نے قیامت کا ذکر کرتے ہوئے قیامت کے آنے کے کچھ آثار بھی بیان فرمائے جِن میں سب سے پہلے آپ نے قرآن مجید کی ایک آیتِ پاک کا حوالہ دیا۔ گویا کہ وہ نشانی اِس زمانہ میں پائی جاتی ہے۔ مجھے یہ سُن کر خوف ہونے لگا۔ قرآن مجید کی وہ آیتِ پاک یہ ہے۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۔

آپ نے ترجمہ کے طور پر فرمایا۔

کہ اِس آیت میں پہلے بزرگوں کا ذکر کر کے فرمایا گیا ہے۔

کہ اُن کے بعد آنے والے ایسے لوگ ہوں گے۔ جو نمازیں ضائع کر دیں گے۔ اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ یہ علامت ہوگی۔ کہ قیامت قریب ہے۔ یا وہ بہت جلد اِس سے مِل جائیں گے۔

پھر آپ نے فرمایا۔

کہ اگر غور سے حالات کا جائزہ لیا جائے۔ تو اِس آیتِ پاک کا ترجمہ بالکل سامنے آجاتا ہے۔ ہر گھر میں لوگ خواہشاتِ نفسانی کی خاطر سب کچھ کر رہے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ہیں۔ جو اللہ کی صحیح نماز پڑھنے والے ہوں۔

اگر ایمانی سنجیدگی کے ساتھ نماز کے متعلق غور و خوض کیا جائے۔ تو اہلِ دنیا کی اپنی حیاتِ مستعار کے لئے محنتِ شاقہ ہی موجبِ نصیحت ہو سکتی ہے۔ کہ وہ دنیا کے مُشکل ترین کام ادا کر لیتے ہیں۔ اور بار بار تاحسینِ حیات کاروبارِ زندگی میں تکرار کرتے ہیں۔

اور کبھی اپنی تھکاوٹ سے اُکتاہٹ کا نام تک نہیں لیتے۔ اور مسلسل حیاتِ مستعار میں اپنے کاروبار کو جاری رکھتے ہیں۔ یہ کاروبار کتنے محنت طلب ہیں۔

مگر پھر بھی دنیادار لوگ بخوبی اُن کو سرانجام دے رہے ہیں۔ اور اُن کی انجام دہی میں بڑا فخر

کرتے ہیں۔ مگر نماز پر نماز قضا ہوتی چلی جارہی ہے۔ اور کہیں بھی اِس المناک حالت پر کوئی افسوس تک کرتا ہوا منظر نہیں آتا۔

برخلاف اِس کے دنیاوی اُمور میں سے ایک معمولی سے خسارہ پر بھی کفِ افسوس مِلا جاتا ہے۔ یہ علامتِ قیامت کے قریب ہونے کی ہے۔ کہ لوگ اپنے پیدا کرنے والے سے زیادہ دنیا سے پیار کرنے لگے ہیں۔

قیامت تو قریب ہی ہے۔ مگر جب قیامت کے وہ آثار جو قرآن و حدیث کے ذریعہ ہمیں بتائے گئے ہیں ہمارے سامنے آجائیں۔ تو یقیناً خوف و ہراس کو دِل میں جگہ دینی چاہیئے۔

اِس زمانہ میں بہت سی چیزیں ایسی نمودار ہوچکی ہیں۔ جو علاماتِ قیامت سے ہیں۔ چھوٹے بڑوں کا ادب نہیں کرتے۔ اور بڑے چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتے۔ مردوں میں عورتوں والے خصائل پیدا ہونے شروع ہوگئے۔

حالانکہ اللہ تعالےٰ نے اُنہیں مرد پیدا کیا ہے۔ اور عورتیں کسی طرح بھی مرد نہیں بن سکتیں۔ مگر مرد بننا چاہتی ہیں حالانکہ خالقِ فطرت نے مرد کو مردانگی کے لئے پیدا فرمایا۔ اور عورت کو عورت ہوکر عورتوں والے فرائض سرانجام دینے کے لئے پیدا فرمایا۔

اسلام نے دونوں کو اپنی فطرت کی حدود میں رہ کر دینی و دنیوی اُمور سرانجام دینے کی تعلیم دی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں عملِ صالح کی بنا پر ایک عورت انجام کار میدانِ حشر میں غیر صالح مرد پر درجہ لے سکتی ہے۔ اور ایک مرد غیر صالح ہوکر میدانِ حشر میں عنداللہ عورت سے بھی درجہ میں کمتر ہوسکتا ہے۔

چونکہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ وہ درجات کی تقسیم اصناف پر نہیں کرتا۔ بلکہ درجات کی تقسیم نیک اعمال پر کرتا ہے۔

اسلام نے مرد کو مرد رہ کر اور عورت کو عورت رہ کر اپنی اپنی حدود میں احکامِ اسلام

کی بجا آوری کا حکم دیا ہے۔ اور اسلام نے خلافِ فطرت کسی بات کو پسند نہیں کیا۔

فرض کر لیجئے کہ اپنی بیوی بچوں کی موجودگی میں اگر مرد کھانا، پکانا، سینا پرونا شروع کر دے۔ اور عورتیں مردوں کے کام شروع کر دیں۔ تو یقیناً دونوں کام کسی نہ کسی طرح ہونے شروع ہو جائیں گے۔ مگر یہ فعل قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔

یقیناً اُس گھر، اُس بستی اور اُس شہر اور اُس ملک پر زوال آئے گا۔ جہاں مردوں نے عورتوں کا طرزِ تمدن اختیار کیا۔ اور عورتوں نے مردوں کا طرزِ تمدن پسند کیا ہے۔

ہر چیز اور ہر پُرزہ اپنے مقام پر رہ کر ہی صحیح کام سرانجام دے سکتا ہے۔ فطرۃ کے قرینوں کے خلاف جو بات یا کام وقوع پذیر ہو گا۔ یقیناً وہ ایک مُہلک داستان بن کر اذیت بن جائے گا۔

عورتوں کا سرِ بازار مردوں کے دوش بدوش چلنا۔ اور پھر بے حیائی اور عریانی پر خوف نہ کھانا۔ اور مردوں پر سبقت لے جانے پر کمر بستہ ہونا۔ آئینِ خداوندی کے مطابق قیامت کی نشان دہی ہے۔ چونکہ مرد و عورت کا یہ قرینہ خلافِ قانون فطرۃ ہے۔

اِس طرح جوں جوں مردوں اور عورتوں کے حالات زیادہ انحطاط پذیر ہوتے چلے جائیں گے۔ بس سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اہلِ زمانہ کو قیامت آواز دے رہی ہے۔ چاہیئے کہ اِن علامات کے ظہور پر مسلمان مرد عورتیں، مسلمان بچے اور جوان سب اللہ تعالےٰ سے ڈریں۔ اور دین کی اطاعت کریں۔ اور توبہ کریں۔

امیر غریبوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اور غریب امیروں کے خلاف غیبت کرتے رہتے ہیں۔ اُمراء اگر بدسلوکانہ روش کے ساتھ غیبت پسند بھی ہوں۔ تو گویا وہ بیک وقت دو گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ غریب سے کام لے کر پسِ پُشت اُس کی اہانت بالغیب کرنا معتوبِ خدا ہونے کی نشانی ہے۔

ایسے لوگ عذاب کو دعوت دیتے ہیں۔ اور غریب اگر بجائے صبر و تحمل کے امیروں کی غیبت کرنا شروع کر دے۔ یعنی جب امیروں کے سامنے ہو۔ تو تعظیم سے سرِ تسلیم خم کرلے۔ اور جب اُن سے اوجھل ہو۔ تو اُن کی غیبت شروع کر دے۔ یہ دونوں طریقے خلافِ اسلام ہیں۔

اِس طرح امیر اپنے روحانی مقامِ حمیّت سے بیگانہ ہو کر صرف صاحبِ مال رہ جاتا ہے۔

مگر خدا اور عوام کی نگاہ میں وہ اپنا خداداد مقام عزت و عظمت کھو بیٹھتا ہے۔ کیا تعجب کہ اُسے کل اُن ہی لوگوں کا محتاج ہونا نصیب ہو۔ جن سے کام لینے کے بعد وہ اہانت کرتا تھا۔

حق تو یہ ہے جسے اللہ عزت دے۔ اُسے سب سے زیادہ اپنے مالک اور مولا سے ڈرنا چاہیئے۔ چونکہ مالک و مختار نے اُسے بہت کچھ دے کر اُس کو اُس کی اولاد اور اُس کے خاندان کو معاشرہ میں معزز کر دیا ہے۔

وہ ناز و نعم کے ساتھ اپنے بال بچوں میں زندگی بسر کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اور اتنی عزت و عظمت اتنے ناز و نعم کے بعد اگر اُسے عزت کی بلندی سے گرا دیا جائے تو یہ حالت نسبتاً غریبوں کی حالتِ غریبانہ سے کہیں زیادہ دردناک صورت بن جاتی ہے۔

لہٰذا اس قسم کے لوگوں کو اُن لوگوں کی تاریخ پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے۔ جو بلندیوں سے گر گر اپنے چاکروں کے چاکر بن گئے۔ اور انہیں نہایت ابتر حالت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور فطرت کی بازپُرس نے اُن کی بلند ہونے والی آنکھوں کو سرِ بازار عوام و خواص کے سامنے نیچا کر دیا۔

اگر اُمراء ان عبرتناک حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی عزت کی حفاظت کریں۔ اور ہمیشہ توبہ کریں۔ اور اللہ کے حضور نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ اور صلہ رحمی کی صورت میں شکرانہ بجالائیں۔ تو اُن کی عزت محفوظ رہ سکتی ہے۔

ایسی حالت میں میرا یقین ہے کہ ایسے اُمراء قوم کی عزت و برکت پشت ہا پشت تک سلامت رہے گی۔ اور اللہ تعالےٰ اُن کی ضرور تائید کرے گا۔ اور عوام و خواص اُن کو دعائیں دیں گے۔ جن دعاؤں کی تاثیرات نسلاً بعد نسلاً صد ہا سال تک اُن کا ساتھ دیں گی۔

اگر غریب لوگ اپنی غربت پر صبر کریں۔ اور غربت کو اللہ کی طرف سے دی ہوئی چیز سمجھیں۔ اور ایمان رکھیں۔

کہ رزاق صرف اللہ کی ذات ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے تھوڑی روزی دیتا ہے۔ اور یہ دونوں حالتیں امیر و غریب کے لئے آزمائشی صورت میں اللہ کی طرف سے بھیجی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ اہلِ مال و عزت کی ساتھ آزمائش کرے۔ کہ کیا مال و دولت کے بعد یہ لوگ شکر گذار ہیں۔ یا ناشکر گذار ہو گئے ہیں۔ اور یہ کہ کیا غریب اور نادار لوگ خداداد ناداری میں مایوس ہو کر شکر گذاری سے بیزار ہو گئے ہیں۔ اور میری راہ سے ہٹ گئے ہیں۔

ایسی حالت میں غریب لوگ اللہ تعالےٰ کی مرضی پر راضی رہ کر اپنی حلال کمائی پر اگرچہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔ صبر کریں۔ اور نماز روزہ کے پابند رہیں۔ اور بار بار اللہ تعالےٰ کا شکرانہ ادا کرتے رہیں۔ اور جھوٹ، غیبت، چغلی، چوری، رہزنی، مردم آزاری سے بچتے رہیں۔ تو یقیناً اللہ تعالےٰ اُن کو غنی کرے گا۔ اور وہ ایمان کے ساتھ عزتِ دنیا بھی پائیں گے۔

دنیا میں کوئی ایسا امیر نہیں ہے۔ جو نسلاً بعد نسلاً امیر چلا آیا ہو۔ چند پشتوں تک بمشکل اگر آسائش ساتھ دیدے تو یہ غنیمت ہوتی ہے۔

مگر ناشکری کی بنا پر پھر ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ایسے امیر پھر زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اس قسم کی اقبال مندیوں کے زوال پذیر ہونے پر کسی کو غم و اندوہ نہیں ہوتا۔

البتہ ایسے لوگوں کا زوال لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ضرور ہوتا ہے۔

جو لوگ اقبال مندیوں کے ساتھ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ اور صِلہ رحمی کرتے ہُوئے مر جائیں۔ یا کسی طرح ختم ہو جائیں۔ تو ایسی حالت میں بھی لوگ اُن کو یاد کرتے اور دعائیں دیتے ہیں۔ اُن کی تاریخ لوگوں کے دِلوں میں محفوظ و مامون رہتی ہے۔ اور ایسے خاندان کا کوئی بچا کھچا آدمی پھر اللہ کے فضل و کرم اور لوگوں کی دعاؤں سے سر اُٹھا لیتا ہے۔ اور ایسے خاندانوں کو دوبارہ سامنے آنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

باب دہم

فضیلت علماءِ اُمت

عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَآءِیْل

دنیا میں سب سے لمبی تاریخ اور نہ ختم ہونے والی سیرت انبیاء و اولیاء کی ہے۔

وہ نسلی طور پر آگے چل سکیں۔ یا رُک جائیں۔ دونوں حالات میں اُن کی تاریخ درخشندہ رہتی ہے۔ اِس کی وجہ اُن کی غیر مضر صالحانہ زندگی۔ اور اُس میں اللہ تعالےٰ کی بندگی اور انسانیت سے حسنِ سلوک کی رواداری ہوتی ہے۔ جو ابد الآباد تک باقی رہنے والی ہے۔

لوگ اُن کے آثار سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اور اُن کی قبور کی مٹیوں سے اپنے جان و مال اور اولاد سے بھی کہیں زیادہ اظہارِ عقیدت و محبت کرتے ہیں۔ انسانی روح کی یہ قدیم عادت ہے۔

کہ وہ اُن انسانی شخصیات کے کریمانہ خصائل کو یاد رکھتی ہے۔ جنہوں نے راہِ راست پر چل کر فطری حقوق کی بنظرِ شفیقانہ حفاظت فرمائی ہو۔ اور اُن کی بجاآوری کے فرائض انجام دیئے ہوں۔

اِس طرح گویا روحِ انسانی اپنے حافظۂ لطیف سے صفاتِ پاک کی امین ہُوئی۔ روحِ انسانیت نے ہمیشہ کریم الصفات لوگوں کے ذریعہ خدائے کریم کا سُراغ

لگایا۔ روح قفسِ عنصری میں اِن ہی پاک باز لوگوں کے ذریعہ بالیدگی حاصِل کرتی ہے۔

ایسے لوگ اپنے جسم و جان کی محبتِ ذاتی کے معیار پر لوگوں کے جسم و جان کی محبّت کا اندازہ کرتے ہیں۔ اور یہی معیارِ احساس اُن کو شفیق بناتا ہے۔

دنیا کا ہر متاع چاہیے روحانی ہو یا مادی۔ کوئی صفات و خصائل کسی طرح بھی حاصِل ہُوں۔ جو انسان کو عطا کئے گئے ہُوں۔ اور انسانی صفات لاتعداد ہیں۔ جو گنی نہیں جا سکتیں۔

مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ سب صفات خدا کی عطا ہیں۔ صفات بُری بھی ہوتی ہیں۔ اور نیک بھی۔ بُری صفات کا حامِل صفاتِ شنیعہ کا موصوف ہوتا ہے۔ اُس کا گمان کرنے اور اُس کو دیکھنے سے ہی شریف انسان کی روح ناراضگی کے ساتھ ذہن پر اُبھر آتی ہے۔ اور اظہارِ نفرت کے ساتھ اُن کے لئے مذمت کرتی ہے۔

اِس طرح طبع انسانی میں صفاتِ شنیعہ کے موصوف انسان سے نفرت ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اور روحِ انسانی اُس کو بد اخلاق گردان کر نہایت حقارت کے ساتھ اُسے ٹھکرا دیتی ہے۔ ہر صفاتِ بد کا موصوف ہر حالت میں طبعِ انسانی پر ناگوار اثرات کا ایک مکروہ اور خلل انداز بوجھ بن جاتا ہے۔ حتّٰی کہ صفاتِ بد کا موصوف جب خود شرافت کے معیار میں اپنا مطالعہ کرتا ہے۔ تو وہ اپنی طبع پر بھی ایک ندامت محسوس کرنے لگتا ہے۔

اور اُس کے ہم خیال یعنی یار و مددگار دوست بھی ایک دوسرے کے لئے اپنی صفاتِ بد کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی تاریخِ بد کا جائزہ لینے کے بعد ایک دوسرے کا طبعًا خفّت آفریں قلق و اضطراب بن جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی زندگی جہاں دوسروں کے لئے باعثِ رنج و ملال ہوتی ہے۔ وہاں اپنے لئے اور اپنے حلقۂ اثر کے لئے بھی سخت ترین ہلاکتوں و خجالتوں کا پیشِ خیمہ ہوتی ہے۔ اُنہیں عادتِ بد جرائم اور معصیّت پر مجبور کرتی ہے۔

مگر روحانی طور پر اِس قسم کے لوگ آسودہ حال ہوں یا غیر آسودہ حال، سخت غیر مطمئن ہوتے ہیں۔

اِن لوگوں کا علاج شرفائے صالحین کے ذمّہ ہے۔ یہ عادتِ بد کے حاملین لوگ جسمِ انسانی کا ایک بیمار اور متعفّن حصّہ ہوتے ہیں۔ وجود کا صحت مند حصّہ ہمیشہ اپنے بیمار حصّۂ جسم کی پورے احساس اور ذمہ داری کے ساتھ اصلاح کرنے میں مصروف رہتا ہے۔

بدقسمتی سے اگر جسم کا بیمار حصّہ اصلاح پذیر نہ ہو سکے۔ تو یہ اندازہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ یہ بیمار عضو جسم کے کِس حصّہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر بیمار حصّہ کِسی ایسی نازک جگہ واقع ہو۔ جہاں تک علاج بالادویہ نہ ہو سکے۔ تو ماہرین اپریشن اطبا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

اگر اپریشن کا تجربہ بھی ناکام ہو جائے۔ تو ایسی صورت میں جسم کا مریض حصّہ عضوِ معطل ہو کر تادمِ زیست جسم و جان کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ یا بصورتِ دیگر جسم و جان کے لئے مہلک صورت اختیار کر لیتا ہے۔

انسانی جسم اخلاقی ایجاد کا منبع ہے۔ فطرت نے اُس کو اخلاقِ حسنہ کے لئے ہی پیدا فرمایا تھا۔ انسان فردی حیثیت میں انسانی قوم کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اور اجتماعی حیثیت سے مربوط ہو کر جسمِ قوم میں وحدانی کیفیّت اختیار کر لیتا ہے۔

مگر باوجود اِس صورتِ ظاہریہ کے وہ فرد ہو کر ربط کرتا ہے۔ جیسے قطرات کے اجتماع سے سمندر بنتا ہے۔

مگر قطرات منتشر ہو کر سمندر نہیں بن سکتے۔ بلکہ محض انفرادی قطرات ہی رہ جاتے ہیں۔

اِسی طرح نسلِ انسانی من حیث الفرد و اجتماع اولادِ آدم ہے۔ اور یہ سب مِل کر انسانی قوم کہلاتے ہیں۔ اِن کے روابط قلب و نظر سے وابستہ ہیں۔ جسم محض مٹی ہے۔ اِس میں جتنے خواہشات انگڑائی لیتی ہیں۔ وہ سب احساسِ روح سے پیدا ہو کر جسم و

جان میں پھیل جاتی ہیں

اگر انسانی قلب ونظر عادتِ بد قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور اُس پر عمل شروع ہو جائے۔ تو یقیناً اثراتِ بد اقلیمِ وجود میں پھیل کر جسم و جان کو بُرائی سے متأثر کر دیتے ہیں۔

جب ایک کافر کا وجود بُرائی کی گرفت میں آجاتا ہے۔ تو وہ روحانی مریض ہو جاتا ہے۔ ایسے ایک جسم کے روگمانی طور پر مریض ہونے کی حالت اُس خلیّے کی طرح ہوتی ہے۔ جو خون میں بیمار ہو کر دوسرے خلیوں کو بھی بیمار کر دیتا ہے۔ اِس طرح بہت سے خلیّے بیمار ہو کر آہستہ آہستہ صحت مند خلیوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ آخر کار جسم کے لئے وہ باعثِ ہلاکت بن جاتے ہیں۔

کونسا ایسا جسم ہے۔ جو اپنے ذاتی خلیّوں یا ذاتی اعضا یا ذاتی جسم کی بیماری پسند کرتا ہو۔ مگر باوجود اِس ناپسندیدگی کے بھی لوگ اپنے افعالِ جسمانی خراب کر لیتے ہیں۔ اور انجام کار اُنہیں پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔

جو جسم احتیاط کریں۔ اور صالح العمل ہو جائیں۔ اور طبیب سے مشورہ لیں اور اُس پر عمل کریں۔ اُن کے جسم کی بیماریاں کم ہو جاتی ہیں۔ اور صحت بحال رہتی ہے۔ جو آسائشِ جسم و جان کے علاوہ قوم و ملت کے لئے بھی ایک قومی معاون بن جاتا ہے۔

بالکل اِسی طرح جسمانی اخلاق روح پر مرتب ہوتے ہیں۔ روح کے صحت مند ہونے سے اخلاق بھی صحت مند ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگ جو تزکیۂ نفوس پر روحِ پاک کو پال کر اُسے بالیدگی دیتے ہیں۔ وہ متقی صالح ہوتے ہیں۔ ایک متقی صالح سے کئی صالح لوگوں کا ایک گروہ بن جاتا ہے۔ اور ایک بااخلاق صالحین کا گروہ ایک معاشرے کو صحت مند بنا دیتا ہے۔

اِسی طرح قومیں صحیح نہج پر آکر اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ جو مظاہرہ نوعِ

انسانی کو اپنے حسنِ کردار سے متاثر کرلیتا ہے۔ اور انسانیت راہِ اخلاق پر آجاتی ہے۔

لہٰذا بداخلاق لوگوں کے علاج کی ذمہ داری صاحبِ اخلاق صالحینِ ملّت پر عائد ہوتی ہے۔

اگر صالحینِ قوم قوم سے لاپرواہی کریں۔ تو اُن کی اپنی فردیت صالح تو ضرور ہوگی۔ مگر جود وسخا سے محروم صالحیت قیدِ فردیت کا شکار ہوکر محروم اجتماع ہوجاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ایسی صالحیت جو صرف اپنی ذات کے لئے کی جائے۔ وہ بخل ہے۔

چونکہ اللہ تعالےٰ نے اپنی نیکی کے نفاذ کے لئے اپنے نیک بندوں یعنی انبیاءِ کے ذریعہ پوری انسانیت کو نیکی کی دعوت دی ہے۔ اور آخرالزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذریعہ آخری نیکیوں کا مجموعی پیغام ساری انسانیت کو دیا اور قیامت تک متقی صالحین کا سلسلہ جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ تاکہ نیکی حاصل کرنے پر تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

ایک صفاتِ نیک ہیں۔ جن کا موصوف اخلاقِ حسنہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اِس کی تربیت نیک اعمال پر ہوتی ہے۔ وہ جہاں سے نیکی پائے گا۔ اُس کو اخذ کرے گا۔ اور جہاں بدی کو دیکھے گا۔ اُس کی اصلاح کرے گا۔ نیک آدمی کی عادت ہے۔ کہ وہ دوسروں کو نیک بناتا ہے۔ اجتناب عن المعاصی کا حکم دیتا ہے۔

مگر اِس طرح کہ اپنی ذات کو بُرائیوں سے بچائے۔ اور جہاں اور جس جگہ اصلاح طلب معاصی انسانی کردار کی صورت اختیار کرلیں۔ وہاں خود کو معاصی سے اِس طرح بچاتے ہوئے اصلاحِ معاشرہ کرے۔ جس طرح طبیب اپنے آپ کو مرض سے بچنے کی تدابیر اختیار کرتے ہوئے مرض کا علاج بھی کرتا ہے۔ تاکہ

مرض رفع ہو جائے۔

اگر تمام طبیب خوفِ مرض سے مریضوں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ اور ترکِ علاج کر دیں۔ تو یقیناً امراض بڑھتے بڑھتے پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

اِس طرح بھاگنے والے طبیب کو بھی وہ بیمار ہوائیں اور بیمار فضائیں خلوت گاہوں اور پناہ گاہوں میں جا کر پکڑ لیں گی۔ جو بیماروں سے متاثر اور متعفن ہو چکی ہیں۔

اِسی طرح متقی صالحین اگر گناہ گاروں کی اصلاح سے خوفِ گناہ کی وجہ سے راہبانہ انداز سے شہر چھوڑ کر بَن میں چلے جائیں گے۔ تو گناہ معاشرے کو اتنا زیادہ مجرم بنا دیں گے۔

کہ معاشرے سے چور ڈاکو پیدا ہو کر اُسی جنگل کو اپنی پناہ گاہ بنا لیں گے۔ جس میں کوئی صالح خوفِ گناہ سے ڈر کر چھپ گیا تھا۔ وہ چور ڈاکو اس کے جنگل میں پہنچ کر اُس کی متقیانہ زندگی میں خلل انداز ہو سکتے ہیں۔ قوم و معاشرے کے جرائم کی لپیٹ سے کوئی بھاگنے والا نہیں بچ سکتا۔

ہیضہ کی وبا اور چھوت کی دوسری بیماریاں دشت وجبل، شہر و بیابان میں لوگوں کو گھیر لیتی ہیں۔ اِسی طرح انسانی جرائم ایک بیابان سے شہر کے جھونپڑے سے لے کر ایوانِ شاہی تک۔ اور ایک معمولی شریف زادے سے لے کر ایک بڑے ولی اللہ تک اپنے اثرات پھیلا دیتے ہیں۔ اِس واسطے متقی صالحین پر لازم ہے۔ کہ وہ صالحیت کی تنفیذ کریں۔

نیکی کے پھیلنے اور پھیلانے کا یہی اسلامی دستور العمل ہے۔ یہی طریقِ تبلیغ حسن ہے۔

ورنہ اس طرزِ تبلیغ سے ہٹ کر محض رطب اللسانی کو ہی رواج دیا جائے۔ اور اپنے نصائح کے مطابق صالحیت کا حصول نہ کیا جائے۔

توطبعِ انسانی کے نفسانی مفسدات کا ردِعمل ہونے کی بجائے نفسِ امارہ اُلٹا صالحیت کے خلاف اپنا ردِعمل جاری کر دیتا ہے۔

جب بھی متقی صالحین لوگ اپنی قولی و عملی تبلیغ بند کر دیتے ہیں۔ تو ایسے حالات میں خشک دعوؤں کے ساتھ غیر صالح لوگ تبلیغِ دین کا لبادہ اوڑھ کر میدانِ تبلیغ میں آجاتے ہیں۔ اور سرِ بازار قرآن و حدیث بیان کرتے ہیں۔ اور اُن پر موعظت فرماتے ہیں۔ قرآن و سنت کے مطابق احکامات کی تشریح کرتے ہیں۔

مگر ایسے مبلغین جب خود اپنے کہے ہوئے بیاناتِ اسلامی کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو عوام الناس کے دِل سے اعمالِ اسلامی کا احترام آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایک مدت کے بعد عوام محض رسمی مسلمان ہونے پر ہی اکتفا کر لینا پسند کر لیتے ہیں۔

ایسے مبلغین کی تبلیغِ دین سے ایک استفادہ ضرور ہوتا ہے۔ کہ اسلام کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ اور کسی نہ کسی طرح لوگ اسلام کے بنیادی مسائل سے روشناس رہتے ہیں۔ اور علمائے اُمت کے نیک مسائل اُن کے ذہن نشین ہوتے رہتے ہیں۔ اور معاشرہ اسلام کی حدود کے اندر رہی رہتا ہے۔

اگرچہ معاشرہ بکمال اسلامی احکامات کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح اسلام کو اپنے دِل میں جگہ دیتا رہتا ہے۔ اور اس سے مانوس رہتا ہے۔

علمائے اُمت میں بعض علماء ولی اللہ ہوتے ہیں۔ اور اپنے تقوٰی کی بناء پر وہ صاحبِ حال بھی ہوتے ہیں۔ جن کی تاثیرات تمام قسم کے علماء کو نورِ عرفان سے مستفیض کرتی رہتی ہیں۔ اِس طرح گروہ علماء کا سلسلہ بار بار راہِ حق پر اُبھر کر سامنے آتا رہتا ہے۔

ہر یک صد علماء میں چند علماء ولیِٔ کامل ہوتے ہیں۔ جن کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اُن کی دعائیں بھی مقبولِ بارگاہِ ربِ العزت ہوتی ہیں۔ اور وہ صاحبِ خرقِ عادات بھی ہوتے ہیں۔ اُن کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں اکثر بارگاہِ الٰہی سے قبول ہو کر لوگوں پر درِ

فیض کھولتی رہتی ہیں ۔

اللہ تعالیٰ ایسے مکرّمین علمار کی بڑی عزت فرماتے ہیں ۔ اور نصرتِ غیبی ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتی ہے ۔

ایسے علمار کی اہانت کرنے والا اللہ کو ناراض کرلیتا ہے ۔ علمار وصوفیار دونوں یکے بعد دیگرے اولیا اللہ ہیں ۔ اِن سے جنگ مول لینے والے خدا سے جنگ کرتے ہیں ۔ اور معتوبِ بارگاہِ الٰہی ہوجاتے ہیں ۔ اور اُن سے برکتیں چھین لی جاتی ہیں ۔

علمائے اُمت کے سامنے کسی غیر عالمِ دین کو اونچی آواز سے بات نہیں کرنی چاھئے ۔ اُن کے سامنے آہستہ چلنا چاہئے ۔ اُن کی محفل میں دنیوی لہو ولعب کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں ۔ اُن کے سامنے کسی قسم کی بے ادبی نہیں کرنی چاہیئے ۔ وہ جو کچھ فرمارہے ہُوں ۔ اُسے نہایت ادب کے ساتھ پوری توجہ اور غور سے سُننا چاہیئے ۔

اگر کسی بات پر شک وشبہ گذر جائے ۔ یا اُن کی نیک باتوں کے سمجھنے میں کسی مقام پر دقت پیش آرہی ہو ۔ تو اُن کے دورانِ کلام سوال نہیں کرنا چاہئے ۔ اِس واسطے کہ اُن کا موضوعِ کلام ٹوٹ جاتا ہے ۔ وہ سبیلِ تذکرہ سے ہٹ جاتے ہیں ۔ جس سے اُن کے دِل کو رنج وملال ہوتا ہے ۔

دوسرے اُن کے موضوع سے ہٹ جانے کی بنا پر ہونے والے مسائل کے سلسلہ وار بیان سے لوگ محروم ہوجاتے ہیں ۔ اور شیاطین کی خواہش یہی ہوتی ہے ۔ کہ وہ کسی غیر عالمِ دین کے نفس کو جنبش دے ۔ اور اُسے عالمِ دین کی وعظ ونصیحت پر برانگیختہ کرے ۔ اور پوری مجلس کو عالمِ دین کی نصیحت سے محروم کردے ۔

اکثر اولیار اللہ نے فرمایا ۔ کہ جب علمار وعظ فرمارہے ہُوں ۔ یا اتفیا مصروفِ تکلم ہُوں تو آہستہ سلام دے کر بغیر کسی کھڑکھڑاہٹ کے خاموش ایک جانب بیٹھ جانا چاہئے ۔ سُننے والوں کو اپنی جگہ سے اُٹھانا نامناسب ہے ۔ اور جو لوگ مسائل سُن رہے ہُوں ۔ اُنہیں بھی کسی نوآمد کی وجہ سے خلل انداز نہیں ہونا چاہئے ۔

ہاں اگر علمار کی مجلس میں کوئی دوسرا عالمِ دین یا بزرگِ دین آ جائے اور علمار خود اُس کے ادب کے لئے اُٹھ رہے ہوں۔ تو سب کو اُن کی تقلید میں کھڑے ہونا لازم ہے۔

اگر کسی ضروری امر کے تحت مجلس سے اُٹھنا ضروری ہو۔ تو نہایت خاموشی سے اُٹھ کر چلے جانا چاہیئے۔ مگر بولنا نہیں چاہیئے۔ یہی طریقِ ادب متقی صوفیائے اُمّت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

اِس واسطے کہ متقی علمائے اُمت خاص لوگ ہوتے ہیں۔ اور متقی صوفیائے اُمت خاص الخواص ہوتے ہیں۔

چونکہ یہ لوگ دینی علوم پر عملِ صالح پاتے ہیں۔ اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ متقی ہو جاتے ہیں۔ اور بربنائے تقویٰ صاحبِ عرفانِ باللہ ہو جاتے ہیں۔

عام لوگوں کی دو آنکھیں ہیں۔ جو خدا نے پیدائشی طور پر اُن کے چہرہ پر پیدا کر دی ہیں۔ اور علمائے امت کی چار آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو جسمانی، دو علمی۔ وہ جہاں ظاہری دو آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہاں علمِ دین کی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں۔

صوفیار کی چھ آنکھیں ہوتی ہیں۔ جہاں وہ جسمانی و علمی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہاں صورتوں سے آگے معانی تک بھی بنظرِ عرفانِ باللہ کی رسائی رکھتے ہیں۔

عندالاسلام اولیار و علمار دونوں متقی ولی اللہ ہیں۔ دونوں کے سامنے جب حاضری نصیب ہو۔ تو دِل سے پاک و صاف ہو کر حاضری دینی چاہیئے۔ بعض دفعہ دِل کی بُرائیاں اُن لوگوں پر واضح ہو جاتی ہیں۔ اور وہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ بعض دفعہ انسانوں کو حیوان کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اور اُنہیں سخت ملال ہوتا ہے۔ کہ انسان ہو کر اِس درجہ ذلیل بنا کہ حیوان سے بھی کمتر ہو گیا۔

چونکہ یہ لوگ متقیانہ احوال کے ساتھ صاحبِ مکاشفہ ہوتے ہیں۔ اُن میں سے حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک واقعہ بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر ہے۔

کہ وہ علمار باطن میں سے ایک ولی اللہ تھے۔ آپ صاحبِ دین وعرفان تھے۔ آپ بوجہ تعمیلِ شریعت ماں کی خدمت میں اتنے مصروف رہے۔ کہ بوجہ دُوریٔ منزل حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھی بظاہر زیارت نہ فرما سکے۔

مگر باوجود اس کے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا مرتبہ بخشا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابۂ کرام کو وصیت فرما دی تھی۔ کہ بعد از وصال میرا جبہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچا دینا۔

چونکہ وہ اس جبہ کے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ مستحق ہیں۔

اللہ تعالےٰ تو علیمٌ بذات الصدور ہے۔

مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی آئینۂ نبوت کے ذریعہ اُن کے احوال سے خبر رکھتے تھے۔ تب ہی وصیت فرمائی۔ کہ میرا جبہ اُن تک پہنچانا۔

خاص کر خلیفۃ المومنین حضرت علی شیرِ خدا اور خلیفۃ المؤمنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو یہاں تک نصیحت فرمائی۔ کہ جب تم اُن سے ملو گے۔ تو اُنکے پہچاننے کے لئے چند علامات ہیں۔ جو یاد رکھنا۔

اُن کی شکل وصورت اور اُن کی سیرت بھی بتا دی۔ فرمایا۔ اُن کی بستی کے لوگ اُن کو حقیر جانتے ہیں۔ صورتاً بھی بظاہر وہ خوبصورت نہیں ہیں۔ فرمایا۔ اُن کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔

پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ وہ اونٹ کے بالوں کا بنا ہُوا ایک لمبا جبہ پہنتے ہیں۔

پھر فرمایا۔ اویس قرنی کے ایک کندھے پر برص کا سفید داغ بھی موجود ہے۔ فرمایا وہ بکریاں چرایا کرتے ہیں۔ اور زیادہ وقت اللہ تعالےٰ کی عبادت اور ماں کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

فرمایا اے علیؓ وعمرؓ تم دُونوں جب اُس سے ملو۔ تو اپنے لئے بخشش کی دعا لینا۔ جب حضرت علی وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حسبِ فرمانِ محبوبِ پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام بعد

از وصلِ پاک جبہ مبارک لے کر اُن تک پہنچے۔ تو اُن کو من وعن ویسا ہی پایا۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کے متعلق نشاندہی فرمائی تھی۔

جب یہ دونوں حضرات حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقی ہوئے۔ تو حضرت اویس قرنی رضؓ نے اُن کو اپنی ظاہری آنکھوں سے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر کمال ادب سے اِن حضرات کا خیر مقدم کیا۔

جب یہ تینوں حضرات باہم جلیس ہوئے۔ اور گفتگو کا آغاز ہوا۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے آپ کو سلام پیش کیا۔ پھر مفوضہ جبہ مبارک پیش کیا۔ آپ نے بہزار محبت وادب اُس جبۂ پاک کو وصول کیا۔ اُس کو چوما سر اور آنکھوں سے لگایا۔ اور پہن لیا۔

اس کے بعد تینوں میں کلامِ عارفانہ کا آغاز اللہ کے نام سے ہوا۔ زبانی تعارف ہوا۔ اور اَلْمُؤْمِن مِرْاۃُ الْمُؤْمِن کا عملی ترجمہ ہونا شروع ہوا۔ آپ نے استفسار اً استفہاماً عشقِ الٰہی اور عشقِ مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کے اظہار کے لئے پوچھا۔

کہ کیا آپ اصحابِ رسولِ کریم ہیں؟۔

دونوں حضرات نے جواباً فرمایا۔ بفضل اللہ۔ ہم اصحابِ رسولِ کریم ہیں۔ ہم نے زندگی کا بیشتر حصّہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ سفر وحضر میں۔ اور مختلف حالات وغزوات وغیرہ میں گذارا۔

حضرات خلفائے عظام سے غایت اظہارِ محبتِ مصطفےٰ علیہ الصّلوٰۃ و السلام کے لئے دوبارہ پوچھا۔ کہ آپ کے دہانِ مبارک میں آپ کے کتنے دانت موجود ہیں؟ دونوں حضرات نے اثبات فرمایا۔

ہاں ہمارے دانت ہمارے منہ میں سلامتی کے ساتھ موجود ہیں۔

اِس کے جواب میں حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک ومقدسہ جب میدانِ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ تو اُس کے بعد تقاضۂ محبت یہ تھا۔ کہ آپ کے دہانِ مبارک

ہیں آپ کے دندانِ مبارک بھی موجود نہ ہوتے ۔ اِن کو اُس محبوبِ کل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دندانِ پُرانوار پر قربان ہو جانا چاہیئے تھا۔

مگر میری حیرت کی کوئی حد نہیں ۔ کہ اُس محسنِ کُل کے اِس صدمۂ پاک میں آپ نے عملاً کیوں حصّہ نہ لیا ۔ جبکہ میں نے غائبانہ یہ معلوم کرکے اپنے منہ سے اِس خیال پر کہ خدا جانے دندانِ مبارک میں سے کونسا مبارک دانت یا کتنے دانت مبارک شہید ہُوئے ۔ سب کے سب دانت گرا دیئے ۔ پھر اپنا مُنہ مبارک کھول کر بتایا ۔ کہ میرے مُنہ میں ایک دانت بھی باقی نہیں ہے ۔

میں غائبانہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اتنا پیار و محبّت میں مبتلا ہُوں ۔ کہ مناسب نہ جانا کہ محبوب کے صدمہ کے بعد محب کے مُنہ میں دانت موجود ہُوں ۔

اِس پر دونوں حضراتِ خلفا نے اُن کی غائتِ محبت کی تصدیق فرمائی ۔ چند باتیں ہُوئیں ۔ مگر سب عشقِ خدا و رسول کا مظہر تھیں ۔

آخر میں اِن دونوں حضرات نے دعائے مغفرت کے لئے سوال کیا ۔ اور فرمایا اویس آپ ہماری مغفرت کے لئے دعا فرما دیں ۔

حضرت علی شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دعائے مغفرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی دعا چاہی کہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں اللہ تعالیٰ میری مدد کرے ۔

چنانچہ آپ نے دعائیہ کلمات کے ساتھ فرمایا ۔ کہ جنگِ صفین میں مجھے آپ کی اطاعت میں شریکِ جہاد ہونا ہو گا ۔ اور میں میدانِ صفین میں ہی درجۂ شہادت پاؤں گا ۔ اور میرا مدفن بھی وہیں ہو گا ۔

چنانچہ تاریخ ثابت کرتی ہے ۔ کہ جنگِ صفین میں آپ کی پیشگوئی من وعن صحیح ثابت ہُوئی ۔ اور آپ حضرت علی شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اطاعت میں لڑتے ہُوئے شہید ہُوئے ۔

اِس دعا کے بعد حضرتِ اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دعا کے لئے بحضور العالمین سجدہ ریز ہُوئے ۔

کچھ دیر کے بعد ان حضرات نے آواز دی۔ کہ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ آپ نے سر مبارک سجدہ سے اُٹھایا۔ اور یوں ہم کلام ہُوئے۔

اے حضرات خلفائے پاک حالتِ سجدہ میں میں نے نصف اُمتِ نبی پاک کی بخشش کی دعا اللہ کے حضور قبول کروالی تھی۔ اگر آپ حضرات جلدی نہ فرماتے۔ تو میں اُس وقت تک سجدہ سے سر نہ اُٹھاتا۔ جب تک ساری امتِ پاک کو نہ بخشوا لیتا۔

اولیاء اللہ کے مختلف تذکروں میں اویسِ قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک اور واقعہ اَلمُؤمن مِرْآۃُ المومِنِ کے ثبوت میں بیان کیا گیا ہے۔

کہ حضرت اویسِ قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یادِ الٰہی میں مختلف مقامات تک پہنچے۔ ایک مرتبہ آپ کی تلاش میں ایک شخص جس نے آپ کے مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کا چرچا سُنا تھا۔ آپ کی زیارت کے لئے اپنے گھر سے نکل پڑا۔ بڑی مشکل سے آپکو ماوراء النہر علاقوں میں ایک جگہ پالیا۔

یہ وہ شخص تھا۔ جس کی حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کبھی ملاقات نہ ہُوئی تھی۔ اور نہ ہی حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس کو دیکھا تھا۔ اُس شخص نے لوگوں سے پوچھ پوچھ کر ان کی راہ تلاش کی تھی۔

آخر کسی نے بتایا۔ کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فلاں نہر پر موجود ہیں۔ تو وہ اُس طرف بڑھا۔ اور قریب سے جا کر دیکھا۔ کہ ایک نہایت دُبلا پتلا کمزور انسان نہر کی جانب اپنا منہ کئے ہُوئے اپنی زلفِ مبارک میں کنگھی کر رہا ہے۔ اِس متلاشی نے قریب ہو کر آپ کی جانبِ پشت کھڑے ہو کر اس طرح سلام دیا۔ اسلام علیکم یا ولی اللہ۔ آپ نے بغیر پیچھے مُڑے سلام کا جواب اِس طرح مرحمت فرمایا۔ وعلیکم السلام یا عبداللہ۔

سلام دینے والے نے عرض کی حضرت آپ کو میرا نام کس طرح معلوم ہُوا؟۔

فرمایا تم نے حدیث نبیؐ پاک سے یہ نہیں پڑھا کہ المؤمن مرۃ المومن یہ کہ مؤمن مومن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر حدیث پر تیرا ایمان مضبوط ہے۔ تو پھر کسی مومن کو اس

آئینہ داری پر کیا شک ہو سکتا ہے۔

یہ سُن کر حضرت عبداللہ نے آپ سے عرض کی مجھے کچھ نصیحت فرمائی جائے۔ فرمایا۔ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو۔ اور جب سونے لگو۔ تو موت کو اپنے سرہانے رکھ کر سو جایا کرو خدا کو پا لوگے۔

حضرت عبداللہ واپس ہوئے۔ اور سوچنے لگے۔ موت کو کس طرح سرہانے ڈالا جا سکتا ہے۔

چنانچہ جب رات آگئی۔ تو آپ نے نمازِ عشا ادا کی۔ دعا و مناجات کے بعد بستر پر سونے کا ارادہ کیا۔ تو حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نصیحت یاد آئی۔ تو خیالاً اور ضمیراً اپنی موت کو اپنے سرہانے کے نیچے رکھنے کا تصور باندھا۔ جب اِس خیال میں مستغرق ہوئے۔ تو سارا وجود مارے خوف کے تھر تھرا اُٹھا۔ بستر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سوچنے لگے۔ کہ موت کو سرہانے رکھ کر بھی کوئی سو سکتا ہے؟ ساری رات اللہ تعالیٰ کی یاد میں گذار دی۔ اِس کے بعد جب بھی سونے کا ارادہ فرماتے۔ اِسی تصوّر سے وہ اپنی محبوب نیند کو ترک کر کے پھر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ حضرت عبداللہ نے صرف اتنی نصیحت پر ساری زندگی کروٹوں پر جاگ کر دِن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ اور ولیٔ کامل ہوئے۔

گیارھواں باب

مومن کے درجات

مومن عام ہو یا خاص۔ اُس میں ایمان کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ گناہ گار سے گناہ گار مومن بھی اُس ساری مخلوقات سے بہتر ہے۔ جو اسلامی ایمان سے محروم ہے۔

اِن سب عام وخاص مسلمانوں پر دوسرے مسلمانوں کی درجات کے لحاظ سے آئینہ داری ہوتی رہتی ہے۔

ہر مومن چھوٹے ایمان والا یا بڑے ایمان والا ہو۔ اُسے چاہیئے کہ اہلِ ایمان کی جب بھی مجلس کرے۔ تو پاکیزگیٔ قلب ونظر کے ساتھ کرے۔

اور یہ کہ اہلِ ایمان کی مجلس باوضو ہو۔ ورنہ ہر دِل وسوسۂ شیطانی میں ملوث ہو جائے گا۔ اور مجلس فضول ہو کر بے ہودگی کا شکار ہو جائے گی۔

اِس قسم کی فردی یا اجتماعی بے ہودگیاں ہمیشہ ناپاک قلب ونظر رکھنے اور بے وضو رہنے کی بنا پر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

حدیث کی رو سے عام مسلمانوں کے قلوب بھی بحالتِ ایمان ایک دوسرے کے روحانی ترجمان ہو کر ایک دوسرے کی آئینہ داری کر سکتے ہیں۔ تو پھر علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کی بصیرتِ عالمانہ اور بصیرتِ عارفانہ کا مرتبہ کتنا بلند ہو گا۔

اولیائے کرام نے فرمایا ہے۔

کہ ماں باپ۔ علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کی زیارت کے لئے باوضو

ہونا ضروری ہے۔ اور اُن کے سامنے باادب ہو کر حاضری دینی چاہیئے۔ اور اُن کی مجلس میں اپنے قلوب کو ہر قسم کے غیر دینی شبہات سے پاک کر کے نہایت عجز و نیاز کے ساتھ بغرضِ ہدایت بیٹھنا چاہیے۔ اور اُن کی بڑائی اور بزرگی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اُن کے مقابلہ میں اپنی کم مائیگیٔ علم و عمل کا احساس بھی کرنا چاہیئے۔

شریعت کی اطاعت میں یہ یقین رکھنا چاہیئے۔ کہ اِن حالات کی پابندی کرنے والے کا مقدر اگر بُرا بھی ہو گا۔ تو اس کی نیکیوں سے خدا کی رضا اُس کے شاملِ حال ہو کر شاید اُس کی تقدیر اچھائی کی طرف بدل دے۔ اور وہ فلاحِ دارین پا سکے۔ ایسا کرنے والا دین و دنیا میں بامراد ہو گا۔

ماں باپ کی اور متقی علماء و اصفیاء کی دعائیں بڑی پُر تاثیر ہوتی ہیں۔ اور اہلِ درد کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ یہ حدیث شریف ثبوت ہے۔

لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ =

یعنی قضا و قدر نہیں بدل سکتے۔ مگر دعا سے بدل جاتے ہیں۔

دعا ہر ایک کرتا ہے۔ مگر ہر ایک کی دعا پر ماں باپ علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کی دعاؤں کو اللہ تعالےٰ نے برتری بخشی ہے۔

چونکہ وسیلہ وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ جو بر سبیلِ حق پُر تاثیر اور زُود اثر ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ پابندِ اسلام علماء و صوفیاء شریعت کی اطاعت سے ہی تاثیراتِ نیک حاصل کرتے ہیں۔ جو بر حق ہیں۔

عنداللہ و عندالرسول سب سے بڑا وسیلہ کلمۂ طیبہ ہے۔ پھر کامل نماز و زکوٰۃ ہے۔ پھر صوم و حج ہے۔ یہ اسلام کے بنیادی مسائل ہیں۔

اِن وسائل کے بعد ہی ماں باپ، علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کے وسائل مقبول اور پُر تاثیر ہو سکتے ہیں۔ یہ تاثیرات اہلِ ایمان پر زُودِ اثر ہوتی ہیں۔

اہلِ ایمان ایسے برگزیدہ لوگوں سے استفادہ کر کے عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ذریعہ کمالِ

ایمان پاتے ہیں۔

گمراہی سے ہدایت کی طرف آنے کے لئے اولیٰ تر ہے۔ کہ علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کا تقرب حاصل کیا جائے۔ تاکہ اسلام کی طرف طبیعت مائل ہو کر پابندِ اسلام ہو جائے۔

تین قسم کے لوگ اپنے اپنے محل و درجہ کے لحاظ سے علماء و اصفیائے اسلام سے اپنے مراتب کے مطابق فیض پاکر راہِ ہدایت پاتے ہیں۔

ایک گروہ عامۃ المسلمین کا ہے۔ جو دو حصوں پر منقسم ہو جاتا ہے۔

ایک وہ مسلمان جو اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور ایک وہ مسلمان جو مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں۔ مگر پابندِ اسلام نہیں ہوتے۔

اول الذکر قبولیتِ تاثیر میں پہلا مقام رکھتے ہیں۔ ثانی الذکر کا دوسرا درجہ ہے۔

ان دو مسلمان طبقوں کے علاوہ ایک وہ گروہِ انسانیت ہے جو صفِ انسانیت میں تو شمار کیا جاتا ہے۔ مگر قبولیتِ اسلام سے انحراف و اعراض کی بناء پر غیر مسلم ہوتا ہے۔

یہ غیر اسلامی گروہ مختلف الخیال نافرمانِ حق ہو کر زندگانیوں کو خلافِ فطرت بنا لیتے ہیں۔ ایسے گروہ کو جو اسلام قبول ہی نہیں کر سکا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ جو مائلِ باسلام تو ہوتے ہیں۔ مگر پُرتاثیر دعوت کے نہ ملنے کی بناء پر محروم ہدایت رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جب بھی اسلامی تبلیغ پُرتاثیر قول و عمل کے ساتھ مل جائے۔ تو وہ اسلام کی ہدایت کو قبول کر لیتے ہیں۔

اس گروہ کی دوسری قسم یہ ہے۔ جو قلباً و ذہناً دعوتِ حق کی قبولیت سے گریز کرتی ہے۔ مگر متقی ولی اللہ کے اقوال و اعمال حسب منازلِ تقویٰ پر اللہ تعالےٰ کی دوستی حاصل کر لیتے ہیں۔ تو تائیدِ خداوندی اُن کی زبان و قلم اور علم و عمل میں وہ وہ خوارقات پیدا کر دیتی ہے۔ جس سے سخت ترین سینے بھی پگھل کر موم ہو جاتے ہیں۔

جب متقی علماء و اصفیاء اس مقام کو پا لیتے ہیں۔ تو اُن کی حرکات و سکنات اُن کے قول و عمل کراماتِ اسلامیہ بن جاتے ہیں۔

ایسے کاہل لوگ اُن لوگوں کو جو ابھی دعوتِ اسلام قبول نہیں کر سکے اُن کو دعوتِ اسلام دینے میں بالکرامت کامیابی پا لیتے ہیں۔

اسلام ایسے ہی کریم العادات لوگوں کے ذریعہ اکنافِ عالم تک پہنچا۔ اور آئندہ بھی ایسی ہی متقیانہ تبلیغ کے ساتھ علماء و اصفیاء دینِ اسلام کو انسانیت تک پہنچانے اور قبول کرانے میں کامیابی پا سکیں گے۔

تینوں گروہوں میں اول الذکر پابندِ اسلام مسلمانوں کے گروہ کو ایزادِ عمل کے لئے علماء و اصفیاء کی مجلس کرنی ضروری ہے۔ تاکہ اُنہیں مزید استقامت ملے۔ اور ثانی الذکر مسلمانوں کے لئے پابندِ اسلام نہ ہونے کی بناء پر نیک تاثیرات لینے کے لئے علماء و اصفیاء کا تقرب حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ تاکہ اُن کی اصلاح ہو سکے اور ثالث الذکر غیر مسلمین تک اُن کی تاثیرات، اُن کی حکمت و موعظتِ اسلامیہ اور اُن کے صالح معاشرہ کے ذریعہ پہنچ جاتی ہے۔

متقی صالحین کے ذریعہ ہی تبلیغِ دین حکمت و موعظت اور خوارقات کے ساتھ انسانیت کو اسلام کی طرف بلانے میں کامیابی پا سکتی ہے۔

یہ طرزِ تبلیغ انبیاء سے علمائے امت میں منتقل ہو کر علمی و عملی تبلیغ بنتی ہے۔ انبیا کی تعلیمات علماء کے ذریعہ انسانیت تک پہنچتی ہیں۔

حدیث شریف ۔ العلماءُ ورثۃُ الانبیاء۔

ترجمہ۔ میری امت کے علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

علمائے امت ورثۃ الانبیاء ہونے کے اِس واسطے حقدار ہیں۔ کہ وہ علمِ دین کے فاضل ہونے کی بناء پر اللہ سے زیادہ ڈرنے والے ہوتے ہیں۔

دوسرا انبیاء کی وراثت کے لئے تین بنیادی شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ جو متقی علماء کے سوا کسی دوسرے گروہ میں نہیں پائے جاتے۔

انبیاء کے مانند ہونے کی مثل ذاتی نہیں۔ بلکہ اتباعی ہے۔ یعنی وہ آخری دین کے بعد کوئی دوسرا دین نہیں لا سکتے۔ اور نہ ہی اُس دین کے سوا تبلیغ کے لئے کوئی دوسری شریعت

لا سکتے ہیں۔ اور نہ ہی صاحبِ معجزات ہو سکتے ہیں۔

البتہ کتاب وسنت آخری الہامی فیصلہ ہونے کے بعد علماء کا اعتقادی مذہب ہوتا ہے اور اُسی کے مطابق اُن کی تبلیغ ہوتی ہے۔

مگر معجزات کے اختتام کے بعد کراماتِ علمائے اسلام کا سِلسلہ تا ابد باقی رہے گا۔

نبوت کے بنیادی ارکان تین ہیں۔

یہی تین ارکان مدارِ نبوت ہیں۔ ایک رکن بھی کم ہو۔ تو نبوت کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ تمام انبیاء اِن تینوں صفات کا مجموعہ تھے۔ اور یہ تینوں چیزیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کے ساتھ تا ابد ختم کر دی گئی ہیں۔ ایک اخبارات بالوحی کا سِلسلہ ختم ہو گیا۔ اور معجزات کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ مگر تبلیغِ دین علیٰ منہاج نبوت وشریعت تا حدِ قیامت جاری رہے گی

فلہٰذا انبیاء کے وارث وہی علماء ہو سکتے ہیں۔ جو کتاب وسنت کو تمام ادیان سمجھ کر اُس پر عملی پیروی کریں۔ اور اُسی کو ذریعہ تبلیغ بنائیں۔ جو عالمِ دین کتاب وسنت کی روشنی میں متقی ہو گا۔ اور اُسی کے مطابق اپنے احوال واقوال وافعال کو ترتیب دے گا۔ وہ ولی اللہ ہو گا۔ اور ولی اللہ سے کرامات کی صورت میں خوارقات کا سرزد ہونا شریعت سے ثابت ہے۔

اِس واسطے ایسے ہی باکرامت علمائے امت کی تبلیغ ملتِ اسلامیہ کو اجتماعی تنظیم دے سکتی ہے۔ اور خوارقاتِ متقیانہ کے ساتھ اپنوں اور پرائیوں کو اسلام کی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔

یہ اسلام کے اعمال کے نتیجہ میں نورانی اور برہانی تبلیغ کہلاتی ہے۔ جو سلف صالحین کی تاریخ سے ثابت ہے۔

تمام اصحابِ رسولِ کریم اولیاء اللہ تھے۔ اُن کا علم وعمل اُنہیں متقی بناتا تھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغ نے صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کو علم و عمل بخشا۔ جس سے وہ اولیاء اللہ بنے۔ پھر تابعین و تبع تابعین میں وہ علم وعمل منتقل ہوا

جس نے اُن کو اولیاء اللہ بنایا۔

یہ تینوں گروہ علمائے وقت کی رہبری میں اسلامی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اور ورثۃ الانبیاء کے مفہوم کو علماً وعملاً پورا کیا۔

مابعد کے علماء تا ابد اسی علمی وعملی روشنی میں ورثۃ الانبیاء ہوں گے۔ اور اُن کے علم وعمل کرامات کے حامل ہوں گے۔ جن سے دین پھیلتا رہے گا۔ اور سخت قسم کے منکرینِ اسلام بھی اُن سے متاثر ہو کر دعوتِ اسلام قبول کرتے رہیں گے۔

اُمت کے علماء میں سب سے آخری عالمِ دین جو ورثۃ الانبیاء ہو کر علماً وعملاً اتباعِ اسلام کا نمونہ پیش کریں گے۔ وہ مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوں گے۔ جو علم وعمل میں سب سے بڑے متقی ولی اللہ ہوں گے۔ اور صاحبِ خوارقات ہوں گے۔

اُس زمانہ میں اِستدراج بھی اپنے آخری عروج پر ہوگا۔ جس کو وہ کراماتِ متقیانہ سے باطل کر دیں گے۔

اِس طریقِ عمل کی پیروی کو اصطلاحِ اسلام میں اتباعِ رسول کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی باکرامت تبلیغ سے اکثر غیر مسلمین بھی اہل الذکر علماء وصوفیاء کی قولی وعملی تبلیغ دین سے متاثر ہو کر مائل بہ اسلام ہوتے ہیں۔

اِس طرح اسلام بنی نوعِ انسان تک پھیلاؤ حاصل کرتا ہے۔ جس کا زندہ ثبوت تاریخ اسلام کی صورت میں موجود ہے۔

قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک جس شعبۂ زندگی میں کسی مسلمان فرد نے اسلامی شہرت پائی۔ یقیناً وہ عالمِ دین تھا یا علماء کا مقرب تھا۔

علمائے امت نے مختلف شعبہ جات میں اسلامی خدمات انجام دیں۔

میدانِ رزم وبزم دونوں میں اعلیٰ عملِ صالح کا نمونہ پیش کیا۔

تجارت، صنعت وحرفت میں مختلف علوم وفنون کے ساتھ خدماتِ دین سرانجام دیں۔ خود سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالےٰ نے علم الاولین والآخرین کا حامل فرمایا۔

آپ نے بذاتِ خود ہر شعبۂ اسلام میں خدمات انجام دیں۔ آپ نے وہ جملہ فرائض انجام دیئے۔ جو عبادات و معاملات سے یا اسلامی معاشرت اور اخلاق سے متعلق تھے۔

آپ کے گھرانے کے جملہ نورانی افراد ذکور و اُناث نے آپ کے نقشِ قدم پر چل کر اسلامی بنیادی عقائد سے متعلق ہوکر اور عقائد کے علوم کی فضیلت کے ساتھ علم العبادات اور علم المعاملات، علم المعاشرتِ اسلامیہ اور علم الاخلاقیاتِ اسلامیہ کی فضیلتِ اسلامیہ کے ساتھ عملاً تقویٰ حاصل کیا اور ولی اللہ ہوکر کالانبیار ہوئے۔ اور یہ ورثۃ الانبیار کا علمی و عملی ثبوت ہے۔

یہاں تک کہ دینِ اسلام کی حفاظت و بقا کے لئے یہ سارا گھرانہ راہِ حق میں قربان ہُوا۔ اور فَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کی تکمیل فرمائی۔

خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نے فضیلتِ علوم دینیہ کے ساتھ اسلام کی عملی تفسیر فرمائی۔ اور ورثۃ الانبیار کا علماً و عملاً ثبوت بنے۔ اور مقرب اولیار اللہ ہوئے۔

ترتیب سے تابعین و تبع تابعین نے علمِ دین کی فضیلت کے ساتھ تقویٰ اختیار کیا۔ اور ورثۃ الانبیار ہونے کا باحولائت ثبوت پیش کیا۔

خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ۔

کا تاریخی مرتبہ حاصل کیا۔ اس کے بعد اس زمانہ تک جتنے معروف اولیارِ اُمت ہو گذرے سب کے سب علمائے اُمت تھے۔

ان کے احوال و اقوال و افعال سب عندالاسلام کرامت تھے۔

اگر انہوں نے تبلیغِ دین کے فرائض تحریر و تقریر سے سرانجام دیئے۔ یا میدانِ رزم میں جہاد کے ساتھ انجام دیئے۔ یا بزم میں حکمت و موعظت کے ساتھ انجام دیئے۔ یا ریاضت کے ساتھ عبادات و معاملات کو انجام دیا۔

جس جس طرح بھی علمائے امت نے بربنائے تقویٰ خدمات انجام دیئے۔ وہ

سب کراماتِ اسلامیہ کا ایک زندہ باب ہے۔ اور اِس باب کی تکمیل مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کریں گے۔

تا ابد یہ سِلسلۂ کرامات جاری رہے گا۔

جب کوئی بھی ولی اللہ نہیں رہے گا۔ تو قیامت بپا ہو جائے گی۔

بارھواں باب

شاھکارِ زیست کا

نکتۂ پُرکار

تبلیغِ اسلام نے صرف ایک ہی آخری ہستی کی قولی، احوالی اور عملی تبلیغ سے اپنا آغاز کیا۔ وہ ہستیٔ پاک سلطانِ دوعالم فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔

جس ہستیٔ پاک کو اللہ تعالےٰ نے نیکیوں کے لئے حتمی ہادیانہ صفات دیکر پوری انسانیت کی طرف بغرضِ ہدایت مبعوث فرمایا۔ اور بعثت کے لئے جن حتمی لوازمات کی ضرورت تھی۔ وہ پیدائشی طور پر آپ کو تفویض کر دیئے گئے۔

آپ مرقعۂ ہدایت بن کر پیدا ہوئے۔ اور اُس مظہرِ ہدایت جسم وجان کو چالیس سال تک خود خالقِ فطرت نے اپنی مرضیات کے مطابق تربیت کے لئے مقبول ومحبوب اور طاہر ومطہر راہیں اور وسائل، اسباب وذرائع عطا فرمائے۔

آپ کی تاریخِ پیدائش ایک ایسے عظیم المرتبت خاندان سے سفرِ حیات جاری کرتی ہے جس کا تعلق مذہبیات سے رہا۔ اور ہمیشہ سیادت وقیادت بھی اس خاندان کے ہمرکاب رہی۔ اِس خاندان کا تعلق نسباً انبیائے سابقین سے متعلق تھا۔ اِس خاندان کی گھٹی میں نیک نامی کے کارنامے نسلاً بعد نسلاً سلسلہ وار چلے آرہے تھے

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ حضرت عبدالمطلب کے محبوب ترین بیٹے تھے۔ ماں

حضرت آمنہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا تھیں۔ جن کی نیک نامی ضرب المثل ہے۔

اللہ تعالےٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فطری ہدایت پر پیدا فرمایا۔ اور دنیا میں سب سے اعلیٰ حسب ونسب والے خاندان میں پیدا فرمایا۔

یہ خاندان تربیت گہہ عالم کی وہ پہلی دہلیز ہے۔ جس کو آخری محسنِ انسانیت کیلئے منتخب فرمایا گیا۔ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ پاک ہوئی۔

اصلاب وارحام کے بعد عالم اسباب میں آپ کی پیدائش پر آپ کو جو اولین وسائل عطا فرمائے۔ وہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی گود مبارک اور خاندان کے پاک باز لوگوں کی آواز تھی جو آپ کے گوش گذار ہوئی۔

جب آپ نے پہلی مرتبہ اپنی چشم مبارک کھولی تو نیک اور پاک ماحول دیکھا۔ آپ نے اپنے خاندان کے خوش نما خوش خصال، خوش اخلاق، خوش گفتار، خوش کردار اور متبسم چہروں اور خوش نما پیشانیوں کو دیکھا۔

آپ نے اپنی پہلی معصومیت کے ساتھ اِس دنیا میں پہلے ورودِ مسعود پر جو پہلا ماحول پایا۔ آفرینش سے ابدالآباد تک ایسا خوش خصال ماحول سوائے آپ کے کسی اور کا مقدر نہیں بن سکا۔

پھر خاندانی ماحول کا دانشِ کاملہ کے ساتھ تربیتِ مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے فیصلہ کرنا اِس فیصلہ کی ترتیب و آغاز۔ فیصلہ کا ظہور اور فیصلہ کا صدور۔ پھر تربیتِ ثانیہ کے لئے دوسرے ماحول کا انتخاب جو حضرت مائی حلیمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے نصیب میں آیا۔

پھر ایامِ طفولیت کی منزلوں میں پاک سے پاک تربیت گاہوں کا بار بار نامساعد حالات میں قدرتی طور پر پاک وصاف ہو کر سامنے آنا اس بات کی بین دلیل ہے۔ کہ آپ فطری طور پر ہدایت یافتہ تھے۔ اور خالقِ فطرت نے سب خلائق سے زیادہ آپ کی تربیت کی طرف توجہ دی۔

آپ کی پوری تاریخ پر صحت مندانہ غور کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سارے نظام

کائنات میں اللہ کی نگاہِ پاک میں آپ کی ذاتِ اقدس خدائے لم یزل کا وہ نقطۂ نظر تھا۔ جس کو تخلیقِ عالمین کے لئے نقطۂ پرکار کہنا بجا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے آپ کو ازل تا ابد پاک کر دیا۔ آپ کو مکہ معظمہ جیسی دور دراز الگ تھلگ جگہ میں پیدا فرمایا۔

اور ریگزاروں کو آپ کے لئے ولادت گاہ بنایا۔ عظمت و برکت کے لحاظ سے کائنات کے سب گھروں سے زیادہ عظمت والے گھر میں پیدا فرمایا۔ ارض کعبہ، جبالِ کعبہ، سمائِ کعبہ آب و ہوائے کعبہ، دیوارِ کعبہ، ظہور و بطونِ کعبہ، فرشگانِ کعبہ اور خود خدائے کعبہ نے آپ کی پیدائش کی گواہی دی۔

ارض و سما اور ساری خلائق نے تبریک و تحسین کے ساتھ خوشیاں منائیں۔ اپنے اور بے گانے قدرتی طور پر خرّم اور شاد کام ہوئے۔ حوروں، غلمانوں اور کروبیوں نے سلام کیا۔ اللہ تعالےٰ کی ذات خوش ہوئی۔ کہ اُس نے اپنی مخلوقات کے شاہکار کو تخلیق فرمادیا۔

بعثتِ نبوت تک آپ کی تربیت میں خدا اور اُس کے خاموش و پاکباز لشکر خفی و جلی انداز میں مصروفِ تربیت رہے۔ آپ کی بعثت کا منشار تبلیغِ دین تھا۔ اور خدا کے سامنے پوری انسانیت کو سَربسجود کرنا تھا۔

چالیس سال کی عمرِ پاک میں آپ کو اللہ نے ختم نبوت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اور آپ پر آخری پیغامات قرآن و حدیث کی صورت میں نازل کرنے شروع کر دیئے۔

تئیس سال میں دینِ پاک مکمل ہوا۔ اور انجامِ کار آپ کے ذریعہ آئینِ فطرت مکمل ہو کر انسانیت کے ہاتھوں میں دیدیا گیا۔

اور پروردگارِ عالم نے آپ کے پُرخلوص عمل پر دینِ اسلام کی تنفیدی خدمات پر آپ کی عبادات، آپ کے معاملات، آپ کی زندہ جاوید معاشرت، آپ کی کامل و اکمل اخلاقیات سے راضی ہو کر فرمایا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ

دیگا۔

یعنی آج کے دن میں نے آپ کے دین کو مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمتوں کو آپ پر پورا کر دیا۔ اور آپ کے دینِ اسلام سے مکمل طور پر راضی ہو گیا۔

اللہ تعالےٰ کی اِس آخری بشارت میں جو اپنے محبوبِ پاک کے لئے ارشاد فرمائی:۔ اِس میں کمالِ دین، اتمامِ نعمت، کمالِ رضا بالاسلام۔ تین چیزوں کے ساتھ اپنے نبی کے لئے اتمامِ حجت فرمادیا۔

گویا کہ اب ہمیشہ کے لئے نوعِ انسانیت پر اپنی حجتِ کاملہ بذریعہ ختم نبوت دلائل دبراہین کے ساتھ پوری کردی۔

انسانی تمناؤں کے مطابق اِس آئینِ فطرت کے ساتھ بنی نوع انسان کو پھلنے پھولنے اور زندگی کے معراجِ کمال تک پہنچنے کا صحیح لائحۂ عمل پیش کر دیا۔ اور عقیدۂ توحید اور عقیدۂ ختمِ رسالت اور عقیدۂ کتاب وسنت اور عقیدۂ یومِ آخرت کو صراطِ مستقیم فرمادیا۔

انبیاء وصدیقین، شہداء وصالحین کے منعم من اللہ ہونے کا اِسی دین کو مثالی ذریعہ بنادیا۔

اللہ تعالےٰ نے سیدالانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہدایت کی اس بلندی پر فائز المرام فرمایا۔ جس کی بلندی سے اُن کی نگاہِ پاک اولین وآخرین تک کا بالمشاہدہ جائزہ لے سکے۔ آپ کی ذات کو اسی وجہ سے اولین وآخرین کا شاہد فرمایا گیا۔

ان ختمی صفات کی بدولت یومِ میثاق پر جملہ انبیاء سے آپ کی ختمِ رسالت اور آپ کی تائید پر اقرار لیا گیا۔

اِس دنیا میں انبیائے سابقین کو آپ کی خاطر راہِ ہدایت ہموار کرنے کے لئے آپ سے پہلے بھیجا گیا تھا۔ تاکہ آخری پیغمبر کے لئے انسانی اذہان کو پہلے سے ہی بعثت کے لئے تیار کریں۔ تاکہ انسانیت آخری آنے والے کی بعثت سے اجنبی نہ رہے۔ اور استقبال کے لئے تیار رہے۔

تمام انبیائے کرام نے اِس دنیا میں آپ کا استقبال کیا۔

آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آپ سے پہلے اس واسطے مبعوث کیا گیا۔ تاکہ وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کے اذہان کو لفظِ بعثت سے مانوس کر دیں۔

چنانچہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک سب نبیوں نے بعد از وصال اپنی قبور سے بالاجتماع اُس وقت آپ کا استقبال کیا۔ جب خدائے لم یزل کی دعوت پر آپ اپنے معراج کی تکمیل کے لئے عرشِ عظیم کی طرف جا رہے تھے۔

سفرِ معراج میں انبیاء کی ملاقات کا نکتہ یہ ہے۔ کہ بڑے لوگ ہمیشہ بڑے کارناموں پر ہی سامنے آتے ہیں۔

چونکہ ختمِ نبوت کے ساتھ معراج کمالاتِ نبوت کا اظہار تھا۔ ایسے موقع پر تمام انبیاء و مرسلین اللہ کے حکم کے ساتھ اپنی اپنی قبور سے بجسمہٖ اُٹھائے گئے۔ اور اُن سے عہدِ میثاق پورا کرانے کے لئے بیت المقدس میں بر سبیلِ راہِ معراج آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے استقبال و تائید کے لئے جمع فرمایا۔

تمام انبیاء نے آپ کی اقتدار میں نماز ادا کی۔ اور آپ کے مطیع و منقاد ہوئے۔ اور خدا کے ساتھ یوم میثاق میں جو مواعید کئے تھے۔ اُن کو عملاً پورا کیا۔

منازلِ معراج میں انبیائے کرام نے آسمانوں پر بھی آپ کا استقبال کیا۔ پھر اللہ تعالےٰ کی ذاتِ پاک نے بھی اپنی کمال رحمت و محبت سے آپ کا استقبال فرمایا۔ اور محب و محبوب کی ملاقات ہوئی۔

معراج کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تبلیغِ اسلام کو بھی مزید وسعت دی گئی۔ اور انسانیت کی فلاح و نجات کے لئے مزید راستے ہموار ہوئے۔

معراج سے واپسی کے بعد آپ کی تبلیغ کا سلسلہ پہلے سے کہیں زیادہ منظم اور زور دار ہو کر سامنے آیا۔ آپ نے تکمیلِ معراج کے بعد یہ نہیں فرمایا۔ کہ اب میرے لئے تبلیغِ دین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

بلکہ مزید شکرانۂ خداوند ذوالجلال کے ساتھ تکمیلِ عمل کے لئے عبادات و معاملات معاشرت اور اخلاقِ اسلامیہ کے لئے اپنی امت کو زیادہ عمل پیہم کے ساتھ اعمالِ اسلامیہ کو تیز کرنے کا حکم فرمایا۔

قرآنِ مجید نے آپ کے ازلی و ابدی ہدایت یافتہ ہونے پر آپ کی پیدائش اور ترسیل کو اس واضح انداز میں بیان فرمایا۔ جس سے صاف طور پر وضاحت ہو جاتی ہے۔ کہ آپ کی ذات نزولِ دین سے پہلے دینی تربیت کے ساتھ پیدا فرمائی گئی۔ اور بعثتِ نبوت سے قبل بھی آپ کی روح و جسم دونوں دین پر عمل پیرا تھے۔ اور آپ کو دین سکھا کر بھیجا گیا ہے۔

پھر بعدہٗ بوقتِ بعثت دین کو سند کے طور پر بھیجا گیا۔ دین نے بزبانِ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اعتبار حاصل کیا۔ اور دین نے ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعوائے نبوت کی تصدیق کی۔ دینِ اسلام آپ کے نظریۂ توحید اور آپ کے اخبار بالغیب کی تصدیق میں ایک کھلی گواہی بن کر آیا۔ آپ کی تبلیغ کا مظہر بھی دینِ اسلام ہوا۔

گویا دین ایک طرف آئینِ فطرت بھی ہے۔ اور ایک طرف تاریخِ رسالت بھی ہے۔ اور ایک طرف ابدالآباد تک بحفاظتِ تمام ذریعۂ ہدایت بھی ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پیدائش و ترسیل پر اور اپنے دینِ حق ہونے پر جس اسلوبِ بیان سے ترجمانی کی ہے۔ وہ ہماری ذہنی مشکلات اور ذہنی سوالات کا صحیح حل بن جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔

هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا۔

ترجمہ۔ اللہ وہ ذات ہے۔ جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت یافتہ بنا کر بھیجا۔ اور دینِ برحق کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ ادیانِ عالم پر اُس کی سچائی واضح ہو سکے۔ اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی و وافی ہے۔

یہ آیات چار حصوں پر مشتمل ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالٰے نے اپنے رسولِ پاک کو پیدائشی طور پر ہدایت یافتہ بنا کر پیدا فرمایا۔

چونکہ لفظِ اَرسَلَ کے معنی بھیجا کے آتے ہیں۔ اور یہ بھیجنا آپ کی ذاتی تخلیقی حنفی ولادت سے لے بعثتِ نبوت اور بظاہر اِس دنیا سے وصال مُبارک تک ہے۔

اگر آپ کی بعثت سے آپ کی پیدائش کا تعلق نہ ہو۔ تو بعثت کا ذریعہ معدوم العمل ہو جاتا ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ذریعۂ بعثت ذاتِ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو بعثت کی مصداقِ صحیح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی اللہ تعالٰے نے اپنے رسول کو ازلی وابدی ہدایت کے ساتھ آراستہ کر کے بھیجا۔

گویا آپ کی ذات دینِ مبین کی کتاب ناطق تھی۔ اور دینِ مبین کتاب صامت کی صورت میں آپ پر نازل ہُوا۔

اِس کتابِ صامت میں زبانِ وحی اور نطقِ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے۔ زبانِ وحی نے سرورِ کائنات کے سامنے اور سرورِ کائنات نے بنی نوع انسان کے سامنے کتاب اللہ کو پڑھا اور ترجمانی فرمائی۔

وَدِینِ الحَقِّ آیات کا یہ ٹکڑہ مضمون کا دوسرا متواصل حصّہ جس کو رسالت کے ضِمن میں بیان فرمایا گیا۔ یعنی رسولِ پاک کو بھیجا اور اُن کے بھیجنے کے سبب باعتبارِ نبوت دینِ حق کو اُن کے ذریعہ بھیجا۔

ہر آسمانی دین ہمیشہ باعتبارِ نبوت ہی پیش کیا گیا۔ نہ کہ باعتبارِ دین۔ چونکہ دین تو اللہ ورسول کے اعتبار پر مرتب ہوتا ہے۔

اللہ کے رسول پہلے دعوائے رسالت ونبوت کرتے ہیں۔ اور اپنے دعوے کے ساتھ دلیل کے طور پر اللہ کے بنائے ہُوئے دین کو سامنے لاتے ہیں۔

ہر آسمانی دین اخبارِ بالغیب پر مرتب ہوتا ہے۔ انبیائے کرام اللہ کی طرف سے مخبرینِ صادقین ہوتے ہیں۔ اور وہ خبریں جو انبیار ورسل سے صادر ہوتی ہیں۔ وہی

دین بنتی ہیں۔

انبیاء کی اخبار بالغیب پر دین کا مضمون مکمل ہوتا ہے۔ ہر نبی نے اپنے زمانہ کے مطابق جزوی طور پر اپنا دین مکمل کیا۔

اِن آیات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش بعثت اور دینِ اسلام کا ذکر ہے۔ اور اظہارِ غلبہ دین کا ذکر ہے۔

چوتھا اللہ کی گواہی ختمِ رسالت کے لئے کفائیت بنتی ہے۔ پہلے ارسالِ رسول کا ذکر آیا۔ ثانیاً دینِ حق، ثالثاً اظہارِ دین کا ذکر ترتیب سے پہلے بیان ہُوا۔

اول کو ثانی پر درجہ دیا اور ثانی یعنی دین کو اول کے ساتھ منتبر کر دیا گیا۔ ایک سببِ دین ہے۔ جس سے دین صادر ہو کر قول وفعل وحال کا جامہ پہن لیتا ہے۔

اگر دین قول وعمل ہی نہ بن سکے اور اُس کا عملی ظہور ہی نہ ہو سکے۔ تو وہ محض کتاب صامت کی صورت رہ جائے۔

حضور علیہ الصلوٰہ والسلام نے ختمِ نبوت کو اپنی ذاتی مرسلانہ صلاحیتوں کے ساتھ اور دینِ اسلام کے ساتھ جامۂ تکمیل پہنایا۔ اسی ہیئت مجموعیہ نبویہ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی صالح جماعت کی تشکیل کی۔

اگرچہ صحابہ نبی نہ تھے۔ مگر وہ محسنِ اعظم محبوبِ رب العالمین کے ایسے تربیت یافتہ اور جاں نثار و فرمانبردار تھے۔ جنہوں نے قبولیتِ توحید ورسالت کے بعد دینِ اسلام کو قبول کیا اور اللہ ورسول دونوں کی خوشنودی کا ذریعہ دینِ اسلام کو قرار دیتے ہُوئے اُس پر اپنے اعمال کی تعمیر کی۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے دین کی کِسی چھوٹی بڑی چیز تک کو بھی اپنے قیاس ظنی پر تعبیر نہیں کیا۔

بلکہ دین کے جزو کل کو ہادیٔ مطلق کی طرف سے بھیجے ہُوئے ہادیٔ آخرالزمان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف سے قبول کیا۔ اور اُس کی عملی پیروی سے ثابت کر دیا۔ کہ خدا کے نبی برحق ہیں۔ خدا کا پیغام بصورتِ دینِ حق ہے۔ اور اسی میں انسانیت کی فلاح ونجات ہے۔

اسی طرزِ عمل سے صحابہ کی جماعت نے اپنے زمانہ کے ساتھ خیر القرون کا مرتبہ پایا۔ یہ دستورِ تبلیغ تمام انبیاء کی تبلیغ کا نچوڑ بن کر بصورتِ نبی آخر الزمان اور تعمیل صحابہ کرام کی صورت میں اندازِ تبلیغ بنا۔ جس سے انسانیت نے استفادہ کیا۔

صحابۂ کرام کی اِس تسلیم و رضا سے تابعین متاثر ہوئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابہ کرام کے لئے جو بشارت فرمائی۔ وہ راہِ اسلام میں صورتِ تبلیغ کی ترجمانی ہے کہ صحابہ تعمیلِ احکامات ربانی میں اِس قدر فرمانبردار تھے۔ کہ متاعِ زیست تک کو بھی قربان کر دینے سے گریز نہ کیا۔

اِسی واسطے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابہ کے متعلق وہ درجہ متعین فرمایا۔ جو مابعد ابد الآباد تک کسی دوسرے کو نہیں مِل سکتا۔

آپ نے فرمایا۔

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّہِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ۔

ترجمہ۔ میرے اصحابِ پاک میرے آسمانِ نبوت کے درخشندہ ستارے ہیں۔ تم میں سے جو بھی اُن کی اقتدار کرے گا وہی ہدایت پائے گا۔

پھر فرمایا۔

خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ۔

سب زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ یہ نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کی طرف ہے۔

ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ۔ پھر صحابہ کے ساتھ ملحق دوسرا زمانہ ہے۔ یہ نسبت تابعین کی طرف ہے۔

ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ یہ تیسری نسبت تیسرے ملحق زمانہ کے لئے ہے۔ جس کی نسبت تبع تابعین کی طرف ہے۔

یہ تین زمانے بفرمانِ مصطفٰے علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ابتداءِ آفرینش سے ابد الآباد تک جملہ زمانوں پر باعتبارِ الحاق ختم المرسلین افضل القرون ہیں۔ اِن زمانوں کے افضل القرون ہونے

کی وجہ ادنیٰ قربت والحاقِ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔

وجہ دوم میدانِ تسلیم ورضا میں پروردگارِ عالمین کے بھیجے ہوئے دین کے احکامات کی تعمیل میں عقائد کی مضبوطی، عبادات کی تکمیل، حسنِ معاشرت، اور حسنِ اخلاقِ اسلامیہ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی بندگی۔ اور اُس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں سرفروشانہ استقامت تھی۔

سوم اُن ہی خطوط پر تبلیغِ دین کے فرائض کی انجام دہی۔ جس پر اللہ کے رسول نے نفاذِ دین فرمایا تھا۔

اُسی حکمت وموعظمت کو اُنھوں نے ذریعہ تبلیغ بنایا۔ جس کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذریعہ رشد وہدایت بنایا تھا۔

فَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۔ کا صحیح نقشہ پیش کرنے کے بعد اُن کے زمانہ نے باعتبارِ تقویٰ تمام زمانوں پر تفوق وبرتری حاصل کرلی۔

یہ زمانے اسلامی کارناموں پر مرتب ہوئے۔ ورنہ زمانہ تو کوئی بھی زمانہ کہلاسکتا ہے۔ تمام انبیاء بھی اپنے وقت میں صاحبِ زمانہ تھے۔ اِن کے زمانوں کو بھی اپنے زمانوں پر فضیلت تھی۔

مگر حتمی المرتبت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم چونکہ آخرالزمان تھے۔ اور بعد الانبیاء تھے۔ اِس واسطے آپ کا زمانہ سید القرون ہوا۔ اور اِسی سیادتِ کُل کی بناء پر آپ کا دین سید الادیان ہوا۔ اور آپ کی امت سید الامم ہوئی۔

اور بفرمانِ مصطفٰے علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۔ کے مطابق علمائے امت سید الشیوخ ہوئے۔

اِس حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ میری امت کے علماء انبیائے بنی اسرائیل کے مثل ہوں گے۔ یہ مرتبہ کسی نبی کی امت کو یا اُن کے علماء کو یا اُن کے دین کو نہیں مِلا۔

تبلیغِ دین اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ پر تعبیر ہوکر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر

ضوفشاں ہُوئی۔ اُنہوں نے اُسی خُلقِ عظیم کو اپنا رہنما بنایا۔ جس سے شش جہات عالم میں دینِ اسلام خلقِ عظیم کا مظہر بن کر ظاہر ہُوا۔

قرآنِ مجید کا یہ فرمان۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔

یعنی تم اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف لوگوں کو حکمتِ بالغہ اسلامیہ کے ساتھ اور موعظتِ الحسنہ یعنی میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ دعوت دو۔

جب ظلم کی حد تک لوگ پہنچ جائیں۔ اور خدا کی مخلوقات پر ظلم و عدوان بن کر موجبِ تکلیف اور اہلِ حق کے لئے مہلک صورت اختیار کرلیں۔ تو مدافعانہ صورت اختیار کرلو۔ تاکہ تمہاری جنگ بھی اخلاقی نوعیت اختیار کرلے۔ اور باطل کو راہِ راست پر لانے کے لئے حق کے ساتھ اُٹھ کر حق میں دوام وقیام دو۔

اِس جدال کو عدل وانصاف کے ساتھ رشد و ہدایت کے لئے سخت اضطرار میں لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اسلام میں یہ جدال بر سبیلِ حق تبلیغِ دین بن جاتا ہے۔

مذہبِ اسلام میں مسلمان کی زندگی ولادت سے لے کر جملہ اعمال کی انجام دہی تک [illegible] دین کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ اُس کی موت بھی تبلیغِ دین کے ساتھ ہی زندگی کا انج[illegible] ہے۔

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

یہ کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور موت پروردگار عالمین کے لئے ہے۔ ان سبیلوں کو سمجھنے اور ان پر چلنے کی زیادہ صلاحیت علمائے امت میں ہے۔

قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک اور تا بحدِ قیامت تبلیغ کا دار و مدار علماء و صوفیائے امت کے ساتھ وابستہ رہا۔

علمائے امت اور اولیائے امت دونوں کا احترام اِس ایمان کے ساتھ کرنا چاہیئے۔

کہ یہ دونوں اولیاء اللہ ہیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے۔ تو اس زمانہ تک کس طرح دینِ اسلام پہنچ سکتا۔

اولیاء اللہ نے فرمایا۔ جس نے فلاحِ دارین حاصل کرنی ہو۔ وہ اِن مکرمین کے پاس بیٹھے۔ اور نہایت تواضع کے ساتھ ان کے پند و نصائح سُنے۔ اور ان پر عمل پیرا ہونے کی سعی کرے۔ اور اِن لوگوں کی ہر ممکن خدمات انجام دے۔ اِن لوگوں کی جس طرح بھی خدمت کرے گا۔ وہ خدمت عنداللہ ہدیہ ہوگی۔

اِن لوگوں کی خدمت میں جو چیز گذارے۔ وہ حلال و پاک ہونی چاہیئے۔ کوئی حقیر یا غلیظ یا غیر مقبول چیز ان کی خدمت میں نہ پیش کی جائے۔

مثلاً صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ کا مال اِن لوگوں کو نہ دے۔ بلکہ اپنی خاص کمائی ہوئی دولت سے مال و جنس بصورتِ ہدیہ اِن کی خدمت میں پیش کرے۔

یہ لوگ اکثر سفید پوش ہوتے ہیں۔ جو عالمِ اضطرار میں لوگوں کی کم فہمی اور غفلت کی بناء پر اِس قسم کے جنس و مال قبول تو کر لیتے ہیں۔ مگر یہ شیوہ اللہ و رسول کو پسندِ خاطر نہیں ہو سکتا۔ کہ دنیادار تو اپنی کمائی سے کھائیں پیئیں اور عیش کریں۔ اور اہل اللہ کو زکوٰۃ و صدقات دیں۔

مگر اللہ تعالےٰ اِس حالت میں بھی اپنے بندوں کی بزرگی میں کمی نہیں فرماتے ... حالت میں اُن کے صبر و تحمل پر اُن کے مرتبے کہیں زیادہ بلند فرماتے ہیں۔ ... اُن اجر میں اضافہ ہوتا ہے۔

تیرہواں باب

بر بنائے تقویٰ سلوک کی تعریف

میرے بزرگوار والدین نے اپنی بصیرتِ عارفانہ کے پیشِ نظر اور حضرت پیر صاحب بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی علیہ الرحمۃ کی پیشنگوئی کے مطابق مجھے کسی مدرسہ میں اکتسابِ علم کے لئے نہیں بھیجا۔

بلکہ بڑے استغنا کے ساتھ مجھے پرائمری سکول موضع دیول میں داخل کرایا۔ جس میں قدرتی طور پر مجھے دلچسپی نہ مل سکی۔ اور تیسری جماعت تک بڑی لاپرواہی سے پڑھا۔ پرائمری سکول تیسری جماعت غالباً رعایتی طور پر پاس کی۔

میرے پرائمری سکول کے اساتذہ میں سے اکثر بقیدِ حیات موجود ہیں۔ جن کا میرے دِل میں ابھی تک احترام کارفرما ہے۔ وہ میری تعلیمی حالت کے اچھی طرح شاہد ہیں۔

بس اتنا ہی تھا کہ عالمانہ ماحول میں زندگی کے دِن بڑھ رہا تھا۔ اور دینی مسائل میرے ذہن نشین ہوجاتے تھے۔

والدین کی فاضلانہ مجلس کی تاثیرات نے میرے قلب و نظر پر گہرے اثرات مرتب کر لئے تھے۔ جس سے میرا ذوق دینداری کی طرف مائل تھا۔ مگر باوجود اس ذوقِ اسلامی کے مجھے اپنے ہم جول ساتھیوں کے ساتھ کھیل کود کا بڑا شوق تھا۔

بہر حال میرے والدین مجھے بہت کم ممانعت فرماتے۔ اور میرے جذبات کے پیشِ نظر بڑی مدبرانہ مشفقانہ عادتِ کریمانہ کے ساتھ پند و نصائح کے ذریعہ میری اصلاحِ حال فرماتے رہتے۔

بزرگانِ دین کے اقوال سُناتے - اور وہی میرے لئے ایک پُر تاثیر نصیحت کی صورت اختیار کر لیتے -

ہمارے در و دیوار سے عاجزی، فروتنی اور دُرویشی کے آثار ہمہ وقت ہویدا تھے ہمارے گھر کا سارا ماحول دُرویشانہ زندگی کی ایک مختصر سی دنیا تھی - جس میں ہمہ وقت دینی مسائل نہایت سفید پوشانہ ماحول - حسبِ استطاعت جود و سخا کا منظر، اہلِ عقیدت کی باذوق مجالس میرے ضمیر میں داخل ہو کر میرے قلب و نظر کو اپنا مسکن بنا رہے تھے -

میرے والد بزرگوار حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے رحمانی تعویذات کے اجازت یافتہ تھے - اس کے ساتھ لوگوں کو دعا دینے کی بھی اجازت تھی - چشتی قادری طریقہ سے آپ اجازت یافتہ تھے - آپ کی دعائیں مقبول تھیں - اور آپ کے تعویذات بڑے پُر تاثیر اور زود اثر تھے -

آپ کو خاندانِ قادریہ اور خاندانِ چشتیہ سے خرقۂ خلافت کے ساتھ بیعتِ عامہ کی بھی اجازت تھی -

مگر آپ نے پوری زندگی میں صرف گیارہ آدمیوں کو اپنا مرید کیا - اُن گیارہ میں سے ایک میں بھی تھا - مجھے بیعت کے ساتھ خلافت بھی عطا فرمائی -

والدہ بزرگوارہ کو بھی دعا کرنے اور کلامِ الٰہی کے ساتھ بیماروں کو دم کرنے کی اجازت تھی - دونوں حضرات اپنے پند و نصائح کے ساتھ اِن اجازات کی بنا پر حاجت مندوں کے لئے دعائے خیر بھی فرماتے - اور تعویذات بھی دیتے - اور کلامِ الٰہی کیساتھ مریضوں کو دم بھی فرمایا کرتے تھے - آپ کے اِن فیوضاتِ دُرویشانہ سے اکثر لوگوں کو کافی فائدہ ہوتا -

بوجہ استفادہ عام کے ہزارہ، مری، آزاد کشمیر اور کہوٹہ تک کے لوگ اور بیرونِ پہاڑ - یعنی میدانی علاقوں سے بھی بکثرت لوگ آتے - اور دینی و روحانی استفادہ حاصل کرتے -

یہ لوگ ہجوم در ہجوم ہمارے دُرویش خانہ پر صبح و مسا جمع رہتے ۔ اور میرے والدین بزرگوار بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اُن کی خاطر و مدارات کرتے ۔ اور حسبِ اجازت اُن کی خدمات انجام دیتے ۔

آپ حضرات نے اِس طریقِ تصوف کو تبلیغِ دین کے لئے صرف کیا ۔ حضرت والد بزرگوار تعویذ لکھتے ہُوئے بھی اپنی وعظ و نصیحت جاری رکھتے ۔ عام لوگوں میں عام فہم نصیحت فرماتے اور خاص لوگوں میں خاص باتیں بیان فرماتے ۔

اہلِ علم لوگوں میں عالمانہ سطح پر گفتگو فرمایا کرتے تھے ۔ اور بعض دفعہ فلسفہ کی انتہائیوں تک آپ کا کلامِ بلیغ پہنچ جاتا ۔

آپ کا کلام دینی تعلیمات کی روشنی میں عُرفِ نفس سے عُرفِ ربانی کا ترجمان ہوتا تھا ۔ آپ کی طرزِ طریقت ، عرفِ نفس اور عرف باللہ کے تعارف میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ۔ اور حضرت رومی رحمۃ اللہ علیہ اور غوث الاعظم جیلانی رحؒ کی مقلد تھی ۔

مَیں نے بھی خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد اسی دستور العمل کو ذریعۂ غور و فکر بنا لیا ۔ چنانچہ اس زاویۂ نگاہ پر مجھے ریاضت کے دوران تفکر کرنے کا موقع مِلا ۔ اور میں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ زیادہ سے زیادہ امثال حضرت رومی اور حضرت غزالی سے لیتے تھے ۔

بعض دفعہ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام بطورِ نصائح پیش کرتے ۔ اور نظریۂ توحید کے ساتھ نظریات سلوک کا اقتباس حضرت غوث الاعظم جیلانی قدس سرہ العزیز سے بڑے کامل اعتقاد سے لیتے ۔

اور قصیدہ غوثیہ اور قصیدہ بُردہ شریف اور درود تاج کا زیادہ وِرد فرماتے تھے ۔ اور دلائل الخیرات کے متعلق یہاں تک اظہارِ عقیدت فرماتے کہ ۔

اگر کوئی مسلمان مرد یا مسلمان عورت غایت آدابِ طہارت اور پاکیزہ جگہ پر رُو بقبلہ بیٹھ کر اُس کے اضراب یعنی آٹھ ضرب حسبِ دستور پڑھے ۔

یہ کہ سوموار سے سوموار تک اضراب مکمل کرے ۔ تو یقیناً حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا اُسے جاگتے ہُوئے دیدار

نصیب ہوگا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اُسے بذریعہ خواب حبیبِ پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت نصیب کرے گا۔

اور اگر ایسا نہ ہو۔ تو اُس کے آداب میں کمی ہوگی۔ اور اس حالت میں بھی انشاأللہ وہ اپنی موت تک کسی نہ کسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دیدار پائے گا۔

فرمایا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی وہ امانتِ کبریٰ ہیں۔ جن کا نور ہر زمان و مکان میں بفضل اللہ موجود ہے۔ اس میں شبہ نہ کرنا چاہیئے۔ درحقیقت اِس قسم کے عقلی شبہات ہی حائلِ دیدار پُرانوار ہوتے ہیں۔

آپ ادعیہ ماثورہ کے پابند تھے۔ آپ اُن تمام اوراد و وظائف کے اجازت یافتہ تھے۔ جن کی تکمیلِ سلوک میں ضرورت درپیش آسکتی ہے۔ آپ نے اُن ریاضات کو بھی پورا کیا۔ جن کے پورا کرنے کی راہ سلوک میں تزکیۂ نفس کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔

راہِ سلوک میں وہی سالک کامیابی پانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ جو تمام خواہشاتِ عقلی و نقلی سے قطعاً بیگانہ ہوکر یگانۂ معرفت ہوجائے۔

اور یہاں تک احتیاط لازمی ہے۔ کہ کوئی صاحبِ ریاضت کشف و مکاشفات کا لالچ بھی نہ کرے۔

اِس واسطے کہ مکاشفہ مقصود نہیں ہوسکتا۔

چونکہ مکاشفہ غیر ہے۔ مقصود نہیں۔ بعض صوفیا بفرضِ مکاشفہ تزکیۂ نفس کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور اُنہیں انجامِ کار مکاشفہ بھی نہیں مِل پاتا۔ جس کی بناء پر وہ مکاشفات کے انکار پر اُتر آتے ہیں۔ حالانکہ مکاشفہ بربنائے تقویٰ حق ہے۔

مگر چونکہ اپنی ریاضت کی بنیاد غلط ہونے پر وہ مکاشفہ سے بے بہرہ ہوجاتا ہے۔ یہ مکاشفہ کی غلطی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی خدا کی جانب سے نعوذ باللہ تغافل ہوتا ہے۔ اور نہ ہی کلامِ الٰہی میں کوئی فرق ہوتا ہے۔

فرق صرف یہی ہوتا ہے۔ کہ سالک جب مرضیاتِ الٰہی سے ہٹ کر مرضیاتِ نفس پر

اُتر آتا ہے۔ تو سلوک کا باطنی زاویۂ نگاہ بنیادی طور پر غلط ہو جاتا ہے۔

چونکہ معرفت کا تعلق علیٰ وجہِ بصیرتِ عارفانہ منازلِ سلوک کو طے کر کے نصابِ ریاضت پورا کر کے اپنے وجود کو ریا، کینہ، کپٹ، حسد و بغض اور فساداتِ نفسانیہ سے بچا کر مرضیاتِ خدا اور رسول کے مطابق اور مرضیاتِ کتاب و سنت کے مطابق اور مرضیاتِ مرشدین کاملین کے مطابق وجود کو ایسا تربیت یافتہ بنانا مقصود ہوتا ہے۔

جس طرح ایک سُدھایا ہُوا سوار سُدھائی ہُوئی سواری پر منزلِ مقصود کی طرف لگام تھام لے۔ جب چاہے اور جس طرف چاہے لگام موڑ لے۔ سواری اُسی طرف چل پڑے۔ اور سوار و سواری میں کسی غلط تربیت کی بنا پر تصادم واقع نہ ہو۔

اگر سوار تربیت یافتہ ہو۔ اور سواری غیر تربیت یافتہ ہو۔ یا سواری تربیت یافتہ ہو۔ مگر سوار غیر تربیت یافتہ ہو۔ تو کسی طرح بھی رختِ سفر نہیں باندھا جا سکتا۔

خدانخواستہ ایسی حالتِ تضاد میں کوئی سفر کرنے پر بضد ہو جائے۔ تو اُسے سفرِ راہ میں سخت خفت اور ندامت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

بالکل بعینہٖ انسانی روح اپنے جسمِ انسان کی سوار ہے۔ اور جسمِ انسانی اپنی روح کی سواری ہے۔

اسلامی طرزِ سلوک میں تزکیۂ نفس کا منشا را سلامی تقویٰ ہے۔ جو روح کی صلاحیتوں کو رفعتِ انسانیہ کے آسمانوں پر تابناک کرتا ہے۔

جس طرح صاف شفاف آسمان کے ستارے، صاف حوض، صاف دریا اور صاف سمندر میں اپنا عکس ڈالتے ہیں۔

بالکل اِسی طرح صاف و شفاف روحانیت عالمِ امر سے قلبِ مومن پر اپنا نورانی عکس ڈالتی ہے۔ جس کو اصطلاحِ تصوف میں وارداتِ عالمِ امر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو بعد میں وارداتِ قلبی بن جاتے ہیں۔

وارداتِ قلبی کا انعکاس طبعِ انسانی پر ہوتا ہے۔ اور طبعِ انسانی کا انعکاس وجود

اندرونی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ اور سب صلاحیتوں کا مجموعی انعکاس انسانی عقل و دِل و نگاہ پر ظاہر ہو کر تحریکِ باطن کا اظہار کرتا ہے۔

اگر سالک ایسا کرنے سے پہلے اپنے نفسانی تزکیہ میں کچھ لالچ کر بیٹھے۔ کہ مجھے صاحبِ کشف وکرامات ہو جانا چاہیئے۔

تو اِس کا صاف ترجمہ یہ ہوگا۔

کہ وہ لوگوں پر بر سبیلِ کشف وکرامات غلبہ چاہتا ہے۔ اور اِس قسم کی حرص وہوا پیدا وارِ نفس ہوتی ہے۔

گویا کہ اُس نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ادا کیئے۔ تہجد کی نماز ادا کی، نوافلِ اشراق پڑھے۔ اوابین کی پابندی کی۔ ادعیۂ ماثورہ ادا کیئے اور اِن سب کا مصرف خواہشِ نفسانی پر مرتب کیا۔

بصورتِ دیگر ترجمہ یہ ہُوا۔

کہ نماز پڑھ کر شراب خانہ میں چلا گیا۔ یا نیک بن کر نیکی کو بدی پر صرف کر رہا ہے۔ یا نور بن کر بجھ جانا چاہتا ہے۔

سلوک کی راہ پر وہی لوگ صاحبِ کشف وکرامات ہو سکتے ہیں۔ جو کشف وکرامات کو بھی اللہ کی راہ میں نفی کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ بر سبیلِ راہ حق ایسے ہی لوگوں کو کشف و کرامات سے نوازا جاتا ہے۔

مگر وہ کشف وکرامات کو ایزادِ رحمتِ خداوند ذوالجلال سمجھ کر اُن کو چراغِ راہ بنا لیتے ہیں۔ اور اُن کی روشنی میں مزید راہِ حق کو اپنے لئے واضح تر کر لیتے ہیں۔ جس سے اُن پر ہدایت کی باریکیاں واضح ہوتی رہتی ہیں۔ اور وہ اللہ تعالےٰ کے سچے دوست ہوتے ہیں اور اُن کی دوستی کی راہ انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین کی راہ سے مختلف راہ نہیں ہوتی۔

اگر کوئی اُن کی راہ سے مخالف کسی دوسری راہ کو راہِ سلوک بنانا چاہے۔ تو کروڑہا برس میں بھی وہ ایک جھلک تک دیکھنے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔

ہاں وہ عامل کہلا سکتا ہے۔ مگر مردِ کامل نہیں بن سکتا۔ بس عامل و کامل میں اتنا ہی بین فرق ہے۔

کہ خلافِ اسلام مخترع تصورات پر تو کوئی غیر مسلم بھی عمل کر کے عامل کہلا سکتا ہے۔ اور شعبدہ بازوں میں شمار ہو کر صاحبِ استدراج بن سکتا ہے۔

مگر ایسے عامل پر منتقی سالکِ راہ کا قطعاً اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کو ولی اللہ کہنا بھی جرم ہے۔

ایک عمل عملوا الصلحت سے ہے۔ جس کا تعلق اسلامی شعائر سے ہے۔ اور اس میں کسی خارجی تاثیرات کی تسخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو تعمیل احکامِ اسلام کے ضمن میں آتا ہے۔ اس طرح عملوا الصلحت کی پابندی کرنے والا عملوا الصلحت کا عامل کہلاتا ہے۔

اِس کے سوا جتنے عمل بھی کئے جائیں۔ وہ سب اسلام کے خارجی عملیات ہیں جو اختراعی ہیں۔ ان سے مراد نفسانی خواہشات اور تکمیل اعراضِ نفسانی کے سوا کچھ نہیں۔ اور اسلام میں ان عملیات پر عمل کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔

ایسے لوگ تضییع اوقات کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو توہم پرست بناتے ہیں۔ اور دو قسم کے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ایک خلافِ اسلام اختراعی عملیات پر یقین کرنا۔ اور اس پر اپنے قیمتی اوقات کو صرف کرنا۔ دوسرا گناہ یہ کہ لوگوں کو اختراعی عملیات کے ذریعے توہم پرست بنا کر اسلامی اعمالِ صالحہ سے اُن کو غافل کر کے دور رکھنا۔

اِس طرح یہ عملیات بدعتِ شنیعہ بن کر قوم میں سُستی، جہالت، غفلت شعاری، تن آسانی اور توہم پرستی وغیرہ پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔

علمائے سلفِ صالحین اور صوفیائے سلفِ صالحین بحوالہ قرآن مجید۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۔

یعنی ہم نے قرآن مجید کو من کل الوجوہ اہلِ ایمان کے لئے روحانی اور جسمانی شفار کی صورت

میں نازل فرمایا۔

اِس آیت کی روشنی میں دلیل کے طور پر کلامِ الٰہی کو اور انبیاء و مرسلین کے اوراد و وظائف کو۔ نیز اسمائے الٰہیہ کے ساتھ بیماروں کو دم کرنا پھونکنا۔ اور لوگوں کے لئے اللہ کے حضورِ اقدس میں گڑ گڑا کر دعا مانگنا وغیرہ۔

اور حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا کلامِ الٰہی کے ساتھ اور اسمائے الٰہیہ کے ساتھ دم کرنا، پھونکنا اور دعائے خیر کرنا اور اُن کی تقلید و اطاعت میں خلفائے راشدین اور اصحابِ کبار رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کا دم کرنا پھونکنا۔ اور دعاء کرنا۔ اور سلسلہ وار تابعین تبع تابعین اور علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کا بوقتِ ضرورت اِن طریقوں پر عمل پیرا ہونا۔ اور جمہور علمائے امت کا اس پر عمل جاری رکھنا۔ تمام متقی علماء و اولیائے متقدمین کی تقلید و طریقت کتاب و سنت کی پیروی تھی۔

اور اس طریقت پر چلنے کا نام اسلامی اعمالِ صالحہ کے تاثرات کے ساتھ تبلیغِ دین ہی مراد تھا۔ نہ کہ جلبِ منفعت۔

اِن صالحین کی ہر ادا چاہے وہ قولی تھی یا فعلی چاہے اُن کے احوال سے متعلق تھی۔ سب کا منشار ایک ہی تھا۔

وہ یہ کہ اللہ تعالےٰ کی ذات ہی شفاء و ہدایت دینے پر قادر ہے۔ جب تک کوئی مومن اللہ و رسول کا فرمانبردار نہ ہو گا۔ اُس سے فیوض و برکات بصورتِ کرامت سرزد ہونے محال ہیں۔

کرامت کا اطلاق اسلامی تقویٰ پر ہوتا ہے۔ خلاف تقویٰ کوئی عمل بھی کرامت نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں میں جب سے عجمی تصوّف نے رواج پکڑا۔ اور ان میں مجہول قسم کے صوفیوں نے جنتر منتر وغیرہ کو اپنے معمولات میں داخل کر لیا۔

یہ وہ صوفی تھے۔ جو علومِ اسلام سے بے بہرہ ہونے کی وجہ پر اسلامی اُوراد و وظائف و اعمال کے حصول میں ناکام تھے۔

انہوں نے غیر مسلمین کے جنتر منتر اور مسمریزم قسم کے عملیات کو اپنایا۔ اور بظاہر نماز و روزہ کے پابند ہو کر اظہارِ تصوف کرتے رہے۔ اور بباطن ہندوؤں، سادھوؤں کے بتائے ہوئے مروجہ جنتر منتر کو استعمال میں لاتے رہے۔ اور اپنی جاہل اولادوں۔ اور ہم نشینوں میں اُن کو نافذ کرتے رہے۔ جو اُن کے مرنے کے بعد بھی نسلاً بعد نسلاً رواج پکڑتے گئے۔

اکثر جاہل لوگ اِن طریقوں کو جادو وغیرہ پر محمول کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں میں لفظِ جادو نے اِن ہی توہمات پر رواج پکڑا۔

چونکہ غیر مسلمین اِن مخترع عملیات کو اپنا اکتسابی علم کہتے ہیں۔

مگر ہمارے اسلاف علمائے صالحین نے ہر میدان میں ایسے مصنوعی صوفیوں کا اسلامی تصوف کے ساتھ مکمل اور باقاعدہ ردِ عمل کیا۔

ورنہ برِ صغیر کے مسلمانوں پر جس طرح ساہوکارانہ سود نے تسلط جما لیا تھا۔ اِس طرح ہندو قوم کے اِس سادھوانہ اِزم کا بھی تسلط ہو جاتا۔

حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری علیہ الرحمۃ سے لے کر جملہ اکابر علمائے صالحین سے اِس وقت تک کے صاحبِ علم و فراست متقی اصفیائے اُمت نے اپنے متقیانہ کردار سے اسلامی کرامات کا جس اندازِ عالمانہ کے ساتھ اظہار فرمایا۔ ان صالحین کی کراماتِ اسلامیہ بالکل اسی طرح نمایاں ہو کر سامنے آتی رہیں۔

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ پاک سے اختراعی عملیات کے سانپ عصائے موسوی نے چاٹ لئے تھے۔ اور استدراجِ فرعونیہ اِس معجزہ سے لرزہ براندام ہو گیا تھا۔

ہمارے اسلاف نے یا تو آیاتِ قرآنیہ کو جو مناسبِ حال تھیں باجازتِ مرشدین طریقت دم کے لئے استعمال کیا۔ یا تعویذات لکھے۔ یا احادیث شریفہ کی روشنی میں اولیائے اُمت کے تجربہ میں آئی ہوئی دعاؤں پر عمل کیا۔

اُن کی دعائیں اُن کے اوراد و وظائف اُن کے دم اُن کے جملہ تعویذات کتاب و

سنت کی روشنی میں عمل میں لائے گئے تھے۔ بعض آیاتِ طویلہ کے اعداد سے چھوٹے قسم کے تعویذات بصورتِ نقش بھی جاری کئے گئے۔ تاکہ وہ بہت بڑے تعویذ نہ بن جائیں۔

سورۂ اخلاص کی تکسیر، سورۂ فاتحہ کی تکسیر، سورۂ یٰسٓ کی تکسیر، سورۂ مزمل شریف کی تکسیر اور بعض بڑی بڑی صورتوں کی تکسیر، طُرقِ اربعہ سب سے منقول و مروج ہے۔

اسمارِ صفاتِ باری تعالیٰ کی تکسیر بالعدد اور اسمائے رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بالعدد تکسیر پر حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہادی رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا عبور تھا۔ آپ نے بڑے تزکیہ وریاضت کے بعد ان کو حاصل کیا تھا۔

جن کی اجازت ہمارے خاندان میں عملاً جاری ہے۔ اِس قسم کے تمام اسلامی اوراد و وظائف اور دعاؤں اور تعویذات اور دم و درود کرنے کی اجازات عرب و عجم میں مروج ہیں۔

میرے والدِ بزرگوار کو طرقِ اربعہ سے اِن اوراد و وظائف اور اسلامی تعویذات کی اجازت تھی۔ اور یہ سلسلہ ہمارے اجداد سے بھی تواتر کے ساتھ جاری رہا۔

حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی والد بزرگوار کو ایسی بیش بہا اجازات عنائت کر رکھی تھیں۔

چنانچہ مجھے اپنے والدین کی طرف سے گیارہ فیوضات جو انہیں اپنے اسلاف سے سلسلہ وار ملے تھے اُن کی مجھے اجازت دی گئی۔ بقول ان کے یہ اجازات نادرہ ہیں اور سینہ بسینہ چلی آنے والی ہیں۔

مجھے اپنے والدین کی اسلام پسندانہ طریقتِ اسلامیہ کا نہایت سادگی اور فروتنی سے اپنے دامنِ فقر میں محفوظ رکھنے کا طریقہ نہایت پسند خاطر ہوا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو دیندار رکھنا اور طریقت کو مذہبی روایات کے ساتھ رکھنا میرے لئے ایک عظیم تدریسِ دین کا کام سرانجام دے رہا تھا۔

مجھے والدین نے ہمیشہ ایسے تصوّف سے اجتناب کی ہدایت کی جو دین کے خلاف ہو۔

چودھواں باب

والد بزرگوار کے دینی مشاغل

والد بزرگوار کو اپنی پوری عمر میں تین قسم کے جلیس میسّر آئے۔

ایک وہ لوگ جو آپ کے بچپن کے ساتھی یعنی ہم عمر تھے۔ دوسرے وہ لوگ جو آپ کے زمانۂ رشد و ہدایت میں جوان ہوئے۔ تیسرے وہ لوگ جو آپ کی آخری عمر میں جوان ہوئے۔

یہ تینوں قسم کے لوگ کچھ ہم وطن اور کچھ دور دراز علاقوں کے رہنے والے بھی تھے۔ موضع دیول میں آپ نے ہمیشہ امامت و خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ سلسلہ دیول میں دادا جان سے شروع ہوا۔

آپ نے جب دیول میں بغرض تبلیغِ دین سکونت اختیار فرمائی۔ تو ساتھ ساتھ امامت و خطابت کو ہی ذریعۂ تبلیغ بنایا۔

چونکہ ایک عالمِ دین کے لئے اِس سے بہتر کوئی دوسرا مشغلہ زیبا نہیں ہو سکتا۔ بڑی محبت و پیار سے میرے دادا جان اور میرے والد بزرگوار نے اس فریضۂ دینی کی انجام دہی کی۔ اور ساتھ ساتھ اپنے روحانی فیوض و برکات سے بھی عوام و خواص کو فیضیاب کرتے رہے۔

آپ کی مجلس سے فیضِ اول پانے والے وہ لوگ تھے۔ جو آپ سے کم عُمر تھے۔ اور آپ کے ہم عمر لوگ تقریباً سارے ہی مذہب پسند تھے۔ اور نماز روزہ، حج و زکوٰۃ کے پابند تھے

اِن میں سے اکثر لوگ رؤسائے دیول تھے۔ یہ لوگ بڑی صفاتِ کریمانہ اور شجاعتِ عظیمانہ کے پیکر تھے۔ جن کی تاریخ کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔

مجلسِ ثانی جو آپ کو رشد و ہدایت کے متوسط زمانہ میں ملی۔ یہ پہلے لوگ اور مجلس جدید تعلیم سے روشناس ہو کر سامنے آئے۔ مگر اسلاف کی روایات پر سختی سے کار پابند ہونے کی بنا پر آپ کی مجلسِ عالمانہ و عارفانہ سے باقاعدہ اکتسابِ فیض کرتے رہے۔

مجلسِ ثالث میری ہم زمانہ تھی۔ جو مزید جدید رجحانات سے آراستہ ہو کر سامنے آئی۔ مگر یہ مجلس بھی اپنے روایات کی پابند ہونے کی بنا پر والدِ بزرگوار سے مانوس رہی۔ اور اُن سے پند و نصائح سُنتی رہی۔ اور حضرتِ والد بزرگوار کے اخلاقِ کریمانہ سے بے حد متاثر ہُوئی۔

اِس مجلس کے افراد بڑے بڑے عہدوں پر فائز المرام ہُوئے۔ یہی تین قسم کی مجالس آپ کے وصالِ مبارک کے بعد میرے حصّہ میں بھی آئیں۔

پہلے بزرگوں سے جو حضرتِ والد بزرگوار کے ہم عصر تھے۔ اُن میں سے زیادہ لوگوں کی زیارت کرنے کا مجھ عاجز کو بھی شرف نصیب ہُوا۔ اُن سب بزرگوں نے مجھ سے بڑی مروت اور تلطف کا برتاؤ کیا۔ اُن کو دیکھ کر مجھے والد بزرگوار کی یاد تازہ ہو جاتی۔

اِن لوگوں کا تلطف میری ذاتی پریشانیوں میں ایک مسیحائی کا کام سرانجام دیتا تھا۔ میرے حوصلے بلند ہو جاتے۔ اور میں اپنی ریاضتوں میں اور زیادہ مصروف ہو جاتا۔ خدا اُن سب کو غریقِ رحمت کرے۔ یہ سب لوگ والد بزرگوار کے جلیسِ خاص تھے۔

اُن میں سے چند بزرگ ابھی تک اپنی گو ناگوں برکتوں کے [illegible] بقیدِ حیات ہیں۔ اور سرزمینِ دیول پر اپنی شفقت و رافت کے ساتھ نئی پود کو توانائی بخش رہے ہیں۔ یہ لوگ دیول کی عظمت کا نشانِ باقیہ ہیں۔

میرے ہم عمر نوجوان طبقہ نے اپنی رعایات کے مطابق میرا ساتھ ہر منزلِ سلوک میں اِس محبانہ اور مخلصانہ طور پر دیا۔ جسکو میں اپنے راہِ سلوک میں بنیادی تائید کا مقام دیتا ہُوں۔

حتیٰ کہ دیول کے ہر خورد و کلاں صغیر و کبیر نے میری پوری پوری حوصلہ افزائی کی۔ جس کو میں فضلِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہوں۔

والدِ بزرگوار ہمیشہ دورانِ کلام فرمایا کرتے۔

کہ اہالیانِ دیول کو پروردگارِ عالم نے بڑی خوبیوں اور خصوصیاتِ عالمانہ سے نواز رکھا ہے۔ اور اِس زمین کی مٹی بھی اکسیر ہے۔ یہاں کی آب و ہوا دل آویز ہونے کے علاوہ روحانیت کو شگفتگی اور شیفتگی بخشتی ہے۔

ایک دفعہ فرمایا۔

ارضی جغرافیائی کیفیت اور سلسلوں نے اِسے کثیر خوبیوں کی بنا پر مرکزیت کا مقام دے رکھا ہے۔ اُن خوبیوں میں ایک واضح خوبی یہ ہے۔

کہ یہاں کے بسنے والے لوگ بڑے غیور حمیت پسند مردم شناس اعلیٰ معیشت کے مالک ہیں۔ اور بڑے ذکی الحس اور دانا قسم کے لوگ ہیں۔ ہزارہ، مری اور آزاد کشمیر کے عباسیہ خاندان قوم ڈھونڈ کا وسطی مقام دیول ہے۔

فرمایا۔

بکوٹ شریف سے لے کر دیول شریف تک اور پوٹھہ شریف سے دیول شریف تک اور موہڑہ شریف سے دیول شریف تک کوہالہ سے دیول اور مری سے دیول کی منازل کم و بیش برابر ہیں۔ کوئی وقت ایسا آئے گا۔ کہ ابنائے دیول کا بخت سکندری دیول کو اپنی تاریخ میں ایک عظیم مقام دے گا۔

اور دیول پہاڑ کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہوگا۔ یہاں سے ہر صدی میں اِس پایہ کے اہلِ دانش پیدا ہوا کریں گے۔ جن کی شہرت دُور دراز تک پہنچے گی۔ اہلِ دیول میدانِ رزم و بزم دونوں میں یدِ طولےٰ حاصل کریں گے۔ اور ہر شعبۂ زندگی میں اپنی نمایاں تاریخ مرتب کریں گے۔

یہاں کے ایک معمولی ذہن میں بھی قیادت کا مادہ موجود رہے گا۔ یہ لوگ معاملہ فہم اور صلح جو ہوں گے۔ اِن کی باہمی خصوصیات اِن کے لئے اعلیٰ صبح دمسالائیں گے۔ اِن کا

مستقبل تابناک ہے۔

فرمایا۔

پہلے بزرگ اپنی اعلیٰ خصوصیات کی اِس قدر پائیدار بنائیں قائم کر گئے ہیں۔ جِن میں تزلزل نہیں آئے گا۔

چونکہ اُن لوگوں نے یہ بنائے تہذیب اسلامی تقوٰی اور خاندانی حمیت پر رکھی ہے۔ اور جِس تہذیب و تمدّن کی اساس اسلامی تقوٰی اور خاندانی شرافت پر رکھی جائے۔ وہ دیر پا ہوتی ہے۔

دیول عقل و دانش اور علم و عرفان کا بہتا ہُوا چشمہ ہے۔ یہ دیول کے ایسے صفات ہیں۔ جنہیں ہر دَور میں نمود حاصل ہوگی۔ اِسی طرح دیول کی تاریخ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے ساتھ پھلتی پھولتی رہے گی۔

ایک دفعہ فرمایا۔

کہ میرے پاس اچانک ایک مردِ خدا کشمیر کی طرف سے بصورتِ مہمان ایک دِن اور ایک رات کے لئے قیام پذیر ہُوئے۔ اُن کی آنکھوں میں نورِ عرفان تھا۔

دُبلے پتلے وجود والے اُس مردِ خدا نے فرمایا۔

کہ میں الہاماً آپ کے پاس آیا ہُوں۔ اور آپ سے ملنے کا اشتیاق ہُوا۔ مَیں حضرت فقیر اللہ بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے مِل چُکا ہُوں۔ مَیں نے عالمِ مکاشفہ میں دیول کا مرتبہ بلند و بالا دیکھا ہے۔

مَیں آپ کی پیشانی میں نورِ عرفان کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہُوا دیکھ رہا ہُوں۔ میں نے دیول کے محراب و ممبر میں ایک ہمہ گیر نور پایا ہے۔ مَیں نے دیول کو دیول شریف کی صورت میں پایا۔ مَیں نے دیول کے لوگوں کو آسمانِ عزت کے ستاروں کی صورت میں درخشندہ اور تابندہ دیکھا ہے۔

یہاں کی سرزمین میں بڑے بڑے اولیاء اللہ مدفون ہیں۔ جِن کا نور آفتاب و مہتاب کی طرح چمکتا ہے۔

اِن میں اکثر بڑے مرتبے کے اولیاء اللہ ہیں۔ اور بعض قطبیت کے مقام تک پہنچنے کے بعد وصال پانے والے ہیں۔

میں نے کچھ تامل سے جواب دیا۔ کہ بفضل اللہ میں اِن حقائق پر اطلاع رکھتا ہوں اور آج مزید تصدیق ہو گئی ہے۔

اُس کے بعد وہ صاحب عالمِ استغراق میں گُم ہو گئے۔ جب ذرا سکون پایا۔ تو حمدِ باری تعالےٰ بیان کی۔ اور درودِ پاک کی تلاوت فرماتے ہوئے دعاء شروع کی۔

کہ اے اللہ تعالےٰ میں اِن پہاڑوں میں بسنے والوں کے لئے تجھ سے بوسیلۂ دیول شریف دعائے خیر مانگتا ہوں۔ اے اللہ بتصدیقِ سرزمینِ دیول شریف میرے گناہ معاف فرما۔ میرا انجام بالخیر فرما۔

یہاں کے لوگوں اور اِن کی اولادوں اور اِن کی نسلوں کو ابدالآباد تک شاداں و فرحاں فرما۔ اِس پہاڑ میں بسنے والے لوگ دائمی عزت و آبرو پائیں۔ اِن کو ارضی و سماوی آفات سے نجات دے۔

والدِ بزرگوار نے فرمایا۔

کہ میں نے اِس بزرگ سیرت مردِ خدا کی زبان سے پہلی مرتبہ دیول کے نام کے ساتھ شریف کا نام سُنا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اور میں نے استفسارًا پوچھا۔

فرمایا۔

دیول کو دیول شریف ہی کہنا چاہیئے تھا۔

مگر اِس کی شرافت کے اظہار کے لئے جِس دلیل کی ضرورت ہے وہ اِس کی گود میں پیدا ہوگی۔ جِس کی بنا پر یہ دُور دراز تک شریف کہلائے گا۔

فرمایا۔

یہ سرزمین عجوبۂ روزگار ہے۔

اگر میں دوسرے امور پر مامور نہ ہوتا۔ تو اِس سرزمین کو اپنا دائمی مسکن بنا لیتا۔ کتنے خوش بخت ہیں وہ لوگ جو اس زمین کے مسکین ہیں۔

صبح جب رخصت ہونے لگے۔ تو تھوڑی سی مٹی لے کر اپنے دامن میں باندھ لی۔

فرمایا۔

اِس مٹی کو میں حصولِ برکت کے لئے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔ خدا کرے کہ یہ مٹی میری قبر میں میرے ساتھ جائے۔

اور اپنی مبارک نظریں اُٹھا کر سارے پہاڑ پر دوڑائیں۔ اور سارے ملک کو سلام کہا۔ اور رخصت ہو گئے۔

فرمایا۔

آج تک وہ فقیر میرے دِل میں آباد ہے۔ اور اُس کی یہ التفات آمیز باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔

حضرت والد بزرگوار اور حضرت والدہ بزرگوارہ جہاں صاحبِ علم وعمل صاحبِ اتقا اور صاحبِ فہم وفراست تھے۔ اور دوسری گوناگوں صفاتِ دینیہ کے حامل تھے وہاں یہ دونوں پاکباز ہستیاں اپنے دامنِ عفیت میں کشف وکرامات جیسے بزرگانہ صفات بھی رکھتے تھے۔ جن کا میں بگوش وہوش گواہ ہوں۔

چونکہ اِس کتاب کے ذریعہ مجھے اپنے وطن اور اپنے والدین کا اور اسلامیات کے اُن معارف کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ جو میرے لئے ذریعۂ سلوک بنے۔ اور مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کہ مَیں اپنے منبع ومصدر کی تعریف تاریخی طور پر لکھوں۔

لہٰذا میری مقدور بھر یہی کوشش ہوگی۔ کہ جو کچھ مجھے صحیح یاد ہے۔ اُس کو من وعن ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ اور ہر قسم کی مبالغہ آرائی سے بچ سکوں۔

نیز یہ کتاب ابنِ عبداللہ کے نام سے میرے والدِ بزرگوار کے نام پر میری پہلی

اساسی جنبشِ باطن ہے۔ اور مَیں نے اپنے والد بزرگوار جن کا نام مُبارک محمد عبداللہ تھا۔ اور مَیں عاجز اُن کا فرزند ہوں۔

لہٰذا اِسی نسبتِ پدری کے اسمِ مبارک کے ساتھ اِس کتاب کا نام ابنِ عبداللہ رکھا۔

یہ میرے لئے باعثِ خیر و برکت ہو گا۔

نیز یہ کتاب دیول والوں کو اپنے سابقہ جلیل القدر سالکِ راہِ حقیقت و فاضلِ دین اور بزرگ سیرت، عالم و پیشوائے دین کی یاد تازہ کرنے کا ذریعہ بن سکے گی۔ آنے والی نسلیں اِس پر خوشی پائیں گی۔ اور دعائے خیر سے یاد کریں گی۔

پندرھواں باب

خوارِقاتِ قولی وعملی

میں تقریباً سات یا آٹھ سال کی عمر میں تھا۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا۔ کہ والدصاحب مجھے سورۂ مزمل شریف کی اجازتِ خاص دے رہے ہیں۔

اور والدہ بزرگوارہ چاندی کے برتن میں مجھے دودھ پلارہی ہیں۔ اور ساتھ ساتھ بآوازِ بلند درود پاک تلاوت فرمارہی ہیں۔

پھر میرے سینے پر حضرت والد بزرگوار نے۔ اور اُن کے بعد حضرت والدہ بزرگوارہ نے اپنے مبارک ہاتھوں کو تھپکایا۔ اور دعا کی کہ اللہ تعالےٰ ہمارے اِس غریب بیٹے کو اپنا بندہ بنا۔ اور اِسے صاحبِ دین وعرفان بنا۔ تاکہ یہ ہماری عاقبت میں ذریعۂ نجات ہو۔

یہ دعا فرماتے۔ اور ساتھ ساتھ مبارک آنسو بہابہا کر بار بار اسی دعا کا تکرار فرماتے صبح کو جب میں بیدار ہُوا۔ تو چائے پینے کے بعد وہی باتیں زیرِ بحث آئیں۔ جو میں نے خواب میں دیکھی تھیں۔

والد بزرگوار میری والدہ کو مخاطب فرماتے ہُوئے فرمانے لگے کہ میرے پاس سورۂ مزمل کی وہ خاص برکتیں موجود ہیں۔ جن کو میں نے حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہادی رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے حاصل کیا۔ اور اس کی نیک تاثیرات میرے سینے میں ایک گنجِ مخفی کی صورت میں موجود ہیں۔

میری تمنا ہے۔ کہ وہ میں اپنے اِس بیٹے کو تفویض کردوں۔

زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔

اگر میں نے ایسا نہ کیا۔ تو شاید مجھے قیامت تک ملال رہے۔ ابھی یہ بہت کم عمر ہے۔

اگرچہ یہ اس اجازت پر عملاً پورا اترنے کے قابل نہیں۔ تاہم اِس سورۂ پاک کی اجازت تو دی جاسکتی ہے۔

اِس میں چند نکتے ہیں۔ جو اس کو ازبر ہو سکتے ہیں۔

والد بزرگوار نے فرمایا۔

کہ اگر چاندی کا برتن مہیا ہو سکے۔ تو اس میں دودھ ڈال کر سورۂ مزمل شریف پڑھ کر دم کر کے قبل از اجازت اِس کو اگر پلادیا جائے۔ تو اِس کا سینہ اِس اجازت کا متحمل ہو سکے گا۔

آپ کا یہ فرمانا ہی تھا۔ کہ حضرت والدہ ماجدہ اُٹھیں۔ اور لکڑی کے ایک پرانے بکس سے ایک چاندی کی چھوٹی سی کٹوری لے آئیں۔ اور تازہ وضو کرنے کے بعد اُس کو گرم پانی سے تین بار دھویا۔ پھر کلمۂ تمجید پڑھتے ہوئے اُس میں نیم گرم دودھ ڈال کر حضرت والد بزرگوار کے ہاتھ میں درود پڑھتے ہوئے پیش کیا۔

حضرت والد بزرگوار نے سورۂ مزمل پڑھ کر اِس پر دم کیا۔ اس کے بعد والدہ ماجدہ نے بھی دم کیا۔ اور مجھے قبلہ رو بیٹھ کر درود شریف کے ساتھ پینے کی تلقین فرمائی۔

مجھے اِس سے قبل مکمل وضو کرنے اور پاک لباس پہننے کی تلقین فرمائی گئی تھی۔ میں باوضو اور ایک سادہ سے پاک لباس کے ساتھ حسب الارشاد منتظر تعمیل تھا۔

چنانچہ میں نے حسب الارشاد دو زانو رو بقبلہ بیٹھ کر درودِ پاک کی تلاوت کی۔ اور تیسرا کلمۂ تمجید پڑھا۔ اور چاندی کے کٹورہ کو دائیں ہاتھ میں پکڑا۔

فرمایا دونوں ہاتھوں سے پیالہ تھام کر تین دفعہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے

ساتھ پڑھ کر پی لو۔

مَیں نے ایسا ہی کیا۔ جب دودھ پی چکا۔ تو مجھے چارپائی پر لیٹ جانے کی تلقین فرمائی میں چارپائی پر لیٹ گیا۔

پہلے حضرت والد بزرگوار نے تین مرتبہ اپنے دستِ راست سے میرے سینہ کو تھپکایا۔ اس کے بعد حضرت والدہ ماجدہ نے بھی اپنے دستِ راست سے میرے سینہ کو تین مرتبہ تھپکایا۔

اِس کے بعد میرے لئے وہی دُعا فرمائی۔ جو میں نے گذشتہ رات عالمِ خواب میں سُنی تھی۔ اُسی خواب والی رات کی پہلی صبح کو میری خواب کی تعبیر کا من وعن عملاً سامنے آنا یقیناً میرے لئے ایک عجیب وغریب واقعہ تھا۔ جس نے میری روح پر اپنے بزرگ والدین کے لئے والہانہ عقیدت کی راہ کھول دی۔

اگرچہ میں اپنے اظہارِ عقیدت کے لئے اپنے پاس متاعِ الفاظ یا متاعِ گفتار میں کم مایہ تھا۔ اور اپنی عقیدت کا اظہار اُس طرح نہ کر سکتا تھا۔ جس کی ادائیگی کوئی صاحبِ کلام کر سکتا ہے۔

مگر میرے دل کے خفی جہانوں میں اپنے والدین کے لئے عقیدت اس طرح طُلوع ہو گئی۔ جس طرح مطلعِ تاباں سے آفتاب طلوع ہو کر دنیا کو بقعۂ نُور بنا دیتا ہے۔

میرے دِل نے پہلی مرتبہ اپنے والدین کے متعلق صحت مندانہ عقیدت کی روشنی پائی۔ جو قلب ونظر پر ثبت ہو گئی۔ جس نے میری روح میں دینی انقلاب پیدا کیا۔ اور مجھے اِسلامی تعلیمات پر عملاً تقوٰی حاصل کرنے کے عملی نتائج سے میدانِ بندگی میں قدم رکھنے کا موقع فراہم کیا۔ اور مجھے ایمان وایقان کی دولت سے بہرہ ور کیا۔

اِس کے بعد والدین نے مجھے نصیحت فرمائی۔

کہ ابھی تم کم سِن ہو۔ صرف تمہیں سورۂ مزمل کی اُس کے چند باریک نکاتِ عارفانہ کے ساتھ اجازت دی جاتی ہے۔

الحمدللہ۔ کہ اُس کی تفویض پر تمہارے جسم وجان میں استقامت برقرار رہی۔ ورنہ اس

کی تفویض بدن کو رعشہ براندام کردیتی ہے۔

فرمایا۔

جب تمہاری عمر بیس برس سے اوپر ہوگی۔ تو اِس وظیفۂ پاک پر بطریقِ سلوک عمل پیرا ہوکر اس کی تکمیل کرنا۔ اور اِس سے پہلے کہ تم اِس پر عمل پیرا ہوکر کامیاب نہ ہوجاؤ۔ اُس کو اپنے سینہ میں ہی مخفی رکھنا۔ تاکہ یہ امانت بحفاظتِ تمام تمہارے کام آسکے۔ اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں منتہیانہ سلوک سے ہمکنار کرسکے۔

فرمایا۔

اگر اطاعتِ دین سے روگردائی کروگے۔ تو اللہ تعالےٰ تم سے یہ امانت چھین لے گا۔ اور قبل از وقت اس کا راز افشا کروگے۔ تو بھی اِس کے ضائع ہوجانے کا احتمال ہوگا۔

پھر نصیحت فرمائی۔

کہ اگر زندگی نے وفا کیا۔ تو سلسلہ وار وہ جملہ تفویضات جو ہمیں چشتی، قادری نقشبندی طریقوں سے اور اپنے اَبّ وجدّ سے ملی ہیں۔ انشاء اللہ تمہیں ان کی اجازت مِلتی رہے گی۔

پھر فرمایا۔

دنیا کی زندگی مستعار ہے۔ یہ کوئی کہانی نہیں۔ فی الحقیقت اِس دنیا میں ہر مسلمان کو حسبِ استطاعت اور حسبِ علم ودانش پروردگارِ عالم کی بندگی کے لئے پیدا فرمایا گیا ہے۔

جن مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے حسبِ استطاعت خلوصِ نیت سے اللہ تعالےٰ کی بندگی کے فرائض انجام دیئے۔ اور قضائے الٰہی سے اپنے وقتِ موعودہ کیمطابق دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ وہ ناجی ہیں۔

اُنہوں نے زندگی کے راز کو پالیا۔ اور وہ کامران ہوئے۔ اور حیاتِ جاوداں کی راحت کو پالیا۔ اُن کی جیت ہے۔ اور عالمِ فانی کی مستعار لذات میں جنہوں نے وقت ضائع کیا

وہ نفس شیطان کے ہاتھوں ہار گئے۔

اِس کی اجازت کے بعد میں نے اپنی روحانیت میں یوماً فیوماً ارتقا پایا۔ اور تدریجاً میری روح اِسلام کی طرف اور احکاماتِ اِسلام کی اطاعت کی جانب مائل ہونی شروع ہو گئی۔

میرے خواب بھی نتیجہ خیز ہونے شروع ہو گئے۔ میں اپنے خواب جب بھی والدِ بزرگوار کے سامنے بیان کرتا۔ تو آپ سکوت فرماتے اور تھوڑی دیر بعد فرماتے۔

کتاب وسنت کی موجودگی میں اپنے خوابوں کا سہارا لینا ترک کر دو۔ خواب ظنی ہوتے ہیں۔ اور کتاب وسنت کے حوالجات قطعی ہیں۔

قطعی فیصلہ جاتِ ربانی کی موجودگی میں اگر تمہارا ذہن ظنی خوابوں کی طرف مرکوز ہونا شروع ہو گیا۔ تو تم یقیناً توہم پرست ہو جاؤ گے۔ اور یہ توہم پرستی تمہیں اہلِ مساہلہ کی طرح سہل پسند بنا دے گی۔ اور تم شعائر اللہ کی پابندی میں تغافل شعار ہو جاؤ گے۔

فرمایا۔ مَیں تمہیں خاص نصیحت کرتا ہوں۔ کہ اپنے خواب زیادہ مخفی رکھو۔ اور اگر کوئی خواب بیان کرنا ضروری ہو۔ تو اُسے کتاب وسنت کے پیمانہ میں ماپ لو۔

اگر کتاب وسنت سے اس طرح اجازت ملے کہ خواب لوگوں کے لئے عبرت وموعظت کا باعث ہے۔ تو بغرضِ ہدایت بیان کرو۔ ورنہ سکوت اختیار کرو یہ اولیٰ ہے۔

آج تک میں نے خواب بیان کرنے میں احتیاط برتی۔ اگر کوئی اچھا خواب نظر آئے تو شریعت کے مطابق کبھی کبھی بیان کر دیتا ہوں۔

مگر والد بزرگوار کی نصیحت کے بموجب میں نے تجربتاً دیکھا، سُنا اور اندازہ کیا کہ عام لوگ اتنے زیادہ خواب بیان کرتے ہیں۔ کہ مقامِ خواب کی وہ عظمت جو سابقین میں تھی۔ وہ زیادتئِ بیان کی وجہ سے کم ہو رہی ہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اچھے خواب باطن کی اچھائی کی علامت ہوتے ہیں۔ اچھے خواب اتقیا کو آتے ہیں۔ جو نتیجہ خیز بھی ہوتے ہیں۔ اور خوابوں کی تعبیر علمائے صالحین اور

عارفانِ باللہ ہی کر سکتے ہیں۔ جو شعائر اللہ کے پابند ہوتے ہیں۔

لہٰذا جب تک راہِ سلوک کو شریعتِ حقہ کے مطابق نہ بنایا جا سکے۔ اور علمائے صالحین کا تقرب نہ حاصل ہو سکے۔ اپنی خوابوں پر نہ ہی یقین کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی مظنون تعبیر پر اترانا چاہیئے۔

اکثر جاہل قسم کے غیر متشرع اور غیر متقی لوگ بڑی پائے کی خوابیں جو بڑے اولیائے متشرعین کے شایان شان ہوتی ہیں۔ بیان کرتے ہیں۔ اور پھر اس طرح اندھا دھند تعبیرات کرتے ہیں۔ کہ مارے شرم و ندامت کے جسمِ خاکی لرز اُٹھتا ہے۔

بعض لوگوں نے تو یہ رواج بنالیا ہے۔ کہ وہ طرح طرح کی خوابیں بیان کرتے ہیں۔ اور پھر اُن کی من گھڑت تعبیرات کرتے ہیں۔ جن خوابوں اور تعبیرات کو اگر کسی صالح عالمِ دین کے سامنے بیان کیا جائے۔ تو یقیناً وہ ایسے خوابوں کو کذب پر محمول کرے گا۔

بعض دفعہ نیک نیت جاہلوں کو بھی اعلیٰ خواب نظر آجاتے ہیں۔ مگر اُن کو عام طور پر اپنے خواب بیان کرنے کی اسی واسطے اجازت نہیں دی گئی۔ کہ وہ غلط تعبیرات سے توہم پرست ہو جائیں گے

ایسے لوگوں کو چاہیئے۔ کہ وہ اپنے علاقہ کے کسی صالح عالمِ دین کی طرف رجوع کریں۔ اور اپنے خوابوں کی تعبیر اُن سے حاصل کریں۔ وہ اگر مناسب سمجھیں گے۔ تو تعبیر دیں گے۔ ورنہ اُن کا سکوت ہی بہتر جواب ہوگا۔

بعض لوگ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ پُرانوار کے متعلق اس طرح عامیانہ خواب بیان کرتے ہیں۔ جس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمتِ خداداد کی اہانت ہوتی ہے۔

اہل اللہ کے نزدیک ایسا کرنے والے کبیرہ گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عامیانہ اہانت خدا کبھی گوارہ نہیں کر سکتا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی حیاتِ طیبہ میں اپنے خدائے برحق کی طرف سے تمام قسم کے توہماتِ باطلہ کی تردید کرنے اور پوری انسانیت کو دینِ فطرت کے مطابق ہدایت

دینے کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔

چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ تک راہبوں، کاہنوں، جوگیوں اور مختلف اختراعی عملیات وغیرہ کرنے والوں نے انسانیت میں توہم کو اِس قدر رواج عام دے رکھا تھا۔ کہ ایک غریب کی جھونپڑی سے لے کر ایوانِ شاہی تک اِن توہم پرستوں کا تصرف وتسلط تھا۔ اور یہ انسانی قلوب واذہان پر بھوت کی طرح چھاچکے تھے۔

پہلے نبیوں کی تعلیمات کو اِن توہم پرستوں نے کہانیوں کی صورت دے رکھی تھی۔ اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں اور کریمانہ شفقتوں نے اُن کے معجزات وخوارقات وغیرہ کو بھی اپنی توہم پرستی پر تعبیر کرانا شروع کر دیا تھا۔

سیدالکونین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسے غیر دینی توہمات کی دینِ حق کے ساتھ اسلامی دنیا سے ہمیشہ کے لئے بیخ کنی کر دی تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی الہامی خواب ایسا نہیں۔ جس کو الہام سے خارج سمجھا جائے۔ آپ کے اور جملہ انبیائے کرام کے خواب مِن قبیل وحی تھے۔ جن کے ذریعہ انسانی فطری حقوق کی حفاظت ہوتی رہی۔

انبیائے کرام کے خواب رویائے صادقہ کہلاتے ہیں۔ اور قطعی ہوتے ہیں۔ مگر اولیاء اللہ کے خواب رویا صالحہ توضرور ہوتے ہیں۔ مگر اُن پر قطعیت کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

فرمایا۔

جو مجہول الخیال لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دیدار کے متعلق اپنے خواب عامیانہ طور پر جہلا میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کو چاہیئے۔ کہ وہ ایسا خواب علمائے صالحین کے سامنے بیان کریں۔ تاکہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں اُس کی تعبیر دیں۔ اور اِس کے بعد جو نصیحت کریں۔ اُس پر عمل کرنا چاہیئے۔

اہل اللہ نے تاکید فرمائی ہے کہ علمائے معتبرین کے بغیر خواب کی تعبیر کسی سے نہیں

لینی چاہیئے۔

خواب بیان کرتے وقت بعض ایسے ذی شعور لوگ بھی مجالس میں موجود ہوتے ہیں۔ جو بار بار کاذبوں کی کذب بیانی سے اس قدر تنگ آچکے ہوتے ہیں۔ کہ وہ ایسے خوابوں وغیرہ کو سُننے کے متحمل ہی نہیں ہوتے۔ ایسے بیانات سے اُن کی سخت دلآزاری ہوتی ہے۔

آج کے مسلمان پر سب سے بڑا احسان اُسی مبلغ کا ہو سکتا ہے۔ جو ذاتی شرافت و نجابت کے قصائد اور رطب اللسانی سے درگذر کرتے ہُوئے صرف اللہ و رسول کی تعریف بیان کرے۔ اور احکاماتِ الٰہیہ کی روشنی اور سنتِ خیر الانام کی روشنی میں ایسے سادے اور واضح انداز میں عام فہم مسائلِ دینیہ بیان کرے کہ لوگ اُن مسائل کو سمجھ کر توہم پرستی سے بچتے ہُوئے دامنِ اسلام میں پناہ لے کر عافیتِ ایمان پائیں۔

خواب اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ مگر محض ظاہری بزرگی کے طالب اختراعی لوگ ہوتے ہیں۔ جو اختراعی خوابوں پر اُتر آتے ہیں۔

ایسی مصنوعی خیالی خوابوں والی ولایت کا دعوٰی کوئی زید بکر بھی کر سکتا ہے۔ مگر ولایتِ حقہ کے لئے قرآن و حدیث اور جمہور علمائے امت اور صلحائے امت نے جو شرائط عائد کی ہیں۔ اُن سے ذرہ بھر بھی انحراف اسلامی تقوٰی کے خلاف ہے۔

سولھواں باب

اھلِ حال
کو
علماء کی نگرانی میں رہنا چاہیئے

علمائے امت مختلف اندازِ فکر کے ساتھ توحید و رسالت اور کتاب و سنت کے ترجمان ہیں۔ اور اشاعتِ حق میں شدید ہیں۔ اُن کی سخت گیری کو ذریعۂ نجات سمجھنا چاہیئے۔

صاحبِ حال اگر صاحبِ ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اپنے حالاتِ سلوک میں علمائے ظاہر کی نگرانی میں رہنا چاہیئے۔ ورنہ بعض حالات کا دین کے خلاف سرزد ہونے پر اس کا حال عنداللہ بدحال ہو سکتا ہے۔

حال اُس وجدان و کیف و استغراق کا نام ہے۔ جو علیٰ منہاجِ سلوک فراوانیٔ محبت پر مرتب ہو کر صاحبِ سلوک کے سہو کو سُکر میں بدل دے۔

اگر سالکِ راہ کا سُکر اس حد تک پہنچ جائے۔ کہ نماز کا وقت بھی ضائع ہو جائے۔ تو سالکینِ کاملین کے نزدیک ایسا سُکر قابلِ مواخذہ ہے۔

کاملین کے نزدیک ایسے صاحبِ سُکر کو رجعت اِلیٰ اولیٰ کرنی چاہیئے۔

ورنہ وہ اپنے اِس تارکانہ حال پر بضد ہو کر اپنے غلط اور غیر متشرعانہ حال کے ساتھ ترک ارکان کو تعمیلات پر ترجیح دینے کا عادی ہو جائے گا۔ اور انجامِ کار نہ ہی تو وہ سالک راہ طریقت رہ سکے گا۔ اور نہ ہی مجذوبِ راہِ حقیقت۔

ہر عام و خاص کو علمائے صالحین کی نگرانی سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔

وہ صوفیاء جو علماء سے گریز کرتے ہیں۔ یہ گریز اُن کی اپنی روحانی کمزوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ علمائے امت محتسب ہوتے ہیں۔ طالبین راہِ حق اگر محتسبین سے اعراض کریں گے۔ تو پھر اُن کا احتساب کون کرے گا۔

احتساب کرنے کا حق تو عنداللہ علمائے امت کو پہنچتا ہے۔ کوئی مخلص سالکِ باللہ احتساب سے اجتناب نہیں کرسکتا۔

محبوب کی منزل کا مسافر راہِ محبوب کے راز معلوم کرنے کے لئے ہر کس و ناکس کی راہنمائی میں تسکین پاتا ہے۔ اور راہِ محبوب سے بھٹک جانے پر ہر قسم کی سخت سے سخت تنقید کو اپنے لئے موجبِ رحمت گردانتا ہے۔

اگر عالمِ مجاز کے طالبین بھی راہِ مجاز میں درِ نیاز تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی نرم و گرم آواز کو گراں نہیں سمجھتے۔

تو راہِ حقیقت پر چلنے والے طالبینِ حق اہلِ علم و دانش لوگوں کی راہنمائی کو بارِ گراں جانیں تو یقیناً وہ راہِ حق کے سالک نہیں ہو سکتے۔ بلکہ محض تلبیس کے طور پر وہ احوال کا تصنع کر لینے والے ہو سکتے ہیں۔

میں نے مختلف اولیاء امت کے تذکروں کی نصیحت پر عمل کرنے کی اللہ تعالےٰ سے امداد چاہی حتی الامکان میں نے اس راہ کو احتیاط سے اختیار کیا۔

اِس بیان کے ساتھ میں نے توہم پرستی کی جو نقشہ کشی کی۔ وہاں میں نے حقیقتِ تقویٰ پر شریعت کی روشنی میں کافی تجزیہ بھی کیا۔ تاکہ طالبین حق سلوک کی راہ میں گمراہی سے بچ کر اسلامی تقویٰ کی راہ اختیار کریں۔

یہ اللہ کا فضل و کرم ہے۔ جو طالبینِ حق کو ہادیوں کی صورت میں ہدایت کی طرف مائل کرتا رہتا ہے۔

بعض لوگ اپنا سچا خواب جس کی اُنہیں بلا معبر تنبیہاً تعبیر مل جاتی ہے۔ اور وہ اُس کی تعبیر کو جلد ہی پا لیتے ہیں۔ اور خواب کا نتیجہ پا لینے کے بعد بھی دوبارہ وہ اُس کو معبرین سے

پوچھتے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ اپنا پُرانا خواب جو سات آٹھ برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ اباجان کی خدمت میں چند برس بعد دوبارہ بیان کیا۔

تو آپ نے فرمایا۔

ہوسکتا ہے تمہیں ایسے نتیجہ خیز خواب بیان کرنے پر فخر ہوتا ہو۔

اگر تم نے اس خواب کی تعبیر نتیجتاً پالی تھی۔ تو صاف ظاہر ہے کہ تمہارے خواب کی تعبیر خدائے تعالےٰ نے بغیر معبر کے اُس کا نتیجہ تعبیراً تمہیں بتا دیا تھا۔

جب خدا اپنے فضل و کرم سے کسی راز کا نتیجہ ظاہر کر دے۔ تو اُس کے متعلق دوبارہ کسی غیر سے استفسار طلب کرنا عنایاتِ خداوندی کی توھین ہے۔

اِس نصیحت کا مطلب یہ تھا کہ بعض لوگ اپنے خوابوں کی تعبیر۔ از غیب نتیجتاً پا لیتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں اُنہیں شکرانہ ادا کرنا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے از غیب میرے خواب کو صادق فرما دیا۔ اور یقین کرے کہ خدا سے بہتر معبر اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

ایسے خواب دیکھنا اور تعبیرات کا مِل جانا کِسی کی ذاتی کرامت نہیں ہوتی۔ بلکہ فضلِ خداوندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ گمان کرنا بہتر ہوتا ہے۔ کہ جِس پر اللہ کا فضل و کرم ہے۔

وہ اپنے انسان ہونے کے بعد مسلمان ہونے کا شکرانہ ادا کرے۔

مسلمان کے لئے کلمۂ طیبہ ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ مسلمان کے لئے صرف ایک کلمۂ طیبہ کا نصیب میں آنا اتنی بڑی نعمت ہے۔ جِس کا شکرانہ کروڑہا برس تک بھی ادا نہیں کیا جاسکتا۔

تحیّاتِ لسانی، تحیّاتِ بدنی، اور تحیّاتِ مالی کے ساتھ اگر کِسی نے بکمال شکرانہ ادا کیا۔ تو ختمیٔ مرتبت سلطان العالمین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی ذات پاک ہے۔

اِس کے بعد ادائیگیٔ شکر کا مقام اہلِ بیت اطہار اور اصحابِ کرام کے نصیب میں آیا۔

بعد سِلسلہ وار متقدمین کا درجہ ہے۔

ہم متقدمین کے متقیانہ تشکر کی گردِ راہ بھی نہیں بن سکتے۔

بس عاجزی کے ساتھ اپنے پُرتقصیر ہونے کا اعتراف کرنے میں ہی سالکین حقیقت کی عافیت ہے۔ کہیں بھول کر بھی کوئی سالک دعوائے عُجب کر بیٹھے۔ توظلماتِ نفسانی، اور ظلماتِ دنیوی اُس پر اُمڈ آتی ہیں۔ پھر اگر تائب نہ ہو۔ تو یہ اندھیرے اُس کے باطن پر مسلط ہو جاتے ہیں۔

اہل اللہ کی چند اقسام ہوتی ہیں۔

اُن کے درجات کا تعین بہرطور اسلامی تقویٰ پر ہی اُنہیں اہل اللہ کا مرتبہ دیتا ہے

مگر اُس کے بعد اُن کی نسبتِ سلوک کے مطابق اللہ تعالےٰ اُنہیں کسی خاص شعبۂ زندگی کی اصلاح کے لئے مامور کرتا ہے۔

ہر ولی اللہ کی نسبتِ سلوک کسی نبی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔ یا خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی ایک خلیفہ کے مزاجِ سالکانہ کے ساتھ اُن کی نسبتِ سلوک متعلق ہوتی ہے۔ یا اہلِ بیت اطہار سے نسبتِ سلوک رکھنے والے ہوتے ہیں۔

انبیارِ کرام میں بعض بالکل نسبتِ عشق کے حاملین تھے۔ بعض جمالی، بعض معتدل بعض بالکل عاجزانہ نسبتِ عشق پر راہ سلوک بالنبوت طے کرنے والے تھے۔

مگر حضور سرورِ کون ومکان صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم مجموعۂ صفاتِ انبیار ومرسلین تھے۔ آپ کا جلال وجمال سنت اللہ کا مظہر اور دینِ فطرت کے مطابق اعتدال پر تھا۔ آپ کے جلال کا اظہار جلالِ بندگی کی جمالیاتی معیت میں اور جمال کا اظہار بندگی کی جمالیاتی معیّت میں اور حِلم کا اظہار جلال وجمال دونوں کی معیت میں ہوتا تھا۔

آپ کا جلال وجمال اور حلم وعاجزی تمام مظہرِ بندگی تھے۔ آپ کا جلال جلالِ الٰہی کے تابع اور آپ کا حلم حلمِ خداوندی کے تابع تھا۔

مگر آپ کی عاجزی آپ کی اُن تمام صفات کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے - اور ہمہ صفاتِ ذاتیہ پیکرِ عبودیت ہو جاتے -

اہل اللہ میں جن کی نسبت رسولی ہو - اُن کا مرتبہ سب ولیوں پر تفوق لے جاتا ہے - وہ متخلق باخلاقِ رسول ہو کر سنتِ نبویہ کی پوری اطاعت کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی بندگی کرتے اور اُس کی مخلوقات کے حقوق کی ادائیگی کرتے ہیں - اور اسوۂ حسنہ ہی اُن کا سلوک ہوتا ہے -

ایسی اطاعت میں صحیح معنوں میں اسلامی طریقت بنتی ہے -

دوسرے درجے کے وہ اہل اللہ ہیں - جو کسی نبی کی جلالی وجمالی نسبتِ عشق سے متعلق ہو کر نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے امتی ہونے کا شرف پائیں - اور سنتِ خیر الانام کی بجا آوری کریں - اور پیروی سنتِ رسول کو ہی ذریعۂ سلوک بنا کر روحانی ارتقاء حاصل کریں -

اِس قسم کے سالک عالمِ امر سے متعلق ہو کر عالمِ خلق میں اپنے اعمال آسمانی ہدایت کے مطابق ترتیب دیتے ہیں - اور اسلام کو آخری ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں -

تیسرے درجے کے وہ اولیاء اللہ ہیں - جو علمائے ظواہر و علمائے بواطن کی صورت میں اللہ تعالےٰ کی بندگی اور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابۂ کرام کی اطاعت کرنے کی عادت رکھتے ہوں - اِن کی نسبتِ عشق منقسم ہوتی ہے -

مگر یہ لوگ اطاعت شعار ہوتے ہیں - انسانی آبادیوں میں اسلام کا غلغلہ اِنہی نفوسِ قدسیہ کے ذریعہ بپا ہوتا ہے - اور چمنِ انسانی میں یہی لوگ اللہ تعالےٰ کے ذکر و فکر اور نعتِ مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام - اور تحریر و تقریر کے ساتھ تبلیغِ دین کے فرائض انجام دیتے ہیں -

اور گلستانِ اسلام کی طوطیانِ خوش نوا یہی لوگ ہیں - جن سے چمنِ اسلام ہمیشہ آباد رہتا ہے - اُن کی آوازِ حق لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتی ہے -

نیز لوگوں کو راہِ اسلام پر تازہ دم رکھتی ہے - اور اُن کی ندائے حق اسلام کی راہیں

انسانیت کے لئے ہموار کرتی رہتی ہے۔

یہ لوگ اعلانیہ جاہد فی سبیل اللہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دین کی راہ میں ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

آگے اِن کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں۔

ایک صاحبانِ جلال، ایک صاحبانِ جمال، ایک صاحبانِ حلم و تواضع، ایک صاحبانِ عجز و انکسار۔

صاحبانِ جلال علماء و سالکین سخت گیر ہوتے ہیں۔ اور اپنی جلالتِ عارفانہ کو عدل و انصاف پر صرف کرتے ہیں۔ اور صاحبانِ جمال بے حد متبسم اور صلہ رحمی کرنے والے۔ عفو و درگذر کرنے والے ہوتے ہیں۔

اِس جمالی ذوقِ سالکانہ کو راہِ حق پر عبادات و معاملات کے ساتھ جاری رکھتے ہیں۔

یہ لوگ بڑی روکھی طبائع کو بھی مائلِ باسلام کرنے کی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ھیں۔

ان کا متبسمانہ ترحم اہلِ جلال کے مقابل ایسا ہوتا ہے۔ جیسے غروبِ آفتاب کے بعد بر و بحر پر چاند کی چاندنی اپنے نتیجہ خیز اثرات مرتب کرتی ہے۔ اور کونپلیں پھل پھول اور اثمار وغیرہ اُس کی نورانیت سے اثر پذیر ہو کر میٹھے میٹھے سمان کے ساتھ نمود و نمائش پاتے اور رنگ و روپ حاصل کرتے ہیں۔

چاند کی جمالی چاندنی سے اصلاب و ارحام میں خون اور نُدغے حالات کے مطابق اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور بحور تموّج پاتے ہیں۔

اہلِ جمال علمائے صالحین اور اولیائے صالحین انسانوں کے جہانِ انفس میں بالکل اسی طرح اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جس سے انسانی باطنی فکری صلاحیتیں انسانی باطن سے نمود پا کر عقل، دل اور نگاہ پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ لوگ اُن کے اس حال کے اثر کو ایسے قبول کرتے ہیں۔ جیسے خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔

یقیناً اہل اللہ کی مختلف سالکانہ نسبتیں اپنے مقربین کو اسلامی بندگی میں رنگ دیتی ہیں۔

اہلِ حلم و رضا سالکین کی حلیمانہ نسبتِ عشق حلم نبیؐ پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام، اہلِ بیت اطہار اور صحابہ کرام کے حلیمانہ طرزِ سلوک سے متعلق ہو کر عاجزانہ بندگی کے ساتھ منزلِ سلوک پر چلتی ہے۔ پھر وہ اِس قسم کی صلاحیتوں کو تبلیغِ دین کے لئے صرف کرتے ہیں۔

یہ لوگ بڑے صابرین و شاکرین اور منتجزین ہوتے ہیں۔ ایسے حلیم قسم کے سالک لوگوں کی طبائع پر کسی طرح گراں نہیں گذرتے۔

رات دِن ذکر و فکر میں گذارتے اور لوگوں سے حسنِ مروت سے پیش آتے ہیں۔ بڑے خوش گفتا اور خوش کردار ہوتے ہیں۔

اہلِ عجز سالکان راہ حقیقت کی نسبت عشق آخرالزمان علیہ التحیۃ والسلام کی بندگی سے والہانہ وابستگی رکھتی ہے۔ وہ ہر قسم کی انانیتِ ذاتی سے گریز کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرامات کو مخفی رکھنے میں زیادہ تسکین پاتے ہیں۔

مگر خدا اُن کی کرامات کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ یہ لوگ اپنی طرف سے مخفی و مستور رہنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

مگر خداوندِ ذوالجلال اُن کی مخلصانہ اور معترفانہ حقیقتوں کو اظہار کے لئے بار بار کرتا رہتا ہے۔

یہ لوگ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ کو اپنا ورد زبان رکھتے ہیں۔

ایسے سالکوں نے یہ اعتراف اسلامی تعلیمات سے اخذ کیا اور معصوم الخطا انبیاء کے معصومانہ اعتراف سے لیا۔ وہ اسلام کے اس فیصلہ پر یقین رکھتے ہوئے کہ انبیاء معصوم عن الخطا ہیں۔

مگر اولیاء اللہ کبھی معصوم عنِ الخطا نہیں ہو سکتے۔

اگرچہ اولیاء اللہ کو اللہ تعالےٰ کبیرہ گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ مگر اُن کا اعتراف

اتنا بلند ہوتا ہے ۔کہ ایسے عاجزینِ بندگانِ خدا حسنات الابرار سیئت المقربین کے مصداق ہوجاتے ہیں ۔

اور حصولِ تقرب پر اُن کا اعتراف اِس درجہ مقامِ کمال حاصل کرلیتا ہے ۔کہ وہ اللہ تعالےٰ کے احسانات کے مقابلے میں اپنی نیکیوں کو بھول جاتے ہیں ۔اور اُن کو اپنی نیکیاں خدا کی نیکیوں کے سامنے اس طرح معلوم ہوتی ہیں ۔

جس طرح سورج کے سامنے موم کا چراغ ہو ۔یہ عاجزین سالکینِ طریقت کسی غیر دینی قول وعمل سے حتی المقدور اجتناب کرتے ہیں ۔

مگر پھر معاً خوفِ انجام سامنے آجاتا ہے ۔اور رحمتِ خداوند ذوالجلال اور اُس کی غفرانیت یاد آجاتی ہے ۔اور لرزہ براندام ہوکر اس طرح اعتراف کرتے ہیں ۔

اَسْتَغْفِرُاللهِ الْعَظِيْم وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ ۔

اے اللہ میں اپنے ایسے گناہوں کی بھی توبہ کرتا ہوں ۔جو ضمیراً بھی کسی خرابی کے مرتکب ہُوئے ہوں ۔ اے اللہ میں سچی توبہ کے ساتھ تیری طرف لوٹتا ہوں ۔

اے اللہ مجھے کیا خبر کہ کون انجام کار بخشش پائے گا ۔ اے اللہ تیری رحمت وسیع ہے اور تیری ذات اپنی رحمت سے غفارالذنوب ہے ۔

اے اللہ تو بڑے سے بڑے گناہ گاروں کو بخشنے پر قادر ہے ۔ اور بڑے سے بڑے مدعیانِ ولایت کو بلعمِ باہور کی طرح محرومِ ولایت کرنے پر بھی قادر ہے ۔

اے اللہ تو حضرت لوط علیہ السلام کی زوجہ کو جہنمی بنانے اور زوجۂ فرعون کو جنتی بنانے پر قادر ہے ۔

اے اللہ ہم اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں سے توبہ کرتے ہیں ۔ اے اللہ تو ہماری توبہ قبول فرما ۔اے اللہ ہمیں گناہوں سے دور رکھ ۔

اور لوگوں سے بجائے اجتناب کے حسنِ سلوک کے ساتھ دعوتِ حق دینے کی توفیق عطا فرما ۔

اے اللہ تو ہماری ہر حال مدد فرما ۔ تاکہ ہم خود بھی گناہوں سے بچیں ۔ اور لوگوں

کو بھی بچائیں ۔

اِس قسم کے علماء و فقرائے صالحین کی تبلیغ بڑی کامیاب رہی ہے۔ یہ لوگ کِسی کو بَدُدعا وغیرہ کی دھمکی نہیں دیتے ۔ اور نہ ہی خشمگیں ہوتے ہیں ۔

درحقیقت یہ لوگ انسانیت کے لئے نورانی وبرھانی تسکین ہوتے ہیں۔ یہ لوگ محسنینِ اُمّت ہیں ۔

سترھواں باب

پیشنگوئی والد بزرگوار

والد بزرگوار نے فرمایا ۔

اِسلامی تبلیغ ہمیشہ علمائے ظواہر اور علمائے بواطن کی مرہونِ صالحیت رہی ۔

علماء وصوفیاء میں رقابت اور سِلسلۂ رقابت کا باعث خارجی قسم کے بے دین لوگ ہُوئے ہیں ۔ جنہوں نے علماء وصوفیاء کے رنگ میں جامۂ سالوس زیبِ تن کیا ۔ اور غلط تاویلات کے ساتھ عالمانہ کردار ادا کر کے صوفیاء میں علماء کے خلاف تنفر آمیز لہجوں کے ساتھ بد دلی پھیلائی ۔

اور بعض نے اولیاء اللہ کے لبادہ میں مکروہ قسم کے صوفیانہ کردار سے اسلامی علمائے حق کے دِلوں میں تصوف کے خلاف مصنوعی اور غلط کہانیوں کے ساتھ بد دلی پھیلائی ۔ اِس باہمی تنفر میں غیر ملکی بے دینوں کا ہاتھ بھی کارفرما رہا ۔

بعض تن آسان حکمرانوں نے بھی اِس تنفر میں حصّہ لیا ۔ اور اپنی نفسانی سیاسیات کی تکمیل کے لئے اِن صالحین میں تفریق پیدا کرنے کے لئے سیاسی کوششیں کیں ۔

بعض عام مفکرین نے جو پابندِ نفسیات تھے ۔ اُنہوں نے بھی اپنی تحریر و تقریر کو باہمی تنفر پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا ۔

مگر ایسے لوگوں کو کیا خبر تھی ۔ کہ اِن لوگوں کی باہمی چپقلش بعد میں ایک اجتہادی صورت بن کر سامنے آجائے گی ۔ اور اِس طرح وہ تاریک تر مسائل جن کو حل نہیں کیا جاسکتا تھا

وہ بھی حل ہو کر سامنے آ جائیں گے۔

اِس قسم کی تنفر آمیز تاویلات کو تیرھویں صدی ہجری کے نصف حصّہ سے اُبھرنے کا نسبتاً زیادہ موقعہ مِلا۔ اور مسلمانوں پر خارجی بے دینوں کا دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا۔

انگریز کی دو صد سالہ نفسیاتی حکمتِ عملی نے بھی صفِ اسلام میں کافی افتراق پیدا کیا اور یہ افتراق جہاں ہمارے باہمی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں مصروف تھا۔ وہاں اُس نے ہمارے نیم خواندہ مسلمانوں کے ذریعہ ہماری دینی اصطلاحات کو بھی پامال کیا۔

اور ہماری اسلامی تہذیب و تمدّن کے نقوش کو بھی مٹانے کی مسلسل کوشش کی۔

اور اِن سرگرمیوں کو انگریز نے امکانی حیلہ سازیوں کے ساتھ جاری رکھا۔

ہماری اسلامی معیشت کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔

مسلمانوں میں سے ہی ایسے ضعیف الایمان لوگوں کا انتخاب کیا۔ جِن کے ذریعہ اسلام کے بنیادی حقائق کو پامال کرنے کی کوشش جاری رکھی گئی۔

قرآن مجید کے مجموعۂ صادقہ پر بھی اعتراضات کرائے گئے۔ احادیثِ شریفہ کی صداقت پر بھی ملّتِ اسلامیہ کے بعض ضعیف الایمان لوگوں کے ذریعہ مذموم حملے کرائے گئے۔ اور ایسے لوگوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی گئی۔

ختمِ نبوت کے فلسفۂ ہمہ گیر اور لافانی نظریۂ اسلام پر بھی اعلانیہ اور عملاً تقابلی حملے کرائے گئے۔ اور ظلی و بروزی نبوت کا مماثلی تقابل کرایا گیا۔

اور ایک بے وزن اور غیر معقول دلیل کے ساتھ ایک ہی زبان کو مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات پر بولنے کے لئے تیار کیا گیا۔

اور اِسی ایک زبان سے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرایا گیا۔

جس زبان سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا۔ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی زبان تھی۔ جس نے اپنی زبان اور قلم سے ایک دن جس نظریہ کا انکار کیا۔ دوسرے دن نہایت چابکدستی کے ساتھ تلبیساً اُس کا اقرار بھی کر لیا۔

مرزا غلام احمد کی تضاد بیانی اُن کی مختلف تصنیفات کی صورت میں موجود ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے جملہ انکار و اقرار اسلام کے نام سے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے سوچے سمجھے ہُوئے طور طریقے تھے۔ جو انگریز کی ایما پر ظہور پذیر ہُوئے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جس زبان و قلم سے مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات ثابت کی اُس کا مدعا مسلمانانِ عالم کے اِس عقیدہ کو پامال کرنا مقصود تھا۔ جس عقیدہ کا تعلق احادیثِ شریفہ کی روشنی میں مسیح الرجال کے نزول کے ساتھ ہلاکتِ دجال اور مہدئ موعود علیہ السلام کی آمد کے انتظار سے متعلق تھا۔

اور احادیثِ شریفہ میں مہدی موعود علیہ السلام کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ اور مسیح الرجال کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

جمہورِ علمائے امت اور اجماعِ امت کا بھی اِن بشارتوں پر یقین کامل تھا۔ دینِ حنیف کے پیروکاروں کی برصغیر میں کثرت تھی۔

اِس کثرتِ رائے کی موجودگی میں روایاتِ اسلامیہ پر اعتقادی و عملی پابندی انگریزی متعصبانہ اور کینہ پرور سیاست کی راہ میں سختی کے ساتھ حائل تھی۔ عاجلاً اِن معتقدات سے رائے عامہ اسلامیہ میں تبدّل و تغیّر ناقابلِ عمل تھا۔

چنانچہ قلیل المیعاد منصوبہ کو انگریز نے طویل المیعاد منصوبہ کے ساتھ بدل دیا۔ اور برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنی زمین کو ہی اپنے اِس منصوبہ کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے تجربہ گاہ بنالیا۔ اور مرزا غلام احمد جیسی متضاد الخیال شخصیت کے قلم و زبان کے ذریعہ لفظِ ظلیت و بروزیت کے ساتھ نبوت کا بیج بو دیا۔

اِس بیج بونے کے لئے بے دین قسم کے ذہن جو انگریز کے معلوم ذہن تھے۔ انہیں ہموار کیا گیا۔ اور زرِ کثیر کے صرف کے ساتھ اُن ذہنوں پر نفسیاتی اور سیاسی دباؤ ڈالے گئے۔ ایسے لالچی ذہنوں نے جن کا کوئی دین و ایمان نہ تھا۔ مرزا غلام احمد کی جماعتِ قادیانہ میں شمولیت اختیار کی۔

اور انگریز نے اِس جماعت پر زرِ کثیر خرچ کیا۔ جس سے مرزائیت کو سرِ بازار اعلانیہ

اندھا دھند خلافِ اسلام اشاعت کرنے کا موقعہ کھلے بندوں مِل گیا۔ اور لاتعداد کتابچوں کی صورت میں مختلف لٹریچر سامنے آئے۔

اخبارات، رسالہ جات وغیرہ کے لئے اِس جماعت کی کُھلے بندوں تائید و اعانت ہُوئی۔ جس پر علی الاعلان مرزا غلام احمد اور اُس کی جماعت نے ختمِ نبوت کے خلاف اپنے منصوبہ پر مسلسل عمل کرنا شروع کر دیا۔ اپنی کُھلی گمراہی پر سوادِ اعظم کی موجودگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی چلنا ناممکن العمل تھا۔

مگر مسلمانانِ برِصغیر کی دو صد سالہ غلامی اِس نہایت نازک دور میں آڑے آئی۔ اِس منصوبہ کے ردِّ عمل کے لئے جہاں اور جس جگہ بھی علمائے ربّانی نے سر اُٹھایا۔ انگریزی حکمران طاقت نے نقضِ امن کا نام دے کر راہ روک دی۔

حق پر چلنے والوں کو روکنے کا رواج بھی اِسی زمانہ میں انگریز سے شروع ہُوا۔ اور بد قسمتی سے اسی طریقہ کو جنگِ آزادی کے زمانہ تک اسی قانون کے دھیمے مگر خطرناک اور مہلک لفظ نقضِ امن کے قانونی نام سے ہی نافذ العمل رکھا گیا۔

اِسی دستورِ انگریز کے مطابق اِس دوران تک بھی باغیانِ اسلام کے ردِّ عمل کے لئے مذہبِ اسلام کے تحفظ و بقاء اور ارتداد کے خلاف صالحانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لئے اسی نقضِ امن کے لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔

علمائے ربانی کے ہر تقریری اور تحریری ردِ عمل کو انگریز کے اسی قانونی لفظ نقضِ امن کو ہی استعمال میں لایا گیا۔

جنگِ آزادی من حیث القوم نہیں۔ بلکہ من حیث المذہب لڑی جا رہی تھی۔ جس کا منشار برِصغیر کی دو مذہبی قوموں کی آزادی تھا۔

ایک قوم کا مذہب اسلام تھا۔ اور دوسری قوم کا مذہب ہندویت تھا۔

یہ دونوں قومیں متحدہ طور پر انگریز کے خلاف جنگِ آزادی لڑ رہی تھیں۔ دونوں کی آزادی کا منشار قومی مذہبی روایات کی بقار و سلامتی تھا۔

مسلمان حصولِ آزادی کے ساتھ اسلامی نظامِ جمہوریت چاہتے تھے۔ اور ہندو

اپنے مذہب کے مطابق جمہوری حکومت چاہتا تھا۔

چنانچہ اِن دونوں قوموں کے جذباتِ باطن ایک مرحلہ پر نکھر کر بین الاقوام کے سامنے آ گئے۔ جب ہندو قوم کے متعلق مسلمان راہنماؤں کو اشتباہ ہُوا۔ اور وہ یقین کی صورت اختیار کر گیا کہ ہندو قوم مسلمانوں کو اپنی مذہبی عصبیت کی بھینٹ چڑھا دے گی۔

تو ایسے عالم میں بلیغ النظر سیاسی قائدینِ اسلام اور راسخ العقیدہ علمائے اسلام نے جنگِ آزادی کا دھانہ ایک جداگانہ ریاستِ اسلامیہ کے مطالبہ کے ساتھ موڑ دیا۔

اِس طرح مسلمانانِ برِصغیر کی جنگِ آزادی ایک الگ ریاستِ پاکستان کے حصول کے لئے اسلامی راہ پر چل پڑی۔ کہ اِس طرح ملّتِ اسلامیہ کو اسلام کے ساتھ اپنی عظمتِ رفتہ پھر میسّر آئے گی۔ اور مشرق سے اعلائے کلمۃ الحق بلند ہو گا۔

تجزیہ۔

اِس جذبۂ اسلام کی تعریف اُدبار ملّت فاضلینِ دین، مشائخِ اسلام، ملک کے شعراء نے بڑے دردمندانہ انداز میں کی۔

بوجود اس کے کہ جنگِ آزادی من حیث المذہب لڑی جا رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ارتداد کا سلسلہ بھی سیاسی رنگ ڈھنگ میں ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ دوش بدوش قدم سے قدم ملا کر میدانِ آزادی کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

جنگِ آزادی کے بعد ریاستِ پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور مرتدین بھی ساتھ ساتھ شاملِ ریاست ہو کر شریکِ ملّت ہو گئے۔

اگر مرتدین اسی طرح ملّتِ اسلامیہ میں مخلوط رہے۔ تو ایک بڑے پھیلاؤ کے ساتھ وہ یقیناً الگ ریاست کے حصول پر اُتر سکتے ہیں۔

بصورتِ دیگر اپنے آپ کو شریکِ مملکت بنا کر ریاست کے شہری بن جائیں گے۔

اگر بدقسمتی سے انگریز کی طرزِ حکومت بھی جاری رہی تو انہیں کھلے بندوں تاویلات کے پھندے ڈالنے کا موقعہ بھی ملتا رہے گا۔

ابتدائے ہندو مسلم کی متحدہ آواز کے ساتھ جنگِ آزادی میں اہلِ ارتداد گم ہو کر اپنے پاؤں مضبوط کرنے میں مصروف رہے۔ اور جب دونوں قومیں آزاد ہو گئیں۔ اور مسلمان دو ریاستوں میں تقسیم ہو کر بٹ گئے۔

تو اِس اندازِ تقسیم میں اہلِ ارتداد دونوں ریاستوں میں اسلام کے نام پر اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگ گئے۔ اور کلیدی اسامیوں پر بھی تسلّط جمانے لگے۔

چونکہ وہ اپنی اقلیّت کے تحفظ کے لئے اِس سے زیادہ مؤثر طریقہ نہ پانے کی بنا پر مختلف شعبہ جات میں بٹ گئے اور کلیدی مواضع کو پُر کرنے کی منظم سعی جاری کر دی۔

جو ایک مدّت کے بعد اسلامی ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے ایک داخلی وبال یا آفتِ جان بھی بن سکتی ہے۔

اگر انگریز کے اِس مروجہ قانون کے سہاروں پر پاکستان حسبِ سابق چلتا رہا۔ اور مذہب کے لئے حفظِ ماتقدم پر بھی لفظِ نقصِ امن کا سلسلہ جاری رکھا۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ نئی پود ارتداد کا شکار نہ ہو جائے۔

اسلامی دنیا میں۔

فتنۂ انکارِ حدیث اور فتنۂ انکارِ ختمِ نبوت سے زیادہ کوئی دوسرا فتنہ نہیں ہو سکتا۔

اگر انگریز کا یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ تو ریاستِ پاکستان کے مسلمان بار بار ارتداد کا نشانہ بنتے رہیں گے۔

اِن کو بے روزگار کیا جائے گا۔ اِن کے تعلیمی میدان اسلامی نصابِ کامل سے بار بار محروم ہوتے رہیں گے۔ اور قوم کو بنیادی علوم کے فلسفہ سے بے بہرہ رکھا جائے گا۔

اِس طرح مسلمانانِ پاکستان کی رائے عامہ غریب مفلوک الحال مجبور و

بے بس کی طرح جہاں بھی پیٹ پالنے کے ذرائع پائے گی۔ وہیں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے گی۔

اگر ارتداد نے ملک میں قلمدانِ حکومت پر بھی تصرف حاصل کر لیا۔ تو یہ اسلامی اقتدار کے علاوہ ریاست کے استحکام کے لئے مرگِ مفاجات ہوگی۔

آزادی کے بعد تقسیم ملکی کے زمانوں میں جب دونوں ملک اپنی اپنی مصروفیات میں منہمک ہو گئے۔ تو ارتداد کو اپنی بنائیں ڈالنے کا موقع مل گیا۔

ملتِ اسلامیہ کے سیاسی شعور حاصل کرنے کی مدت تک انگریزی طرزِ زندگی اختیار کرنے والے لوگ ہی برسرِ عزت رہے۔

جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ غیر دینی شعور رکھنے والے عزت و اقتدار کے سائے میں ارتداد کو پھلنے پھولنے کا وسیع وقت مل سکے گا۔

(پیشنگوئی)

اگر ان ارتدادی قوتوں کا سدِ باب نہ ہوا۔ تو آئندہ زمانۂ قریب تک ہی فتنۂ انکارِ حدیث اور فتنۂ ختمِ نبوت مذکورہ سہاروں پر تقویت پا کر حکومت در حکومت کے منصوبہ پر کار بند دستگاہ حاصل کرے گا۔ اور برسرِ ممبر کتاب وسنت کی توہین ہوگی۔

اگرچہ علمائے ربانی اس دور میں حکمتِ اسلامیہ کے پیشِ نظر کچھ مدت خاموش رہے۔ اور ارتداد کو یہ گمان ہو گیا۔ کہ نشاطِ ثانیہ اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ کہ وہ جو چاہیں گے کر سکیں گے۔

مگر اس دوران تک علمائے ربانی اپنے دینی افکار و عزائم کو درست و آراستہ کر لیں گے۔

اور فہرست اول میں اُن کی آواز متحدہ طور پر ارتداد کے خلاف بلند ہو جائے گی۔ اور علماء جب دیکھیں گے۔ کہ صرف سیاسی سہاروں پر ہی اقتدار کی معیت میں ارتداد آگے بڑھ رہا ہے۔

تو ایسی ناگزیر صورتِ حال میں علماء سیاستِ ملکی میں بھی حصہ دار بننا

شروع ہو جائیں گے۔

اُن کی یہ تبدیلی فیصلۂ خداوندی ہوگا۔ اِس طرح جس میدان میں خفی وجلی طور پر اہلِ ارتداد پہنچیں گے۔ وہاں علمائے ربانی بھی پہنچ جائیں گے۔

اور ہر مجلس ہر شعبۂ زندگی میں ذیلی اور بالائی ایوانوں میں علمائے ربانی رسائی پاکر ارتداد کا سیاسی اور مذہبی طور پر ردِ عمل کریں گے۔

اِس ردِ عمل سے بچنے کے لئے اہلِ ارتداد دوبارہ علماء میں تفرقہ سازی کا جال پھیلائیں گے۔ اِس طرح فسادات کا احتمال بھی ہوگا۔

مگر تین چار المناکیوں کے بعد ملتِ اسلامیہ کے شعور سنبھل جائیں گے۔ اور ارتداد پسندوں میں زوال شروع ہو جائے گا۔ اور اسلامی اقدار کی پھر حفاظت ہونی شروع ہو جائے گی۔

اِس دوران ملکی سیاست میں بڑی تبدیلیاں آئیں گی۔ اور یہ تبدیلیاں سہل پسندانہ حالات کے لئے بروئے کار آئیں گی۔

ریاست کی حفاظت اللہ تعالےٰ کریں گے۔ کتاب وسنت کی آوازیں بلند ہوتی رہیں گی۔ تن آسان لوگ دین کے خلاف نئی پود کو برانگیختہ کریں گے۔

ہر نئی نسل ایک نئے ذہنی زاویۂ نگاہ کے ساتھ سامنے آئے گی۔ اور نماز روزہ حج وزکوٰۃ کو اہلِ ارتداد اِس نئی پود کے سامنے اپنے مخترع دلائل کے ساتھ بارِ گراں ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اِن احکامات کو زائدہ قرار دیں گے۔

اہلِ ارتداد سہل پسندانہ تصنیفات کے ذریعہ دین کو سہل تر بنانے کی سعی بھی کریں گے۔ اور تکلفاتِ دینیہ پر تکلفاتِ مادیہ کو ترجیح دیں گے۔

یہ کہ دُنیا کے کام کاج کرو۔ ترقی پاؤ۔ اور اقوامِ عالم کے دوش بدوش چلو۔ اور تکلفاتِ دینیہ کو دنیوی زندگی میں سنگِ گراں ثابت کرنے کی

کوشش کریں گے۔

یہ وہ دور ہوگا۔ جس میں علمائے ربّانی کی راہنمائی کے لئے جرّی وبہادر اور نڈر علمائے ربّانی میدانِ عمل میں آئیں گے۔ اور کچھ سیاسی راہنما بھی اُن کے ہم خیال ہو کر اُن کا ساتھ دیں گے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی اُن کے ہمنوا ہو جائیں گے۔

قدرت اپنی حکمتِ بالغہ سے مسلمانوں کو اسلامی احکامات کی تعمیل میں نشاطِ ثانیہ کا موقعہ فراہم کرے گی۔

یہ وقت ارتداد کی خفیہ سازشوں کا زمانہ ہو گا۔ اور علمائے ربّانی بڑی بڑی آزمائشوں سے دوچار ہوں گے۔ پُر امن انقلاب آئے گا۔ اور کچھ مدّت سکون رہے گا۔ اور اِس سکون میں پھر شورش پسندانہ تحریک پیدا ہوگی۔ یہ شورش دین، ملک اور عوام کو راہِ راست دینے کے لئے پھر راہ ہموار کرے گی۔

اگر علماء کی صفوں میں اتحاد رہا۔ تو وہ فوز پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ورنہ دین کی گتھیاں سُلجھانے کے لئے پھر ایک عرصہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔

ایک مسلمان مردِ بینا خود آگاہ اور خدا آگاہ کو اللہ کے فضل وکرم سے سامنے آنے کا موقعہ دیا جائے گا۔

اِس دوران اسلام کی وہ اصطلاحات، جو ارتداد کے ذریعہ لُوٹی جا چکی تھیں ملتِ اسلامیہ میں پھر لوٹ آئیں گی۔

علماء ومشائخ کا اتحاد ہوگا۔ یہ عملاً تلافیٔ مافات کے خواستگار ہوں گے۔ کام زیادہ کریں گے۔ درس وتدریس میں منہمک رہیں گے۔ ہر شعبۂ زندگی تک رسائی پالیں گے خدا کی تائید اُن کے شاملِ حال ہوگی۔

اور پھر ملت کے خورد وکلاں کی زبان پر نعرۂ اسلام آجائے گا۔ حکمران اور رؤسائے

قوم بھی نماز روزہ حج و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں گے۔

کچھ علمار جو افراط و تفریط کا شکار ہو رہے تھے۔ حالات اُن کو بھی اعتدال پر لے آئیں گے۔

اِس دوران علمار و مشائخ کے اتحاد کی اتنی اشد ضرورت ہوگی جتنی شاید کبھی بھی درپیش نہ آئی ہو۔ اِس دوران علمائے صالحین قطعی طور پر غفلت شعاری سے الگ ہو کر اتحادِ اسلامی کے لئے سعیٔ پیہم کرنے میں مشغول و منہمک ہو جائیں گے۔ اگرچہ کمزور اور حریص قسم کے مصنوعی علمار اُن کے آڑے آئیں گے۔ مگر ظفر مندی علمائے حق کے ساتھ رہے گی۔

اٹھارہواں باب

سُورۂ فاتحہ کے ساتھ مشاہدات

گذشتہ باب کے اذکار و نصائح سے قبل ۱۹۳۴ء کی یکم جنوری بوقتِ صبح بعد از نماز والدِ بزرگوار نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اماں جان بھی قریب ہی صبح کے چائے کے اہتمام میں مصروف تھیں۔

حضرت والد بزرگوار نے فرمایا۔

بیٹا! کشف و کرامات کے بارے میں تمہارا عقیدہ کس حد تک ہے۔ کیا تم کشف و کرامات کے قائل ہو؟۔

مَیں نے عرض کی کہ مجھے اِن حالات تک رسائی نہیں۔

البتہ اولیائے صالحین کے کشف و کرامات پر میرا عقیدہ ہے۔ کہ وہ بر بنائے تقویٰ بفضلِ اللہ صاحبِ کشف و کرامات ہوتے ہیں۔

میرے جواب کے بعد آپ نے ضحاک فرمایا۔ اور متبسمانہ لہجہ میں چائے نوش فرماتے ہُوئے فرمایا۔

کہ کرامات تین ہیں۔ اُن میں سے دو قطعی ہیں۔ اور تیسری کرامت اِن دو قطعی کرامات کے ذریعہ ہی منتقیانِ اُمت سے سرزد ہوتی ہیں۔

پہلی کرامات جو جملہ کرامات کا منبع و مصدر ہیں۔ وہ کراماتِ ربّ العالمین ہیں۔ جن کو قدرتِ الٰہی کہا جاتا ہے۔ اور مظاہرات عالمین و مافیہم سب کی سب اللہ تعالےٰ کی قدرتِ کریمانہ کا مظہر ہیں۔ یہ قدرت کے کراماتِ قطعیہ ہیں۔ جن میں شک نہیں

لایا جا سکتا۔

دوسری کرامات کرامات انبیاء و مرسلین ہیں۔ جن کو اصطلاحِ شریعت میں معجزات کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کرامات بصورتِ معجزات خوارقاتِ انبیاء کہلاتے ہیں۔ اور یہ بھی قطعی ہوتی ہیں۔

چونکہ اِن کے ذریعہ اللہ تعالےٰ اپنے انبیاء و مرسلین کی تصدیق چاہتے ہیں۔

تیسری کرامات کراماتِ اولیاء اللہ ہیں۔ جو شریعتِ اسلام کے احکامات کی بجا آوری میں اولیاء اللہ کو بفضل اللہ میسر آتی ہیں۔

مگر یہ کرامات انبیائے کرام کے معجزات کی طرح قطعی نہیں ہوتیں۔ بلکہ پیروی اسلام میں باعتبارِ تقویٰ اعتباری ہوتی ہیں۔ جن کو بطور اعتبارِ تعمیل شریعت میں ایزادِ رحمت کے طور پر وصول کیا جاتا ہے۔

یہ کرامات سو فیصد درست نہیں ہوتیں۔

بلکہ درجاتِ تقویٰ کے لحاظ سے کسی ولی اللہ کے پچانوے فیصد کسی کے اِس سے کم پچاس ساٹھ یا ستر فیصد تک اور کسی ولی اللہ کے پچاس سے کم تیس بیس یا دس یا ایک فیصد تک اعتباری ہوتی ہیں۔ اُن پر اعتبار کرنا چاہئے۔

مگر یہ کرامات اگر کتاب و سنت کے معیار پر اُتر آئیں۔ تو اُن کی کرامت پر اعتبار کرنا موجبِ ثواب اور موجبِ تحریصِ دین اور حصولِ تقویٰ کی ترغیب کا موجب ہوتے ہیں۔ اِس واسطے اُن پر اعتبار کرنا دین پر قائم رہنے کا ذریعۂ ہدایت ہوتا ہے۔

اگر خلافِ شریعت کسی سے کوئی تعجب خیز بات یا فعل سرزد ہو بھی جائے۔ تو وہ کرامت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ محض وہ شعبدہ ہوگا۔

اِس نصیحت کے بعد مجھے ایک بار الحمد شریف اور تین بار اخلاص شریف پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ اور اول و آخر درود شریف پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ مجھے باوضو ہو کر قبلہ رُو بٹھایا اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

اور پھر فرمایا۔

بیٹا! کرامت کسی ولی اللہ کے جیب کی چیز نہیں ہے۔ کہ جب چاہے اُسے نکال لے۔ اور جب چاہے بند کر دے۔

فرمایا خوشنودیٔ خدا کے ساتھ کرامات کا صدور ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کی رضا سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اِس کے لئے کتاب و سنت کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔ جو اولیایانِ اُمت تک پہنچا ہو۔

جِس طرح کسی سمندر سے دریا جاری ہو جائے یا حوض کی طرح کہ اُس میں ایک دروازہ ہوتا ہے۔ اور اُسے کھولنے یا بند کرنے کا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے۔ جب وہ دروازہ کھول دیا جائے۔ تو پانی جاری ہو جاتا ہے۔ اور اُس میں آبیاری شروع کر دیتا ہے۔ اور جب بند کیا جائے۔ تو پانی رُک جاتا ہے۔ اور وہی دروازہ پھر تو جامع الحوض ہو جاتا ہے۔ اور پھر مانع الحوض کے فرائض بھی سرانجام دیتا ہے

اِسی طرح اولیاء اللہ بربنائے تقوٰی اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے فضیلتِ عالمانہ یا فضیلتِ عارفانہ کے شیوخ ہوتے ہیں۔ جِن کو شیخ العلوم دینیہ یا شیخ الطریقت کہا جاتا ہے۔

اُن کا علم و عرفان سمندروں یا بہتے ہوئے دریاؤں کے مانند ہوتا ہے۔ اِس سے کم درجے کے علماء یا ولی اللہ جھیل یا حوض کے مانند ہوتے ہیں۔ سمندروں کے کواڑ اگر کسی جہت سے کھول دیئے جائیں۔ تو اُن سے بڑے بڑے دریا پھوٹ کر بہہ نکلتے ہیں۔ جو دُور دراز تک پھیل جاتے ہیں۔ جِن کے ذریعہ لعل و جواہر اور پتے اور دیگر جواہرات بھی اُن کے ہمراہ ارضی وسعتوں میں پھیل جاتے ہیں۔

اور اگر دریاؤں کے کواڑ کسی خاص محلِ وقوع سے کھول دیئے جائیں۔ تو انہار جاری ہو جاتی ہیں۔ اور وہ حسبِ قوت جہاں تک پھیلاؤ حاصل کر سکتی ہیں۔ پھیل جاتی ہیں اور زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔

جھیل اور حوض وغیرہ کے کواڑ کھول دینے سے اُن کی استطاعت کے مطابق چھوٹی چھوٹی نہریں بہہ نکلتی ہیں۔ جو قرب و جوار کے علاقہ کو سیراب کرتی ہیں۔

فرمایا۔

اولیاء اللہ سے بھی بفضل اللہ تعالےٰ اِسی طرح درجات کے لحاظ سے کشف و کرامات علی وجہ البصیرتِ اسلامیہ اور علیٰ وجہٗ اتقائے اسلامیہ صادر ہوتی ہیں۔ کسی سے زیادہ کسی سے کم اور کسی سے کم تر۔

مگر یہ کرامات دینی تقوٰی پر ہی اعتبار حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر اعتبار نہ کیا جائے۔ تو دنیا میں تقوٰی کے متقیانہ نتائج کا اعتبار معدوم النتائج ہو جاتا ہے۔ جِس سے ایک پُر تاثیر اور نتیجہ خیز تبلیغِ دین کا برھانی راہ بند ہو جاتا ہے۔ اور لوگ کاملینِ وقت کے استفادوں سے محروم و متروک ہو کر متقیانہ حال سے محروم ہو جاتے ہیں۔

یہ واقعہ قبولیتِ اعتقاد اور مقبول اعمال کے درمیان ایک خلیج بن جاتا ہے۔ بہتر وہی ہے۔ جو بن دیکھے اللہ تعالےٰ کی قدرتی کرامات کو تسلیم کرلے۔ اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء و مرسلین کے معجزات پر ایمان لے آئے۔

اور اللہ و رسول کی اطاعت میں بر سبیلِ دین تقوٰی حاصل کرنے والے اولیاء اللہ پر اور اُن کے مکاشفات و کرامات پر بھی اعتباری ایمان لے آئے۔ ورنہ وہ صدیقیت کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔

فرمایا۔

بیٹا! تم نے ایمانِ بالغیب کے ساتھ اللہ تعالےٰ اور اُس کی قدرت پر اور اُس کے بھیجے ہوئے انبیاء و مرسلین پر اور اطاعت گذار اولیاء اللہ پر اپنا یقین مضبوط کرلیا ہے۔ اس واسطے یہاں تک تم دانش نورانی کی عاطفت میں اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم کے ساتھ اپنے اعتقاد کی حفاظت کرتے رہے ہو۔

میری تمنا ہے۔ کہ میں خداداد احسانات کو جو مجھے من جانبِ صلحائے کاملین ملے ہیں۔ اُن میں سے چند ایک تفویضات سے تمہیں بہرہ ور کروں۔

تاکہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں تقوٰی کے ساتھ حصول خوشنودئ خدا اور رسول تمہارے لئے ذریعۂ ترغیب ہو کر تمہیں عملِ صالح دے سکیں۔ اور یہ سِلسلہ دانشِ نورانی

سے دانشِ برھانی کی طرف جاری کیا جائے گا۔ جس میں استقامت کی زیادہ ضرورت ہے۔ مجھے اِن پند و نصائح کے بعد اللہ تعالےٰ کے حضور سجدہ ریز ہونے کی تعلیم دی گئی۔ اور فرمایا۔

کہ حالتِ سجدہ میں ننانوے بار سُبحان ربی الاعلیٰ کی تسبیح مکمل کرکے پھر سجدۂ دوم کرو۔ اور اِس میں بھی ننانوے بار سُبحان ربی الاعلیٰ کی تسبیح پڑھو۔ پھر جو کچھ زبان سے مَیں تلقین کروں گا۔ اس کو بصمیم قلب خشوع و خضوع سے پورے خوف و رجا کے ساتھ پڑھتے جانا۔ اور جب تعداد پوری ہوجائے۔ تو اللہ اکبر کو جہر سے پڑھ لینا۔ تاکہ میں تمہیں دوسرے کلام کی تعلیم جاری کرسکوں۔

جب دو سجدوں میں ننانوے ننانوے بار سُبحان ربی الاعلیٰ پڑھ چکا۔ تو مَیں نے بالجہر اللہ اکبر پڑھا۔

اِس کے بعد آپ نے تعلیم فرمائی۔ کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی اکتالیس مرتبہ تلاوت کرو۔

چنانچہ میں نے تعمیل کی۔

پھر فرمایا۔ اکیس مرتبہ اَللّٰہُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِہٖ کی تلاوت کرو۔

مَیں نے بجاآوری کی۔

اِس کے بعد فرمایا۔ یَا نُوْرُ یَا لَطِیْفُ گیارہ مرتبہ ادا کرو۔

چنانچہ مَیں نے ایسا ہی کیا۔

پھر فرمایا۔ ننانوے بار یاودُود۔ وددنی سات مرتبہ پڑھو۔

مَیں نے تعمیلِ حکم کی بجاآوری کی۔

اِس کے بعد فرمایا۔ خاموشی کے ساتھ یَا نُوْرُ یَا لَطِیْفُ پڑھتے رہو۔ جو کچھ نظر آئے۔ وہ مجھے بتاتے جانا۔ یہ اِن وظائف مذکورہ کی تجلیات ہوں گی۔ جو اپنے انوار عالمِ امر سے عالمِ خلق میں تمہارے میلانِ قلب پر نورانی شعاعیں نازل کریں گی۔ جن کی نورانیت میں تم اپنے بدن کے ظاہری و باطنی گوشوں کو دیکھ سکوگے۔ جہاں سے عُرفِ نفسانی کی معرفت کا آغاز ہوگا۔

چنانچہ چند لمحوں کے بعد میں نے دیکھا۔ ایک تیرہ و تار کمرہ میں میَں کسی سخت سی چیز پر بیٹھا ہُوں۔ اور وہ غلیظ ہے۔ اور کمرہ متعفّن ہے۔ جیسے وہاں عفونت کے ڈھیر ہیں۔ یا بدبودار مُردے پڑے ہیں۔ جِن کی بدبو نے میرے دماغ کو چکرا دیا۔ میَں بے حد مضمحل ہُوا۔ میَں نے اپنا یہ اضمحال حالتِ سجدہ میں ہی والدِ بزرگوار کی سماعت کے لئے بیان کر دیا۔

آپ نے فرمایا۔ یہ دُنیا اور نفس ہے۔ اور ساتھ ہی حدیث شریف کا حوالہ دیا۔

اَلدُّنیَا جِیفَۃٌ وَّطَالِبُھَا کِلَابٌ =

دنیا مردار ہے۔ اور اُس کا طالب کتا ہے۔

مگر اسلامی طریقہ سے دنیا حلال ہو جاتی ہے۔

پھر فرمایا۔

استقامت سے اسمائے باری تعالےٰ جاری رکھو۔ چند لمحوں بعد وہی کمرہ بلا کسی چراغ اور دوسری ظاہری روشنیوں کے بقعۂ نور ہو گیا۔ پھر میں نے اُس نورانیت میں اپنے وجود کو سخت سیاہ دیکھا۔ ہر چیز سیاہ ہی سیاہ نظر آ رہی تھی۔ وہ کمرہ اور اس کے در و دیوار، اس کی ہر چیز، اس کی زمین میری روح کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

پھر روحانی نظر در و دیوار سے بھی آگے نکل گئی۔ جیسے ظاہری نظر زجاج سے پار ہو جاتی ہے۔

معاً میرے سامنے سے تمام تاریکیاں گُم ہو گئیں۔ جہانِ انفس و آفاق میرے سامنے آ گئے۔ حدِ نظر تک مجھے سر سبز و شاداب دنیا نظر آنے لگی۔ اشجار و اثمار نورانی اور ہر چیز نورانی نظر آنے لگی۔

ایک پہاڑ نظر آیا۔ گویا کہ میں بھی اُس میں موجود ہُوں۔ ایک بلندی کے نشیب سے ایک نورانی چہرہ نمودار ہُوا۔ وہ بہت سی بکریوں کے ہمراہ اُن کی گلہ بانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ نورانی چہرہ مبارک میرے قریب تر ہوتا گیا۔

میَں نے حضرتِ والد کی سماعت کے لئے یہ ماجرا ذکر کر دیا۔

فرمایا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ جو بکریوں کی گلہ بانی کے بظاہر فرائض

انجام دے رہے ہیں۔ جس سے فطری امور کے مطابق عالمِ اسباب کی محنت و مشقت مُراد ہے۔

اور نیز ایک اولی العزم نبی اللہ کی عجز و انکسار کے ساتھ معاملانہ عبودیت کا اظہار ہے۔ نیز انسانیت کی گلہ بانی کی مشابہت ہے۔ یہ کہ ہادیانِ انسانیت ظلماتِ دنیا اور ظلماتِ نفس و شیاطین کے دشت و جبل میں انسانیت کی اِس طرح گلہ بانی کرتے ہیں۔

فرمایا۔ حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے علماء و مجددینِ دین کانبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ جو اسی طرح ہر زمانہ میں ملّتِ اسلامیہ کی گلہ بانی کریں گے۔

اُمت بار بار صراطِ مستقیم سے بھٹک بھٹک کر منتشر ہو جایا کرے گی۔ اور علماء و مجددینِ اسلام بار بار اُسے نفس و شیطان کی گرفت سے آزاد کیا کریں گے۔ اور اُن کی گلہ بانی کے فرائض انجام دیں گے۔

یہاں تک یہ منظر ختم ہُوا۔

معاً ایک بڑے اور سفید ترین کپڑے پر حروف جلی کی صورت میں سورۂ فاتحہ کے سات آیات لکھی ہوئی سامنے آگئیں۔ میں نے عرض کیا۔ سورۂ فاتحہ کی سات آیات جلی حروف میں ایک سفید ترین کپڑا پر لکھی ہُوئی میرے سامنے فضا میں نظر آرہی ہیں۔ جن کو میں بخوبی پڑھ سکتا ہُوں۔

فرمایا۔ بیٹا!۔

یہ سورۂ فاتحہ ہے۔ یہ سات آیات پر مشتمل ہے۔ جس کو سبع ثانی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یعنی سات آیات والی سورت۔

یہ سالک کے لئے سات عقبات مرتب کرتی ہے۔ اِس میں حمد باری تعالےٰ ہے۔ اور حمد بیان کرنے والا بندہ ہے۔ محمودِ مطلق خدائے لم یزل ہے۔ حمد بیان کرنے والے کے لئے محمودِ حقیقی یعنی خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اولاً زبانی، بدنی اور مالی طور پر راہِ سلوک میں سات عقبات دیئے گئے ہیں۔

کوئی بندۂ حامد بغیر تعین محمود کے حمد بیان نہیں کر سکتا۔ اور تعینِ محمود کے بعد محبتِ محمود کا ہونا ضروری ہے۔ بلا محبت حمدِ محمود قرینۂ تعریف کے خلاف ہے۔

فلہٰذا بندۂ حامد کے لئے راہِ سلوک میں وصول الی اللہ کے لئے محبتِ بندگانہ عُقبۂ اوّل قرار دیا گیا۔ اور محمودِ حقیقی سے مُراد معبودِ حقیقی ہے۔ جو الٰہُ العالمین ہے۔

الٰہ کے معنی معبود کے ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ کی صفت ہے۔ یعنی وہ اپنی ذات وصفات کے ساتھ معبودِ مطلق ہے۔ اُس کی ذات وصفات دونوں قدیم اور غیر حادث ہیں۔

اِس طرح معبودِ حقیقی سالکِ راہ کی منزلِ مقصود ہُوا۔ اور اس منزل میں معبودِ مطلق سالک کا معشوقِ حقیقی ہُوا۔ اور معشوق چونکہ اکبر ہے۔ اِس واسطے اُس کی منزل جملہ معشوقانِ مجاز سے بڑی اور طویل تر ہوگی۔ اور معشوق کے منازل جتنے طویل ہُوں گے۔ اتنے ہی زیادہ سالک کے لئے رازہائے منازل زیادہ ہُوں گے۔

فلہٰذا سالک کا دوسرا عُقبہ صفاتِ باری تعالےٰ کے ساتھ باری تعالیٰ کے راز ہُوئے۔

فرمایا۔ ذات مُنتجع الصفات ہوتی ہے۔ اِس تک پہنچنے کے لئے صفات کا ذریعہ ہی موجبِ قرب ہو سکتا ہے۔ اور ہر صفت معلوم ہونے سے پہلے راز ہوتی ہے۔

اگر معشوق عالمِ مجاز سے ہوگا۔ تو صفات بھی مجازی ہوں گے۔ اور ایسے معشوق کے لئے تمام محبت اور راز کے سہارے بھی مجازی ہوں گے۔ مگر ذاتِ خدا کے لئے بندۂ حامد کا مخلوق ہونا ضروری ہے۔ اور بندۂ حامد کے لئے مشکل ترین مرحلہ قیامِ محبت ہے۔ چونکہ وہ خود مخلوق ہے۔ اور عالمِ خلق کا مسافر ہے۔ مخلوق کا بر سبیلِ مخلوق غیر مخلوق کا مفہوم کرنا بغیر استقامتِ ایمان کے مشکل ترین اوامر سے ہے۔

بندۂ حامد کو بمعہ اپنے وجود کے تمام عالمِ خلق کو آیات ومظاہراتِ الٰہیہ سے تشبیہ دے کر ہی راہِ سلوک میں قدم رکھنے کی اجازت مِل سکتی ہے۔ اگر کہیں ذرہ برابر بھی انانیت کی جھلک موجود ہو۔ تو آئینۂ قلب دھندلا ہو کر سالک کے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ اور وہ رُک جاتا ہے۔

اِس واسطے قیامِ محبت کے بعد عُرفِ نفس کے ساتھ عُرفِ عالمِ خلق ضروری ہے۔ یہ محبت کی نظرِ اول ہے۔ جو مزید راز پانے کے لئے عُقبۂ ثانی کے حاصل کرنے کا جذبہ دیتی ہے۔

محبتِ حقیقی کے عقبۂ اوّل میں عملِ پیہم کے بعد ہی حقیقت کا سُراغ مِلتا ہے۔ اور یہ سراغ سالکِ راہ کو صراطِ مستقیم پر قائم رہنے سے ہی مِل سکتا ہے۔

اللہ معشوقِ حقیقی ہے۔ اور اس کے بندے اُسی کی بتائی ہُوئی راہوں پر چل کر اُس کا راز پاتے ہیں۔ اور یہی راہ انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین کی راہ ہے۔

یہ چار قسم کے راز دارانِ حقیقت سبیل دین پر چل کر عالمِ خلق کو عالمِ اسباب گردانتے ہیں اور رازدارِ حقیقت بنتے ہیں۔

فلہٰذا حمد کی ادائیگی کے ساتھ ہی سالک حامد کا مقام پا جاتا ہے۔ اور بندۂ حامد بننے کے بعد فوراً ہی اُسے راہِ سلوک مِل جاتی ہے۔ اور راہِ سلوک میں تعیّن سے معشوق تعینِ منزل ہوتا ہے یہی تعین حامد کو راز کی طرف رگز دیتا ہے۔ طبیعت بھی راز کی جانب منعطف ہو جاتی ہے۔

لہٰذا محبت عقبۂ اول ہُوا۔ اور راز عقبۂ ثانی۔

اِس کے بعد مجھے تقریباً ایک گھنٹہ سر بسجود رکھنے کے بعد سَر اُٹھانے کا ارشاد ہُوا۔ میں نے تعمیلاً سَر اُٹھا لیا۔ میں شرابور تھا۔ مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا۔ کہ ہمارا یہ ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا اپنے دامن میں دونوں جہانوں کی نورانیت سمیٹے ہُوئے ہے۔

انیسواں باب

سورۂ فاتحہ کی روشنی میں

سات

حامدانہ سلوک کے سات عقبات

مَیں متحیر تھا اور تحیر میں عرض کی ابا جان آپ میرے صرف والد ہی نہیں۔ بلکہ ایک عظیم عارفِ باللہ ہونے کی حیثیت میں میرے مُرشدِ کامل بھی ہیں۔ آپ نے مجھے براہین سے ہمکنار کر دیا۔ آپ نے میرے مظنون شبہاتِ عقلی کو معدوم کر دیا ہے۔ آپ نے مجھے بندۂ خدا ہونے کی راہ پر ڈال دیا۔ آپ میرے بہت بڑے محسن ہیں۔ آپ نے نہ صرف حقِ پدری ادا کیا۔ بلکہ آپ نے حقِ اسلام بھی پورا کر دیا آپ نے حق العباد کے عملی ترجمہ سے بندگی کے جو دوسخا کا حق ادا کر دیا۔

مَیں نے آگے بڑھ کر ہاتھ چوم لئے۔ آپ نے مجھے اپنے سینۂ اقدس سے لگایا۔ اور دستِ شفقت سر پر رکھ کر فرمایا۔

بیٹا! ۔ دنیا مستعار ہے۔ ایمان کی قندیل کو اہلِ ایمان کے سینوں میں روشن کرنے والی صرف خدا کی ذات ہے۔ یہ سِلسلہ عرشِ عظیم سے خدائے لم یزل نے شروع کیا۔ پھر جملہ انبیاء نے اِس دستور العمل کو جاری رکھا۔ پھر ختمیٔ مرتبت آخر الزمان صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بعد سِلسلۂ نبوت منقطع ہو گیا۔

مگر علمائے ظواہر اور علمائے بواطن کے ذریعہ ولایت کا سِلسلہ حدِ قیامت تک جاری رہے گا۔ اور ایمان کی قندیلیں علماء و اصفیاء کے ذریعہ لوگوں کے سینوں میں منتقل ہو

ہو کر جگمگاتی رہیں گی۔

یہ محض اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے۔ عنایت فرماتا ہے۔ مگر اِس عنایت کے بعد محتاط ہونا اور اسلامی تقوےٰ کے دائرہ میں رہنا ضروری ہے۔ ورنہ یہی عنایات خلافِ تقوی مصرف میں لانے کے بعد انسان کفرانِ نعمت کا مصداق ہو جاتے ہیں۔

فرمایا۔ دو رکعت نمازِ نفل بطورِ شکرانہ ادا کرو۔ تاکہ میں اس کے بعد باقی پانچ عُقباتِ سلوک سورۂ فاتحہ کی روشنی میں بیان کر کے حقِ تدریس ادا کروں۔

چنانچہ میں نے دو رکعت نمازِ نفل بطورِ شکرانہ ادا کیئے۔ اُس کے بعد آپ نے اپنے سابقہ بیانِ عُقبات پر روشنی ڈالنی شروع کر دی۔

فرمایا۔ عُقبۂ محبت تمام عقباتِ سلوک کی ایسی جڑ ہے۔ جس طرح علم العقائد کی جڑ کلمۂ طیبہ ہے۔ جس کے بغیر دوسری بنائیں کالعدم ہو جاتی ہیں۔ بعینہٖ راہِ حقیقت میں سچی محبت کے ساتھ آغاز کرنا سلوک کی جڑ ہے۔

جب اللہ تعالےٰ کی سچی محبت سینۂ سالک پر اُتر آتی ہے۔ پھر محبت کی اپنی ذمہ داری ہو جاتی ہے۔ کہ وہ درِ نیاز تک رسائی حاصل کرنے کے لئے منزل کی جستجو کرے۔

اس کے بعد راز کی جستجو محبت کی فطرت اور میراث ہے۔ بلا محبت راز کی جستجو نہیں ہو سکتی۔ محبت قدمِ اول ہے۔ اور راز قدم ثانی۔ یہ دو قدم اگر صحیح طور پر اپنے نصب العین کی طرف اُٹھ جائیں۔ تو گویا سالک نے منزلِ لا میں قدم رکھ دیا۔ جس کو اصطلاحِ تصوف میں منزلِ نفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بندۂ حامد کو حمدِ باری تعالےٰ کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے ذکرِ اثبات کو نصب العین بنا کر اس کے بعد ذکرِ نفی کرے۔ اور ذکرِ نفی کے دوران قلبِ محبت اور ماہیتِ محبت سے بے خبر نہ ہو۔ ورنہ کیا تعجب کہ دورانِ نفی میں موت واقع ہو جائے۔ اور متروک عن الاثبات ہو کر ایمان سے محروم ہو جائے۔

روح کا سلیم الطبع ہونا اور مقصد پر نظر رکھ کر نفی کی مشق کرنا چاہیئے۔ بغیر متشرع مُرشد کی تلقین و نظر کے راہِ نفی اختیار کرنا اور ایسے ویرانۂ بے مشعل میں قدم رکھنا مہلک ترین

خطرات سے ہے۔

پھر فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرّسول اللہ پڑھ کر ایک طویل مدّت اس پر مراقبہ کرنا چاہیئے۔

جب اللہ تعالےٰ کی الوہیت کا اثبات دل میں قرار پکڑ جائے۔ تو اُس کے بعد اپنے وجود سمیت ہر چیز کو ماسِوا اللہ قرار دے۔

پھر بھی اثبات پر نگہداشت رکھتے ہُوئے ماسوا اللہ پر مراقبہ کرے۔ جب ماسِوا اللہ مجموعی طور پر غیر اللہ نظر آنے لگے۔ اور دِل ماسِوا اللہ کو غیر اللہ سمجھ لینے کی تصدیق کرلے۔ اس وقت سات مرتبہ غیر اللہ کو ماسوا اللہ قرار دینے کے لئے ذکرِ نفی کرے اور آٹھویں مرتبہ الا اللہ ضربِ قلبی کے ساتھ پڑھے۔

پھر سات دفعہ نفی کو اثبات کے ساتھ اِس طرح پڑھے۔ لَا اِلٰہ ۔ اِلَّا اللہ ۔ اللہُ اللہ ۔ پھر پورا کلمہ پڑھ کر ایک دور مکمل کرے۔ اِس طرح ننانوے دور کرے۔

اِس کے بعد باوضو مراقبہ یا قیلولہ کی صورت میں تقریباً آدھ گھنٹہ آرام کرے۔ پھر اُٹھ کر حسبِ دستور نفی واثبات کا ذکر کرے۔ جب مکمل تھکان محسوس کرے تو ننانوے مرتبہ درود شریف اور بسم اللہ کی معیت میں الحمدللہ پڑھے۔ اور بعد دو رکعت نمازِ استخارہ کے روبقبلہ ہو کر سو جائے۔ تاکہ اُس کی نیند بھی بندگی میں شمار ہو۔

اِس طرح چالیس یوم پورے کرے۔ مگر اِن چالیس ایام میں کسی قسم کی خارجی حرص وہوا کو اپنے دِل میں نہ آنے دے۔ حتیٰؒ کہ مراقبہ و مکاشفہ میں بھی کسی چیز کے دیکھنے کا لالچ نہ کرے۔ سوائے اُس مقصد کے جو زیرِ نظر ہے۔ سالک کا ایک ہی نصب العین ہے۔ جو ماسوا اللہ کو پھاند کر اللہ کو پانا چاہتا ہے۔

اثبات کے ادراک کے لئے نفی مشق کی جاتی ہے۔ اور نفی کو اثبات سے ماقبل رکھا گیا ہے تاکہ اثبات سے پہلے سالک ماسوا اللہ کی نفی کر سکے۔ ورنہ نفی واثبات دونوں کا اشتراک عقیدۂ توحید کو متزلزل کر دیتا ہے۔

اثبات کے اقرار و محبت سے متروک ہو کر ذکرِ نفی معارفِ اثبات سے محروم کر دیتا ہے۔

عُقبۂ محبت اور عُقبۂ راز کا نصب العین نیازِ حقیقت ہے۔ جس کو سالک عارفانہ طور پر وصول کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔

لہٰذا عُقبۂ ثالث ترتیب کے لحاظ سے عُقبۂ نیاز کہلائے گا۔ اِن تین عُقبات کی آئینہ داری اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تک ترتیب آیات میں ہو جاتی ہے۔ اللہ محمود و معشوقِ مطلق ہے۔

رب العالمین سلوک میں راز کی وہ منزل ہے۔ جس میں سالک کو ہر چیز پروردگارِ عالمین کی صفتِ ربوبیت کے ساتھ تصرف کے معراجِ کمال تک پہنچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جہاں اُسے اپنے مراقبہ میں کمالِ سلوک تک رسائی حاصل کرنے کے لئے رجا کا بل ملتی ہے۔

الرحمٰن میں سالک قیامت تک غائت رحمت کی امید پا کر اپنے حال کو مستقبل کے لئے تیار کرتا ہے۔ اور راہِ سلوک میں قدم رکھتا ہے۔ وہ قدم اول پر ہی اپنے سفر کو لامتناہی قرار دے کر آگے بڑھتا ہے۔

الرحیم۔ میں وہ اپنے سلوکِ منتقیانہ کے ساتھ یومِ قیامت پر بخشش کی امید پاتا ہے۔ جس پر اُسے عدالتِ خداوندی میں شاہ و گدا عوام و خواص نفسی نفسی پکارتے ہُوئے نظر آتے ہیں۔

اور شفیع المذنبین علیہ الصلوٰۃ والسلام اُسے اُمتی اُمتی پکارتے ہُوئے نظر آتے ہیں۔

اِس مقام پر سالک مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا پر کاربند ہو جاتا ہے۔ وہ شفیع المذنبین کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر شفاعت کا متمنی ہوتا ہے۔

اور اُسے اللہ تعالےٰ کے اِس بے پایاں احسانِ عظیم کے سامنے جو اہلِ ایمان پر بعثتِ آخر الزمان علیہ التحیہ والسلام کے ذریعہ فرمایا سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

اور اِس کے بعد وہ کتاب و سنت کی روشنی میں بر بنائے تقوٰی راہِ سلوک پر بڑی

احتیاط اور محنت سے ریاضت کرتا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں سچی ریاضت ہی راز ونیاز حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

یہ ریاضت سالک سے چند مشکلات کے طے کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

ریاضت اُس محنتِ شاقہ کا نام ہے۔ جو شرعی اُصول وقواعد کی پابندی میں اِس طرح کی جائے۔ کہ مرضیاتِ معبود کے مطابق جو جو مراحل درپیش آئیں۔ چاہے وہ کتنے ہی کٹھن کیوں نہ ہوں۔ ترتیب سے مشقت کے ساتھ اُنہیں برداشت کیا جائے۔ اور اِس مشقت میں اہلِ سلوک راحت پاتے ہیں۔

چونکہ یہی مشقت اُن کے لئے ذریعۂ رضا جوئی ہوتی ہے۔ ریاضت سے پہلے قناعت کا مرحلہ درپیش آتا ہے۔ اور قناعت سے قبل مرحلۂ فاقہ ہے۔

اِس ترتیب سے فاقہ چوتھا عُقبہ بن جاتا ہے۔ جو راہِ سلوک کی ایک دشوار منزل ہے۔ جسے سالک تزکیۂ نفس کے لئے اختیار کرتا ہے۔ یا منزلِ عشق میں اضطراراً بھی درپیش آجاتا ہے

فاقہ کوئی ایسی مسلسل مشق کا نام نہیں۔ جس سے ہلاکت مراد ہو۔ بلکہ فاقہ با قناعت ترتیبِ سلوک کے مطابق بہتر قرینہ ہے۔ قناعت خداداد عنایات پر برضا اکتفا کر لینے کا نام ہے۔ تاکہ سالک غیر متوکل نہ ہو جائے۔

اِس واسطے کہ توکل باللہ بے جا حرص وہوا اور بے صبری سے بچنے کے لئے ایک اسلامی طریقہ ہے۔ جس کا تعلق محض اللہ سے ہے۔

فاقۂ بالمحبت راہِ سلوک کا چوتھا عُقبہ ہُوا۔ اور قناعت بالتوکل پانچواں عُقبہ ہُوا۔ جس سے سالک راہِ محبوب میں دقیق سے دقیق ریاضت کرنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے گویا فاقہ اور قناعت سالکانہ ریاضت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

اِس طرح کمالِ سلوک کا ذریعہ ریاضت ہُوئی۔

فرمایا۔ اِس ترتیب سے ریاضت راہِ سلوک کا چھٹواں عُقبہ بن جاتی ہے منازلِ سلوک کا منبع محبتِ الٰہی ہے۔

اور محبت الٰہی کے قرینے جن منزلوں کو چاہتے ہیں۔ اُن میں ایک عقبہ ایسا ہے۔ جو ان چھ منازلِ عملی کا محور ہوتا ہے۔

وہ نیک وسیلہ مُرشد ہے۔ جس کی ضرورت تعمیل حکم شریعت کی بجاآوری کے لئے ضروری ہوتی ہے بغیر امیر رشد و ہدایت کے پابندی احکام نہیں ہوسکتی۔

یہ مُرشد دینی ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

بغیر وسیلہ کے طریقِ کار کی تجویز نہیں ہوسکتی۔ اور بغیر تجویز و تشکیل کے کسی عمل کو صحیح نہج نہیں مِل سکتی۔

اور صحیح نہج کے بغیر تعیّنات کا تعارف نہیں ہوسکتا۔ اور بغیر تعارف تعیّنات منزل سے بھٹک جانے کا احتمال ہوتا ہے۔

اِس واسطے وسیلہ ایک ایسا عقبۂ سلوک ہے۔ جو سالک کی منزلِ اولیٰ سے منزلِ آخر تک معیت چاہتا ہے۔

یہ معیت معیتِ طریقت کہلاتی ہے۔ اور طریقت معیتِ شریعت چاہتی ہے۔

اِس طرح وَابْتَغُوْآ اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ یعنی وصول الی اللہ کے لئے ایسی طریقت کی ضرورت ہے۔ جو شریعت کی پابند ہو۔

آیت کا ترجمہ۔ کہ اللہ تک پہنچنے کے لئے وسیلہ چاہو۔

ترتیب کے ساتھ دینِ اسلام نے ہدایت کا پہلا قرینہ ایمانِ باللہ و ایمانِ بالرسول کو قرار دیا۔ اور یہ ایمان ہی دین بن جاتا ہے۔ اللہ اور رسول کے حکم سے جو جو احکامات ملیں۔ وہی دین ہوتے ہیں۔

پہلے ولی اللہ خلفائے راشدین تھے۔ جن کا ذریعۂ ایمان تعمیل حکم خداوندی ذوالجلال اور تعمیلِ حکم رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہُوا۔

اُس کے بعد دین کے جملہ عوامل کو حکمِ خدا اور رسول کے مطابق ہی عمل میں لایا گیا ہے۔ اور امر و نواہی پر مکمل عمل پیرا ہو کر اصحابِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہی عملاً طریقِ دین کی احیار کی۔

اِسی طریقۂ دینیہ کو اصطلاحِ شرع میں طریقۂ محمدی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جس کے معنی سنتِ خیرالانام کے آتے ہیں۔

اِن مسنون طریقوں پر جو اعمال مرتب ہو کر کراماتِ اتقیا بنتے رہے۔ اُن کا پہلا اجرا کراماتِ اصحاب رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت میں واقع ہوا۔

تیسرا اجرا تابعین کی صورت میں رونما ہوا۔ جنہوں نے اصحاب رسولِ پاک کی طریقت کو وصول الی اللہ کا ذریعہ بنایا۔

چوتھا اجرا تبع تابعین کی کرامات پر مرتب ہوا جنہوں نے تابعین کی طریقتِ شرعیہ پر عمل پیرا ہو کر سنتِ خیرالانام کی پیروی کی۔

اِس کے بعد ابدالآباد تک یہی چار مراحل جو ختمِ نبوت کے عملی خوارقات و معجزات پر مرتب ہو کر مسنون ہوئے جاری و ساری رہیں گے۔

طریقتِ اسلامیہ کا شجرۂ عہد ہر قسم کے اسلامی معاہدوں سے متعلق ہو کر بر سبیلِ شریف طریقت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مِل جاتا ہے۔ اِس واسطے عہدِ بیعت اگر شریعت کے مطابق ہو۔ تو وہ مسنون طریقہ ہے۔ جس پر طریقت کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔

اِس طرح کی طریقت کا اخذ شریعتِ اسلامیہ سے ہوتا ہے۔ اور ایسی طریقت بڑی تعمیلی و تقلیدی عرق ریزی پر مرتب ہو کر تفاصیلِ بندگی کی وضاحت کرتی ہے۔

جس طرح علومِ اسلامیہ نے علماء کی علمی عرق ریزی پر علوم کے تراجم و تفاسیر اور تشریحات و تفصیلات اور توضیحات وغیرہ کی ایجاد کی۔ صرف و نحو اور منطق و معقول کی طرحیں، ڈالیں بالکل اسی طرح علومِ تصوف نے بھی تعمیلی و تقلیدی عرق ریزیوں پر بنا طریقت استوار کی۔

فلسفۂ اسلام کی جہاں اہلِ علم نے فاضلانہ تشریحات فرمائیں۔ وہاں اہلِ سلوک عارفان باللہ نے بر سبیلِ علومِ دینیہ طریقتِ مسنونہ پر فلسفۂ علم و عمل دونوں کی علمی و عملی تشریحات کر کے خوارقات کو نتیجۂ بندگی ثابت کر دیا۔

کہ تعمیل احکاماتِ الٰہیہ کے ضمن میں جہاں عاقبت نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ جہاں نیک

اعمال کی نیک جزائیں ملیں گی - وہاں اِس دنیا میں بھی اعمالِ اسلامیہ کی بجا آوری میں انسان اہلِ کفر کے استدراج کو باطل کرنے کے لئے کراماتِ اسلامیہ کا ایک نتیجہ خیر برھان بن سکتا ہے -

فرمایا - وسیلۂ شیخ طریقت میں ضروری ہے - بشرطیکہ وہ صاحبِ ہوش ہو- اور اسلامی تعمیلات کی روشنی میں کم از کم حلال و حرام کا علم رکھتا ہو- اور اُس کا سالکانہ حال ہمہ وقت شریعت کا پابند ہو- یا کم از کم حالتِ افراط میں ذہنی روشنی کے ساتھ اعتدال کی طرف رجعت کرنے والا اور توبہ کرنے والا ہو-

ایسا مُرشدِ طریقت یقیناً راہِ حق میں بہتر وسیلہ ہو سکتا ہے- اور بغیر مُرشدِ کامل کے راہِ طریقت عبور کرنا مشکل ہے -

بیسواں باب

وسیلۂ مُرشدِ طریقت و شریعت
کے
ساتھ ہی تکمیل ہو سکتا ہے

اباجان کے اِس اندازِ نصیحت نے مرشد کی شرعی حیثیت مجھ پر واضح کر دی ۔ اور طریقت بالوسیلہ کی تعریف سمجھ میں آگئی ۔ وہ یہ کہ مُرشد کے معنی ارشاد کرنے والے کے ہیں ۔ اور مرید کے معنی صاحبِ ارادت کے ہیں ۔

محض ارشاد تو کوئی ارشاد بھی ہو سکتا ہے ۔ اور محض ارادت تو بُری بھلی ارادت بھی ہو سکتی ہے ۔ مگر طریقت میں مرشد کے ارشادات کے معنی شریعتِ اسلامیہ یعنی کتاب و سنت کے مطابق ارشادات ہیں اور مرید کی ارادت کے معنی شریعت کی روشنی میں کسی متشرع مُرشدِ کامل کے ساتھ ارادت کو وابستہ کر کے صراطِ مستقیم حاصل کرنے کے ہیں ۔

اگر مُرشد و مرید دونوں غافلِ شریعت ہو کر مرشد و مرید بننا چاہیں ۔ تو یہ محض اُن کا اپنا اختراعی اور وہمی مفروضہ ہو گا ۔ جس کو کوئی عام آدمی بھی رسم و رواج دے سکتا ہے ۔

اصلاً طریقت کی ابتدا و انتہا شریعتِ اسلام ہے اور شریعت وسیلۂ اعظم ہے ۔

چونکہ سب مرشدینِ طریقت نے دین ہی سے اکتسابِ فیض کیا ہے ۔ اور مرید بھی بر سبیلِ دین ہی مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے ۔

یہ بیعت اس بات کا اقرار ہوتا ہے ۔ کہ مَیں سنتِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے

مطابق حلال و حرام میں تمیز کروں گا۔ چاہے یہ عہد نامہ مرید کی ارادت سے ظہور پذیر ہو۔ چاہے دعوتِ مرشد سے عمل میں آئے۔

بہر طور یہ عہد نامہ اسلامی احکامات کی روشنی میں ہوتا ہے۔ اس لئے وسیلۂ اوّل دین اور وسیلۂ دوم طریقت۔ اور وسیلۂ سوم مرشدِ کامل ہے۔ یہ ترتیب وسیلۂ استعانت باللہ حاصل کرنے کے لئے ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

ترجمہ۔ اللہ تعالےٰ سے استعانت مانگو۔ صبر اور نماز کے ساتھ۔ اور اس طرح سے استقامت و استعانت حاصل کرنا بڑا مشکل ترین کام ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو اللہ تعالےٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ کہ انجام کار اُنہوں نے اپنے پالنے والے کے سامنے اپنی زندگی کے نیک و بد ہونے کا جواب دینا ہے۔ اور ہم انجام کار اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اِس آیت میں اگرچہ صبر و استقامت کے ساتھ نماز پڑھنا دشوار بتایا گیا ہے۔ مگر یہ دشواری عوام کے لئے ہے۔ جن کے دِل خشیّتِ ربانی سے خالی ہیں۔

اور وہ لوگ جو اہل اللہ ہیں۔ اور اُن کے دِل میں خوفِ الٰہی موجود ہے۔ وہ انجامِ کار کو سامنے رکھ کر بڑی احتیاط سے ارکانِ صلوٰۃ کے ساتھ اپنی استقامتِ صابرانہ کا ثبوت دے کر استعانتِ بالصبر والصلوٰۃ کا مقام پا لیتے ہیں۔

مگر اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے جمیع مومنین و مومنات کو خطاب فرما کر استقامت اور نماز کے وسیلہ کے ساتھ استعانت حاصِل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس تعمیلِ حکم کی ادائیگی سوائے خاشعین کے دشوار تر قرار دی گئی ہے۔

اِس میں ایک بڑا نکتہ یہ ہے۔ کہ تمام مومنین و مومنات اس حکم کی تعمیل کی بجاآوری کریں مگر ساتھ ساتھ اُن کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ایسی استعانت کون لوگ کر سکتے ہیں۔

اِس آیت میں ایسے لوگوں کی جو صبر و صلوٰۃ کے ساتھ استعانت حاصِل کر سکتے ہیں۔ اُن کی

تعریف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے ساتھ واضح فرمادی۔ اور ایسے لوگوں کو اِنّھا لکبیرۃ سے مستثنٰے کر کے عام لوگوں پر ممیز کر دیا۔

یہ ظاہر ہے کہ ایک جماعت کے سامنے ایک مشکل ترین مسئلہ پیش کر کے ساتھ ساتھ شرائط بھی بیان کر دیئے جائیں کہ اِس مسئلہ کو وہی لوگ حل کر سکتے ہیں جو فضیلتِ علم کے مالک ہیں تو صاف واضح ہو گیا کہ جاہل لوگ یہ مسئلہ حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ بلکہ اِس مسئلہ کو حل کرنا صرف اہلِ علم کا کام ہے۔ اور جاہلوں کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اِس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے علمار کی طرف رجوع کریں۔ اور ایسے مشکل مسئلہ کو سمجھنے کے لئے علمار کا وسیلہ پکڑیں۔

اور ایسے کمزور گروہ کو تفہیم و افہام کے لئے علمار کے وسائل کی ہمیشہ احتیاج ہوتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر کمزور کو قوی کی احتیاج ہوتی ہے۔ اور یہی احتیاج اکتساب فیض پر مجبور کرتی ہے۔ اور جس سے اکتساب کیا جائے۔ وہ وسیلہ ہو جاتا ہے۔

ہر علم و ہنر اور دیگر جملہ فنون میں اکتساب فیض کے لئے ماہرین کے زیرِ عاطفت رہ کر تربیت پائی جاتی ہے۔ بغیر ان وسیلوں کے کسی فیض کا اکتساب نہیں ہو سکتا۔

اگر بالاتفاق ہو بھی جائے۔ تو اِس میں اصولی کمزوریاں باقی رہ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ سلسلہ وار درجات سے گذر کر کسی فیض کا بکمالِ اکتساب تکمیل نصاب کو مکمل کر لینے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

علمِ دین تقوٰی کے لئے ضروری ہے۔ جو ایک مکمل نصاب ہے۔ جس کی تحصیل علمائے دین کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

بالکل اسی طرح حاصل شدہ علم کی روشنی میں اعمالِ اسلامیہ کی باریکیوں پر عمل کرنے اور ان کو تکمیل دینے کے لئے علمائے اسلام کو بھی اُن فاضلینِ سلوک کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جنہوں نے علمِ دین کے بعد اعمالِ دین کو تقلیداً مکمل کیا ہو۔

اِن فاضلین علوم دینیہ کو اکتسابِ علومِ دینیہ کے بعد شیوخِ طریقت کی طرف تکمیل عبادات و معاملات اسلامیہ کے لئے اور تکمیلِ معاشرت و اخلاق اسلامیہ کے لئے رجوع کرنا ضروری

ہے۔ تاکہ ریاضت میں شیوخ کا وسیلۂ نگرانی میسّر آسکے۔

چونکہ ریاضت مقصدِ دین ہے اور مشکل ترین منزل ہے۔

علماء اگر عُرفاء کا وسیلہ نہ پکڑیں تو یہ تجاہل عالمانہ ہوگا۔ جو عالم کو اکتساب فیضِ نظر سے محروم کردے گا۔ ایسی حالت میں اعمال کی باریکیاں اس پر واضح نہ ہو سکیں گی۔ اور وہ توجیہاتِ ظنی کا شکار ہو جائے گا۔ اور اُس کی توجیہات یقیناً اُسے سہل پسند بنادیں گی۔ اور اُن کی یہ سہل پسندی عوام پر بھی اثرانداز ہوگی۔ جس سے تن آسانی رواج پکڑ جائے گی۔

عالم جب عملی زندگانی میں توجیہات کرکے گمراہ ہو جائے۔ تو اِذَا ضَلَّ عَالِمٌ ضَلَّ الْعَالَمُ کا وقوع ہوتا ہے۔

کہ عالمِ دین کی گمراہی جہان بھر کی گمراہی کا باعث بن جاتی ہے۔

طریقت کے وسائل بدعت کے لئے نہیں۔ بلکہ عوام و خواص کی عملی رہبری کے لئے عمل رسولِ پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اور عمل اولیائے صالحین کے مطابق طریق شرعیہ عازمانہ کے طور پر تشکیل دیئے گئے ہیں۔

اِس آیت میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے بالاستقامت نماز کے ساتھ امداد طلب کرنے کی سب مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے۔

مگر بوجود اِس حکم عامہ کے اُن پر اسی وسیلہ استعانت کو گراں ثابت کرکے خاشعین کو یہ فضیلت دی گئی ہے۔ کہ وہ شرطِ تقوٰی کی تکمیل کے ساتھ باصبر نماز کے وسیلہ سے استعانت حاصل کر لیتے ہیں۔

وہ اپنے ایمان و ایقان میں عبادات و معاملاتِ اسلامیہ کی ادائیگی کے ساتھ یومِ جزا پر بھی مکمل اعتبار کئے ہوئے ہیں۔

یہ آیت اپنے سیاق و سباق کے ساتھ غیرِ خاشعین پر خاشعین کو فضیلتِ تقوٰی کے ساتھ ممیز کر دیتی ہے۔

لہٰذا ہر غیرِ خاشع کو چاہیئے کہ وہ عالمِ دین ہو یا غیر عالمِ دین اکتساب فیضِ طریقت کے لئے شیوخِ طریقت کی طرف رجوع کرے۔ ورنہ یہ علامت تکبّر یا بدنصیبی ہوگی۔

نماز روزہ حج وزکوٰۃ کے ارکان کوئی بھی یاد کر سکتا ہے۔ مگر ان کے روحانی اور باریک رموز پر عمل کرنے کے لئے رجال اللہ کی اطاعت بالوسیلۂ عہدِ بیعت مؤکّد ہے۔

شیوخ القرآن کے وسیلہ سے رموزِ قرآن حاصل ہوتے ہیں۔ اور اُس کی باریک ہدایتیں طالبِ قرآن پر واضح ہوتی ہیں۔ اور شیوخ الاحادیث سے فقیہانہ باریکیاں سمجھنے کا اکتساب ہوتا ہے۔ اور شیوخِ ادب سے ادب اور شیوخِ علومِ دینیہ سے دین کی باریکیاں حاصل ہوتی ہیں۔

جملہ علوم معلومات کے لئے ہیں۔ اور معلومات میں علوم واعمال دونوں شامل ہیں۔ اسلامی علوم واعمال تربیت چاہتے ہیں۔ اور تربیت یافتگان ہی وسیلۂ اکتساب علم وعمل بن سکتے ہیں۔

اِس واسطے عالمِ اسباب میں رہ کر وسائل سے انکار کرنا طبیعت کو کذب پر آمادہ کرنے کے مترادف ہے۔ وسیلہ حق ہے۔ وسیلہ ذریعہ یا سبب کو کہا جا سکتا ہے۔

جو لوگ خدا کی ذات کو وسیلہ قرار دیتے ہیں وہ اُصول راہِ حقیقت سے ہٹ کر ایسی جسارت کرتے ہیں۔

وسیلہ یا سبب یا علت تینوں اصلاحات مخلوق کے لئے ہیں۔

وسیلہ دو چیزوں کے درمیان کسی تیسری چیز کا نام ہوتا ہے۔ جیسے خدا اور رسول کے درمیان حضرت جبریلِ امین ایک قاصدانہ وسیلہ تھے۔ جیسے انسانوں اور خدا کے درمیان انبیاء ومرسلین وسیلہ ہیں۔

اگر دو چیزوں کو ہٹا دیا جائے۔ تو وسیلہ از خود عبث ٹھہرتا ہے۔ ہر چیز کے لئے ایک علت ہوتی ہے۔ یعنی سبب یا وسیلہ۔ یہ تینوں نام خلق ہیں۔

لہٰذا اِن میں نقص ہے۔ اور خداوندِ ذوالجلال کی ذات ہر قسم کے نقص سے ذاتاً اور صفاتاً منزہ ہے۔

ہر علت کا کوئی معلل ہوتا ہے۔ اور ہر سبب کا کوئی مسبّب ہوتا ہے۔ وسیلہ سبب

ہے اور اُس کا مسبب اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات علت و سبب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ ذات معلّل و مسبّب ہے۔

اِس دلیلِ قطعی کے اعتبار سے خدا سبب یا وسیلہ نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز جو پیدائش سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ خود کسی دوسری چیز کا وسیلہ ہے۔ اور دوسری چیزیں اُس کے لئے وسیلہ ہیں۔

عالمِ اسباب کی ہر چیز انسان کے لئے وسیلہ ہے۔ انسان اپنی مختلف خصوصیات کے ساتھ ایک دوسرے کا وسیلہ ہیں۔ ہر مسلمان مسلمان کا وسیلہ ہے۔ خواص عوام کے لئے اعلیٰ و اکرم وسیلہ ہیں۔ اور عوام خواص کی امداد و اعانت کا ذریعہ ہیں۔ حکمران رعیّت کا اور رعیّت حکمرانوں کا وسیلہ ہے۔ اُستاد شاگردوں کا مکرم وسیلہ ہیں۔ اور شاگرد احترامِ اُستاد کا وسیلہ ہیں۔

اولیاء اللہ اُس گروہِ اسلامی کا نام ہے۔ جو علومِ دینیہ کی روشنی میں تقویٰ پائے۔ اور تقویٰ کی روشنی میں اعمالِ صالحہ کرے اور اعمالِ صالحہ کی روشنی میں بصیرتِ عارفانہ پائے۔ اور بصیرتِ عارفانہ کی روشنی میں اعمالِ صالحہ کی باریکیاں معلوم کرنے اور اِن باریک تر راہوں کو عبور کرنے کا مستعدی کے ساتھ عزم کرے۔

سُنّت اللہ اور سنتِ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک رسائی پاکر تقرب حاصل کرے اور تقرب میں اعتراف پائے۔

طریقت کی یہ وہ تربیت ہے۔ جس پر سلوک چلتا ہے۔ ایسی طریقت باشریعت ہوتی ہے۔ اگر اِن لوگوں کا وسیلہ نہ پکڑا جائے تو آدابِ تقویٰ کون سکھائے گا۔

لہٰذا اولیاء اللہ کے وسیلہ کی راہ سلوک یا غیرِ سلوک میں بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔ عوام اُن کے وسیلہ سے دینی اعمال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور اِس رجوع کے بعد اُن میں محبت و اطاعت پیدا ہوتی ہے۔ اور اِس طرح کچھ مدت کے بعد اِن میں سے اہلِ خلوص مرتبۂ سلوک تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور خواص اُن کے رموزِ عارفانہ کا تعجیلاً مفہوم کرنے کے بعد جلد ہی جادۂ سلوک پر چل پڑتے ہیں۔

جیسے حضرت رومی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بڑے متبحرین علمائے وقت سے تھے۔ اور نماز روزہ، حج و زکوٰۃ کے بھی پابند تھے۔ اور صاحبِ حکمت و موعظت بھی تھے۔

مگر حضرت شاہ شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مجلس نے ان کی کایا پلٹ دی۔ جس کا حضرت رومی نے خود اعتراف کیا۔ کہ رومی مولائے روم کا مقام نہ پاسکتا۔ اگر اُسے شاہ شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی غلامی کا شرف نہ نصیب ہوتا۔

اور حضرت خواجہ غریب النواز قطبِ زماں معین الدّین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مخدوم داتا گنج بخش ہجویری کے مزار کی قربت میں بیٹھ کر یہاں تک اعتراف فرمایا ہے۔

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا ۔ ناقصاں راپیرِ کامل کاملاں را راہنما

اکیسواں باب

اخص الخواص کی راہنمائی خواص وعوام کیلئے

حضرت خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اِس تقرب سے جو استفادہ کیا۔ اور اس کو ایک مختصر شعر کے ایک بند میں بیان کر دیا۔ اس استفسار میں اخص الخواص کی راہنمائی خواص وعوام کے لئے ثابت کر دی۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے ایک پرہیز گار گھرانے میں پرہیز گار والدہ کی عاطفت میں طفولیت سے لے کر عنفوانِ شباب تک تربیت پائی۔

بچپن ہی سے آپ کے کرامات ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ متقی ماں کو اِن کرامات کے ظہور پر اندیشہ ہوا۔ کہ کہیں اِن کرامات کی وجہ سے فرید الدین اطاعتِ اسلام میں غفلت شعار نہ ہو جائے۔ اور ریاضت ترک نہ کر دے اور صاحبِ سکر مجذوب نہ ہو جائے۔

آپ نے اس کے ردِّ عمل کے لئے مزید ریاضت کے ساتھ تزکیۂ نفس کے لئے بستی کی شہرت سے دور رکھنے کے لئے جنگلوں میں بھیج دیا۔ بارہ برس حضرت گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ بیابانوں میں رہے۔ اور تزکیۂ نفس کرتے رہے۔

اس حالت میں حضرت بابا جی پر مزید انکشافات وکرامات کی ایزاد ہوئی۔ آپ نے ایک درخت کے سائے میں دجب کے آرام فرما رہے تھے۔ چڑیوں کے شور وغل سے غصّہ میں آکر بد دعا کر دی۔ وہ مرگئیں۔ دوبارہ سینۂ پاک میں رحم وکرم موجزن ہوا۔ آپ نے اُن کے زندہ ہونے کی دعائے خیر کی۔ اللہ کے فضل وکرم سے وہ چڑیاں زندہ ہو گئیں۔

آپ نے جنگلوں میں اتنی ریاضت کی کہ کاٹھ کی روٹی پیٹ پر باندھ رکھی تھی۔ جب بھوک زور پکڑتی تو اُس کاٹھ کی روٹی پر ہاتھ رکھ کر نفس کو فرماتے۔ کہ تھوڑی دیر بعد تمہیں یہ روٹی کھلاؤں گا۔ اِس طرح آپ نے بارہ برس جنگلوں میں متقیانہ عبادات اسلامیہ کے ساتھ اپنا چلہ یعنی اعتکاف پورا کیا۔ اور اس دوران جنگل کے درختوں کی کونپلیں توڑ توڑ کر کھاتے رہے۔

بارہ برس کے بعد جب اپنے گھر لوٹ کر آئے۔ تو ماں نے مزید راہِ سلوک درست کرنے کے لئے صالحانہ نصیحت کی راہ ڈھونڈی۔ آپ کے بال مبارک گرہ در گرہ لپٹے ہُوئے تھے۔ ماں قریب آئیں۔ بچے سے ملیں۔ بال مبارک کی گرہیں کھولنے لگیں۔ تو ایک بال مبارک ذرا زور سے کھینچ دیا۔

جس سے حضرت باباجی کی زبان مبارک سے اظہارِ درد کے لئے کُچھ آواز صادر ہوگئی۔ اس آواز پر باکرامت ماں کے لئے اپنے باکرامت نورِ نظر کو مزید نصیحت دینے کا موقع مِل گیا۔

چنانچہ آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کو نصیحت فرمائی۔ کہ

بیٹا! حالتِ ریاضت میں جب کہ تم اللہ کی راہ میں نفس کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔ بھوک سے تنگ آکر تم نے جن درختوں کی کونپلیں نوچ کر کھائی تھیں۔ تو اُن کو درد نہیں لگتا تھا۔

یہ نصیحت رحم وکرم کا درسِ عارفانہ تھا۔ حالانکہ شرعاً اضطرار میں تزکیۂ نفس کے دوران یا دیگر قسم کے شرعی اضطرار میں کونپلیں یا پھل پھول کھانے یا دیگر حلال چیز کھانے کی ممانعت نہیں ہے نفس کو قابو میں لانے کے لئے فاقہ کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اور فاقہ کے ساتھ قناعت کی عادت بھی مقصود ہوتا ہے۔ فاقہ قناعت اور ریاضت کے ترتیبی مدارج ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ بھوک سے ہلاک ہو جائے۔

مگر حضرت کی والدہ ماجدہ کا اِس نصیحت کرنے کا مقصد یہ تھا کہ میرے بچے کو مزید صبر و استقامت اور توکل ملے۔ اور زیادہ رحم وکرم کی طرف راغب ہو جائے۔

چنانچہ حضرت باباجی نے اس نصیحت کو نہایت ادب کے ساتھ سُنا اور تسلیم کرلیا۔ اور

اپنی والدہ سے دعائیں لیں۔

اس کے بعد حضرت والدہ ماجدہ نے اپنے بچے کو تحصیل علمِ دین کی نصیحت فرمائی۔
کہ کہیں فرید الدین بغیر علمِ دین کے اپنی وہبی کرامات اور بارہ سالہ ریاضت پر فخر و ناز نہ کر بیٹھے ایسی حالت میں وہ کہیں اس نعمتِ خداداد سے محروم نہ ہو جائے۔

فرمایا۔ بیٹا! بہت جلد تحصیلِ علمِ دین کے لئے رختِ سفر باندھو۔

چنانچہ اس بارہ سالہ ریاضت کے بعد آپ نے بارشادِ والدہ ماجدہ تحصیلِ علمِ دین کے لئے سفر اختیار کیا۔ اور کچھ مدت کے بعد علوم دینیہ سے فراغت پاکر اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو والدہ نے فرمایا۔ تقویٰ کے لئے علمِ دین کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے بعد باباجی کی والدہ کو مزید خوف ہوا۔ کہ اب فرید الدین صاحبِ کرامت ہونے کے ساتھ فضیلت علمِ دین بھی حاصل کر چکا ہے۔ اب یہ دو فضیلتوں کا حامل ہے۔ رہبر طریقت کے بغیر کہیں عُجبِ نفس کا شکار نہ ہو جائے۔

چنانچہ آپ نے اُس وقت کے سب سے بڑے عارفِ باللہ متقی ولیِ کامل حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جاکر آدابِ دین کے ساتھ آدابِ بندگی اور آدابِ سلوک حاصل کرنے کی نصیحت فرمائی۔

فرمایا۔ بیٹا!

بہت جلد میری نصیحت کے مطابق حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت تک پہنچو۔ اور میری نصیحت کے مطابق خدمتِ بابرکت میں باادب و نیاز حاضری دو۔ اگر میری نصیحت کے خلاف سرِمو بھی فرق کیا تو فیضِ کامل نہ پاسکو گے۔

فیضِ عام تو عوام کے لئے ہے۔ تم نے اگر فیضِ خاص پانا ہے تو شیخ کے سامنے اپنی تمام صلاحیتوں کو بھول جانا۔ اپنے آپ کو نسیاً نسیاً کر دینا۔ صرف آدابِ دین کی روشنی میں آدابِ ولی اللہ کی بجا آوری کے لئے اصباغ الوضو یعنی کامل وضو کے ساتھ نہایت خشیت کی حالت میں خدا کے حضور میں دو رکعت نماز نفل ادا کر کے حصولِ اکتساب فیضِ طریقت کے لئے سفر میں قدم رکھو۔ اور سفر کے چپہ چپہ پر دوگانہ ادا کرتے ہوئے درِ مرشدِ کامل پر پہنچو۔

اور جب درِ اقدس نظر آئے۔ تو وہاں بھی دوگانہ للّٰہِ تعالیٰ ادا کرو۔ پھر دہلیز پر جاؤ۔ اور آنکھیں نیچی کرلو۔ اور ذکر اللہ کو وردِ زبان رکھو۔

اولیاء اللہ زبانی باتوں سے خوش نہیں ہوتے اور نہ ہی وہاں کوئی رطب اللسانی کام آسکتی ہے وہ عاشقانِ باللہ ہوتے ہیں۔ اُن کا معشوق معشوقِ حقیقی یعنی اللہ تعالےٰ کی ذات ہوتی ہے۔ اور وہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شیفتہ ہوتے ہیں۔ وہ صرف ذکر اللہ اور درود شریف سے ہی انبساط پاتے ہیں۔

جو اُن کی مجلس میں باوضو ہو کر ذکرِ الٰہی کرے اور درود شریف پڑھے۔ وہی فیض پاتا ہے۔ اس کے دِل کے رموز اللہ تعالےٰ اپنے ولیوں پر منکشف کر دیتا ہے۔ اور ایسے انکشاف پر وہ حسبِ ضرورت دعائے خیر و برکت کر دیتے ہیں۔

اور بفضل اللہ نگاہِ عنایت سے خود بخود نواز دیتے ہیں۔ وہاں کسی اختراعی چاپلوسی یا صفت سے کام نہیں چلتا۔ وہ بقدر مراتب سب پر نظر رکھتے ہیں۔

فرمایا۔ جب حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں پہنچنا نصیب ہو جائے تو آنکھیں نیچی رکھنا۔ چونکہ انسانی آنکھ کے پیچھے عقل و نفس موجود ہوتے ہیں۔ جو طرح طرح کی موشگافیاں کرتے ہیں۔

اگر عقیدہ میں رمق برابر بھی لغزش واقع ہو جائے تو طالب کی نگاہِ طلب میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ سبیلِ عقیدہ سے اُتر کر نفس و عقل موہوم کے تصورات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ لہٰذا میرے بیٹے فریدالدین!۔

حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ وقت کے عظیم ترین پیشوائے طریقت اور دانائے شریعت ہیں۔ اُن کے چہرۂ اقدس پر میری نصیحت کے مطابق نظر ڈالنا۔

مردانِ خدا کو دیکھنے کے لئے ایک خاص معیارِ نظر ہوتا ہے۔ اگر آنکھ شبہ کر بیٹھے۔ تو یہ فتورِ نفس ہوگا، جس سے وہ پاک آنکھیں جو دیدارِ اولیاء اللہ کے ساتھ کفارۂ گناہ چاہنے والی ہوتی ہیں۔ بجائے کفارۂ گناہ کے اُلٹا اشتہارِ جرم سے اپنی ردائے آنکھ کو داغدار کر دیتی ہیں۔ عقل و دلِ و نگاہ کے داغ اللہ تعالےٰ کے بندوں پر روشن ہو جاتے ہیں۔

پھر نصیحت فرمائی ۔ کہ فریدالدین جب مُرشد کامل کوئی حکم دیں ۔ تو اُس حکم کے مِلنے پر دوبارہ استفسار کی خواہش نہ کرنا ۔ حکمِ مُرشد کو پوری دِل جمعی اور مستعدی کے ساتھ سُننا ۔ تاکہ کوئی گوشۂ حکم تمہاری سمجھ سے باہر نہ رہے ۔ اور تم تعمیلِ حکم کی بجاآوری میں اپنی فرمانبرداری کا پورا ثبوت دے سکو ۔ اور یہ بجاآوری خلوص دِل سے ہو ۔ اِس میں کوئی ریا کا شائبہ تک موجود نہ ہو ۔

یہ ظاہر ہے کہ مقرّبینِ خدا کسی نیک کام ہی کے لئے حکم کرتے ہیں ۔ جو منشائے خداوندی کے مطابق ہوتا ہے ۔ اور بندگی کے ضمن میں ہوتا ہے بس اُس حکم کو سُنو اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ بغیر کسی غلّ و غش کے اس کو سرانجام دو ۔

اور تعمیل کے بعد پھر خاموش اور باادب بیٹھ جاؤ ۔ اور حکمِ ثانی کا انتظار کرو ۔ یہ خادم کی صفت خادمانہ ہے ۔ اِس کے بغیر کوئی خادم بھی صادق نہیں بن سکتا ۔ مخدوم کے سامنے خادم خدمتِ صادقہ سے ہی رضاجوئی پاسکتا ہے ۔

اور پھر مخدوم مقرب باللہ اور صاحبِ عرفان ہو ۔ عقل و دِل و نگاہ میں اللہ تعالےٰ کی معیت رکھتا ہو اور خدا کے نورِ عشق سے اُس کا ظاہر و باطن بھی منور ہو ۔ تو ایسے مخدوم سے خادم کی خدمات کسی طرح بھی مخفی نہیں ہوسکتیں ۔

فرمایا ۔ میری اِن نصیحتوں کو بامانت محفوظ کرلو ۔ اور اللہ کا نام لے کر حسبِ ہدایت مُرشدِ کامل کی طرف رختِ سفر باندھ لو ۔ اللہ تعالےٰ تمہارا نگہبان اور محافظ ہے ۔ مَیں تمہیں بندۂ خدا بنانے کے لئے بندۂ خدا کے پاس بھیج رہی ہوں ۔ یہ اللہ کا راستہ ہے ۔ اللہ تک پہنچنے کے لئے نیک وسیلے ڈھونڈو ، اللہ تعالےٰ تمہاری ضرور مدد کرے گا ۔

اِس کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے کے لئے حضرت گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے باطہارتِ کاملہ نہایت عجز و انکسار بندگانہ کے ساتھ دو رکعت نمازِ شکرانہ خداوندِ ذوالجلال ادا کئے ۔ اور ذکر اللہ و ذکرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ سے اکتسابِ فیض کے لئے سفر میں قدم رکھا اور نوافل پڑھتے ہوئے ، ذکر اللہ کرتے ہوئے پورے یقین و ایمان کے ساتھ آگے بڑھتے گئے ۔

یہاں تک کہ درِ مُرشد کامل تک پہنچ گئے۔ اور درِ ولی اللہ پر پہنچ کر دوگانہ ادا کیا اور نہایت ادب واحترام کے ساتھ آپ کے حجرۂ مبارک میں داخل ہُوئے اور مسنون سلام عرض کرتے ہُوئے دو زانو بیٹھ گئے۔ اور حسبِ نصیحت مُرشدِ کامل کے چہرۂ اقدس پر نظر تک نہ ڈالی اور کلامِ مُرشد سنتے رہے۔ اور روحانی طور پر محفوظ ہوتے رہے۔

آپ نے اسی دستور العمل پر کاربند رہ کر اپنے مُرشدِ پاک سالک راہِ حقیقت کی عارفانہ رضاو خوشنودی حاصل کر لی۔

ایک مرتبہ حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے معاً حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو ارشاد فرمایا۔ کہ فریدجاؤ۔ اور اتنی مدّت اللہ کی راہ میں چلّہ گذارو۔ آپ نے بلا تامّل بلا استفسار تعمیلاً بجاآوری کی۔ اور ایک جگہ پر اللہ تعالےٰ کی عبادت شروع کر دی۔ بوقت حکمِ مُرشد صرف عبادت الٰہی کے ساتھ چلّہ گذارنے کا ارشاد ہُوا تھا۔

مگر اس حکم میں طریقِ چلّہ یا دوسرے ضروری لوازمات پر کوئی ذکر نہ ہُوا تھا۔ اور آپ نے حسبِ دستور استفسار کے متعلق بھی لب کُشائی نہ فرمائی تھی۔ اور ارشاد اول کو ہی پُورا فرمایا۔ آپ نے اس دوران نہ ہی روٹی کھائی نہ پانی پیا۔ نہ ہی اپنی عبادت گاہ سے اُٹھ کر کوئی دوسرا کام کیا۔

اس طرح پورے آٹھ یوم گذر گئے۔ آپ کا جسم مُبارک بچپن سے لے کر اس وقت تک مُسلسل ریاضت کی وجہ سے پہلے ہی بے حد نحیف تھا۔ اس پر اس آٹھ یوم کی مُسلسل اور کڑی ریاضت نے آپ کو بے حد نحیف و ناتواں کر دیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مُرشد طریقت تھے۔ آپ کو اپنے عارفانہ کشف سے معلوم ہُوا۔ کہ فریدالدین گنج شکر کس حالت میں کس قدر لاغر ہو چکا ہے۔

چنانچہ حضرت خواجہ غریب النواز، حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے۔ اور اُن کو ہمراہ لیا، اور بابا فریدالدین کے پاس وہاں پہنچے۔ جہاں آپ بصورتِ چلّہ معتکف تھے۔ دونوں حضرات نے قریب پہنچ کر سلام مسنون دیا۔

حضرت بابا فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کو دیکھا۔ تو فوراً ادب کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مگر

اس قدر نڈھال ہو چکے تھے۔ کہ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی قیام نہ کر سکے اور فرشِ زمین پر گر پڑے۔ دونوں حضرات نے اُن کو مبارک دیتے ہوئے سہارا دے کر اُٹھایا۔ اور کھڑا کر دیا۔ عین ایسے عالم میں جب کہ زمانہ بھر کی عظیم عارفانِ باللہ شخصیات نے آپ کو اُٹھایا اور سہارا دیا۔ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ۔ بختیار تم نے اِس کو ہلاک کر دیا۔

فرمایا۔ فریدالدین تم باکمال ولی اللہ ہو۔ تم کامیاب ہو گئے ہو۔ تمہیں مبارک ہو دونوں شیخین نے مبارک باد دی۔ اور اپنی نیک دعاؤں کے ساتھ اُن کو نوازا۔

اس کے بعد جلد ہی شیخین نے کسی امرِ خاص کی بناء پر آپ کو موجودہ پاکپتن شریف چلے جانے کا حکم ثانی صادر فرمایا۔

اس وقت موجودہ پاکپتن کا نام اجودھن تھا۔ یعنی اجودھن چلے جاؤ۔ آپ نے تعمیلِ حکم میں اجودھن یعنی پاکپتن شریف کی طرف رجوع فرمایا۔ اور ایک مدّت کے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے پاکپتن شریف پہنچ گئے۔

میرے والد بزرگوار نے فرمایا۔

مردانِ خدا کی کوئی بات خالی از مقصد دین نہیں ہوتی۔ اُن کا مریدوں پر فیضِ نظر تربیّتِ دین کے لئے اور اشاعتِ دین کے لئے ہوتا ہے۔ تاکہ مریدین عقیدتِ صالحانہ کے ساتھ تربیّت پا کر صرف اللہ کے بندے ہو جائیں۔ اور اپنی مستعار زندگی کو صرف رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے عبادات و معاملات کی صحیح پابندی کریں۔ اور اسلامی تعلیمات کو اپنی عارفانہ تبلیغ کے ساتھ لوگوں تک پہنچائیں۔ اور اشاعتِ دین کے فرائض انجام دیں۔

اُن کی مجموعی زندگی کے مجموعی اعمال صرف اظہارِ عبودیت کے لئے ہوں۔ وہ خود فنا ہو کر اس بادشاہ مطلق کو ظاہر کریں۔ جس نے خود مخفی ہو کر ساری مخلوق کو ظاہر فرمایا۔

حقِ بندگی اسی طرح ادا ہو سکتا ہے۔ کہ سالک یہ سمجھے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے آپ کو چھپایا اور ہم کو ظاہر کیا۔

اب ہم پر فرض ہے کہ ہم اس کی بندگی میں گُم ہو کر اُس کو ظاہر کریں۔ اور اُس کو ظاہر کرنے کا احسن طریقہ یہی ہے۔ کہ اس کی مرضیات کو سب مرضیات پر ترجیح دیں۔ اُس کے احکامات کو

لوگوں تک پہنچائیں۔ اس کی ذاتِ حقہ کی حقیقت کا ثبوت پیش کریں۔

سالکانِ راہِ حقیقت کے اعمال مبنی بر شریعت ہوتے ہیں۔ اُن کی تعمیلی نتائج کے اعتبار سے جو نتیجہ بھی مرتب ہوگا وہ اشاعتِ دین ہوگا۔

چنانچہ حضرت فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اس یقین و ایمان کے ساتھ پاکپٹن شریف پہنچے۔ کہ شیخین کا ارشاد خالی از مقصد نہیں۔ اس میں یقیناً کوئی دینی مقصد کارفرما ہے، جو تعمیلِ حکم کے ساتھ ہی سامنے آسکے گا۔

چنانچہ جب آپ تعمیلِ حکم کے لئے پاکپٹن شریف پہنچے، تو آپ نے کسی ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کی عبادت شروع کردی۔ اجودھن کے علاقہ میں ایک شخص شنبھوناتھ جوگی رہتا تھا جو مذہباً ہندو تھا۔ اور صاحبِ استدراج تھا۔ استدراجی عملیات کے زور سے وہ بڑی بڑی شعبدہ بازیوں کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس کا ایک معروف شعبدہ یہ بھی تھا کہ وہ ایک وقت میں تین من کے قریب دُودھ پی لیتا تھا۔ (واللہ اعلم)۔

اُس کی ان شعبدہ بازیوں کی بناء پر سوالاکھ جوگی اس کی اطاعت میں سربکف جانباز عقیدت مند تھے۔

مگر وہ بعض دفعہ اپنے ان جوگیوں میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار اس طرح کردیا کرتا تھا۔ کہ میں اپنی منزل میں نامکمل ہوں۔ اور تکمیلِ منزل کے لئے مجھے کسی مردِ کامل کی انتظار ہے۔ اور ایسے مردِ کامل کے ساتھ میری ملاقات مشروط ہوگی۔ اگر میری شرائط وہ پوری کرے گا۔ تو میں اُس کا مطیع و منقاد ہوجاؤں گا۔

اِدھر شنبھوناتھ جوگی اپنے عقیدت مندوں میں ان خیالات کا اظہار کررہا تھا۔ کہ اُدھر حضرت خواجہ غریب النواز علیہ الرحمت اور حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ تعالیٰ نے جوگی کے خیالات منکشف کردیئے۔

بنابریں ان دونوں حضرات نے اپنی نگاہِ عارفانہ کے ساتھ شنبھوناتھ جوگی کو استدراج کے مقابلہ کے لئے حضرت باباجی کو ہی موزوں پاکر مقابلہ کے لئے مامور فرمادیا۔

مگر اس راز کو باباجی پر واضح نہ کیا۔ کہ ایسے معروف مُستدرج کے مشروط مطالبہ کو کرامت متقیا نہ

سے پُورا کرنے کی اہلیت اللہ تعالےٰ نے گنج شکر کو ہی دے رکھی ہے۔

لٰہذا شنبھو ناتھ جوگی کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ کو تیار کرنا چاہیئے۔ یہ کاملین کے توسل کا نتیجہ تھا۔ جو حضرت بابا جی پر منزل بمنزل کمالات بن بن کر ظاہر ہوتا رہا۔

حضرت بابا فریدالدین علیہ الرحمتہ بلا تردد اور بلا تامل تعمیلِ احکامات کو عملی جامہ پہنا لیتے۔ کیا مجال کہ کسی مقام پر سہواً بھی تعمیلِ حکم میں تاخیر کی ہو۔ ہر تعمیل میں ارکانِ دین کی پوری پوری بجاآوری کی۔ اور اس باعظمت مقام تک پہنچ گئے۔ کہ شنبھو ناتھ جوگی جیسے اپنے زمانہ کے مانے ہوئے صاحبِ استدراج کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے مامور فرمائے گئے۔

جب آپ اجودھن کے جنگل میں پہنچے، تو اس وقت شنبھو ناتھ کو اپنے استدراجانہ روح سے معلوم ہوا۔ کہ اس علاقہ میں کوئی مردِ کامل آگیا ہے۔ اُس نے اپنے ارادت مند چیلوں کو بلایا۔ اور اُن سے مردِ کامل کے ورودِ مسعود کا ذکر کیا۔ کہ اس علاقہ سے مجھے کسی مردِ کامل کی خوشبو آرہی ہے۔ چنانچہ وہ سبیلِ خوشبو پر اُس مردِ کامل کی تلاش میں نکل پڑا اور آپ کو پالیا۔

دیکھا کہ حضرت بابا جی محوِ عبادت ہیں۔ آپ اُس وقت عالمِ استغراق میں تھے۔ ایسے عالم میں شنبھو ناتھ جوگی اپنے متعدد چیلوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔

شنبھو ناتھ جوگی کی شرائط یہ تھیں۔ کہ جس مردِ کامل کی نگاہ اول سے میرے کانوں کے وہ مندرے جن میں کوئی آنچ یا جوڑ نہیں۔ گر جائیں۔ دوسری شرط یہ تھی۔ کہ میں استدراجی تصرف سے مرجاؤں گا۔ اور میرے مرنے کے بعد وہ مردِ کامل میرے مُردہ جسم میں میری روح کو لوٹا دے۔ جس سے میں زندہ ہوجاؤں۔ اِن دو شرائط کے مکمل ہونے پر میں اُس مردِ کامل کا مطیع ہوجاؤں گا۔

شنبھو ناتھ جوگی نے جب حضرت بابا جی کو محوِ عبادت پایا۔ تو با ادب ہو کر سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔

حضرت بابا جی کی آنکھ بالاتفاق اُٹھی۔ اور جوں ہی اُس جوگی پر حضرت کی نگاہِ اول یکبارگی

پڑی ۔ شنبھو ناتھ جوگی کے وہ مُندرے جو اُس کے کانوں میں استدراجی قوت سے پڑھے تھے۔ گر گئے۔ مُندروں کا گرنا ہی تھا۔ کہ وہ فوراً زمین پر لیٹ گیا۔ اور بالاستدراج اُس نے اپنی روح کو بدن سے خارج کر دیا۔

اُس وقت حضرت باباجی کو فرمانِ مُرشد یاد آیا۔ کہ مجھے اس علاقہ میں جس مقصدِ خاص کے لئے مامور کیا گیا ہے ۔ وہ یہی ہے ۔ جس سے مُراد دعوتِ حق ہے ۔ میرے سامنے یہ کوئی غیر مُسلم جوگی ہے ۔ جو مر گیا ہے ۔

اُس وقت سینہ پر القا ہوا ۔ کہ یہ ایک غیر مُسلم جوگی ہے ۔ جو مردِ کامل کی تلاش میں ہے ۔ اور اس کی کچھ شرائط ہیں ۔ اُن میں سے ایک شرط آپ کی نگاہِ اوّل سے اللہ کے فضل سے پوری ہو چکی ہے ۔ یعنی اس کے مُندرے کانوں سے گر چکے ہیں ۔ اور دوسری شرط باقی ہے ، جس کو وہ بصورتِ موت پیش کر چکا ہے ۔

اس وقت حضرت بابا رحمتہ اللہ علیہ نے آسمان کی طرف نگاہ مُبارک اُٹھائی ۔ دیکھا کہ شنبھو ناتھ جوگی کی روح آسمانوں کی طرف جا رہی ہے ۔

اُس وقت آپ نے جو دعا بارگاہِ رب العزت میں فرمائی ۔ وہ قابلِ غور ہے ۔ اور سالکین راہِ طریقت کے لئے ایک کھُلی تعلیم ہے ۔ کہ مردانِ خدا جب دعا کرتے ہیں ۔ تو وہ سرِ مو بھی اُصولِ حق کے خلاف نہیں ہوتی ۔

آپ نے دعا مانگی ۔

الہٰ العالمین یہ ایک غیر مُسلم ہے ۔ جو تلاشِ حق میں سر گرداں ہے ۔ آج یہ تیرے ایک ایسے بندۂ عاجز کے پاس پہنچ چکا ہے ۔ جو صرف تیری مرضیات پر ہی ہر فیصلہ محفوظ رکھتا ہے ۔ اور تیری ہی شریعت کے مطابق ہر بات کرتا ہے ۔

اے اللہ اس کی ایک شرط تو خود پوری فرما کر اپنے بندۂ عاجز کو عزّت بخشی ہے ۔ اب اس کی روح کو جسم میں واپس لوٹانے پر بھی تو ہی قادر ہے ۔ تیرے فضل سے اگر اس کی روح واپس لوٹ آئے تو میں اسے دعوتِ اسلام دوں گا ۔ جس پر یہ مُسلمان ہو جائے گا ۔ اور اسے کفر سے نجات مِلے گی ۔ اور مجھے دعوتِ اسلام دینے کا ثواب ملے گا ۔

نیز اس کے مسلمان ہونے سے لاکھوں جوگی جو اس کے معتقد ہیں۔ اسلام قبول کر لیں گے تیری قدرت وسیع تر ہے۔

یہ دعا فرما ہی رہے تھے۔ کہ روح واپس لوٹ آئی۔ اور شنبھوناتھ جوگی کے بدن میں زندگی کی حرکت پیدا ہوئی۔ اور وہ زندہ ہوگیا۔ بعد وہ آپ کے پاؤں پر باعجز و نیاز گر پڑا۔

آپ نے فرمایا۔

شنبھوناتھ کلمہ طیبہ پڑھو۔ اور مسلمان ہو جاؤ۔ کیونکہ یہ سب کچھ اللہ کی عنایت سے ہُوا اُس ذات پر ایمان لاؤ۔ جس نے مجھے دعوتِ حق دینے کی توفیق بخشی۔ اور تجھے یہ دعوت قبول کرنے کا موقع بخشا۔

چنانچہ شنبھوناتھ جوگی نے اپنے شرائط پورا ہونے پر حضرت باباجی رحمتہ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر لیا۔ اُس کے قبولِ اسلام کے بعد اُس کے لاکھوں چیلے بھی مشرف باسلام ہوگئے۔ اور سب نے یکے بعد دیگرے آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر لیا۔

اِس طرح حضرت باباجی نے اپنی والدہ کی نصیحت کے مُطابق اور شیخِ طریقت کے ارشادات کو پورا فرما کر بندگی کی راہ پائی۔ اور سالکِ باللہ ہُوئے۔ اِس سلوک کے ساتھ تبلیغِ دین کے فرائض انجام دیئے۔ اور لکھوکھا غیر مُسلمین کو دعوتِ حق دینے میں کامیابی پائی۔

اِس طرح پاکپتن شریف مرکزِ رشد و ہدایت بن گیا۔ جہاں سے بکثرت انسانیت نے مشرف باسلام ہو کر ہدایت پائی۔ اور تشنگان معرفت نے سیراب ہو کر جام عرفان نوش فرمائے۔

سالکینِ طریقت کو معلوم ہو۔ کہ وسیلہ نسبت چاہتا ہے۔ اور نسبت سے مُراد سالکین طریقت و شریعت کے ائمہ ہیں۔

بائیسواں باب

مُرشد سے مراد صاحبِ علم و عمل اولی الامر ہے

ائمۂ طریقت کی نسبتِ عشق بہر طور سبیلِ دین کے ذریعہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مِل جاتی ہے۔ اور ہر مُرشدِ طریقت کا ہاتھ کسی مُرشد کے ذریعہ اربعہ طُرق میں سے کسی ایک امام طریقت سے مِل کر رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچ جاتا ہے۔ جس سے مراد اطاعتِ رسول کیساتھ اطاعتِ دین کو مکمل کرنا ہوتا ہے۔

مرشد باشریعت کے ذریعہ کتاب وسنت کی پیروی اور کتاب وسنت کے ذریعہ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی اور نبی اللہ کی پیروی سے خدائے مُطلق کی پیروی مِلتی ہے۔

یہ سب کچھ ایک بندگی کے لئے ہوتا ہے۔ باشریعت مُرشد کی اطاعت سے مراد اولی الامر کی اطاعت ہوتی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اللہ اور رسول سے عرفان پاتا ہے۔ اور احکامات کو عملاً پورا کرنے کی اسلامی راہ مِل جاتی ہے۔ اور سالکِ راہ ارکانِ اعمال دین کی رعایت کے ساتھ سلوک کی راہ پانے میں اور اُسے مکمل کرنے میں آسانی پاتا ہے۔

بِلا پابندیٔ دین محض ارکانِ دین کو رٹ لینے سے کوئی متقی نہیں بن سکتا۔ ایسے لوگوں پر فاضل وعالم کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مگر وہ عنداللہ باعمل متقی نہیں بن سکتے۔ اور جو باعمل متقی نہ ہوسکے۔ وہ آدابِ بندگی نہیں پاسکتا۔

منازلِ بندگی کی صحیح ادائیگی ہی آدابِ دین کا وسیلہ ہوتی ہے۔ اور آدابِ دین ہی وسیلۂ تقویٰ ہوتے ہیں۔

اسلام میں کوئی خارجی یعنی غیر اسلامی ادب متقی ہونے میں مددگار نہیں ہوسکتا۔ بلکہ غیر اسلامی ادب

متقی ہونے کی ضد ہے۔ اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ صرف اسلامی تقوٰی ہے۔

جیسا کہ حدیث شریف ہے۔

مَنْ لَّا اَدَبَ لَہٗ لَا دِیْنَ لَہٗ۔ وَ مَنْ لَّا وَرَعَ لَہٗ لَا زُلْفَ لَہٗ۔

جو صاحبِ ادب نہیں۔ وہ صاحبِ دین نہیں۔ اور جو متقی نہیں، وہ صاحبِ وصل نہیں دین سارے کا سارا ایک آخری اور کامل ادب کا مجموعہ ہے۔

جو آدابِ روحانیت سے لے کر آدابِ جسمانی تک اور آدابِ فردی سے لے کر آدابِ اجتماع تک راہنمائی کرتا ہے۔ دنیا بھر کے خارجی آداب اکٹھے کئے جائیں تو وہ مسلمان بندہ مومن کی ایک بسم اللہ کی گردِ راہ تک بھی نہیں بن سکتے۔

اِس تعریف میں میرا ذہن کسی عصبیت سے متاثر نہیں۔ بلکہ اسلامی سچائیوں کی عاطفت میں وسیلہ کی تشریح کر رہا ہوں۔

اسلام ایک ایسا کامل مذہب ہے، جو اپنے پیروکار کو خارجی تاثرات سے متاثر ہونے سے قبل اُس کی داخلی دُنیا کو حقیقتِ اسلام سے متعارف کرتا ہے۔ اور راہِ حقیقت پر چلاتا ہے۔ وہ کسی فانی نظریۂ حیات سے دعوتِ عمل نہیں دیتا۔ بلکہ وہ ایک لازوال اور غیر فانی معبودِ برحق کی طرف روح و جسم کے اشتراکِ عمل سے ایک خاص مجوزہ دستور العمل کی پابندی کے ساتھ رموزِ زندگی حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

اسلام کے نزدیک اِن رموز کو حاصل کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ تاکہ سالک پر مالکِ مختار کے حقائق واضح ہوں۔ جو اُسے مزید محبتِ الٰہی کی چاشنی دیں۔ اور وہ مزید تحریصِ عمل پا کر مزید نیکی پائے۔ اور نیکیوں کے ساتھ خدا کو راضی کرلے۔

اِسلام کا اندازِ طریقت کس قدر لطیف و پاک ہے۔ جس کا آئین و منشور ہماری باطنی دنیا پر ظاہر سے کہیں زیادہ حکمرانی کرتا ہے۔ اسلام سالکِ راہ کے ظاہر کو باطن کا پابند رکھتا ہے۔ تاکہ ظاہری آداب اطمینان کے ساتھ ادا کئے جاسکیں۔

اولیائے اُمت نے وسیلہ سے مراد حصولِ تقوٰی لیا ہے۔ کہ ہر صوفی منش کو یہ بات کبھی اور کسی حالت میں نہ بھولنی چاہیئے۔ کہ وہ غیر متقی ہو کر محض اختراعی استغراق و مستی کے ساتھ خدا کو نہیں

پا سکتا۔

یہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہٹ کر ایک گمراہانہ طرزِ تصوّف ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ فریبِ نظر بن کر لوگوں کے لئے ضعفِ روحانیت کا باعث بن سکتے ہیں۔

عجمی تصوّف میں طُرقِ ائمہ طریقت کے دستور العمل کے خلاف جو تصوف بھی نظر آئے، اُسے خلاف دین اسلام سمجھنا چاہیئے۔

چونکہ متشرع صوفیا نے ہمیشہ تصوّف اسلام کی حکمت و موعظت اسلامی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ کچھ صوفیا نے غیر مُسلموں کی ہدایت کے لئے زائد طور پر بھی کچھ اشغال شامل کر لی تھیں۔ جو حکمتِ اسلام سے تصوف میں داخل کی گئی تھیں۔

مگر اُن سے یہ مراد نہیں۔ کہ مسلمان اُن پر دوامی عمل جاری رکھیں۔ انہوں نے کچھ باتیں خواص کے لئے اور کچھ عوام کے لئے مخصوص کر دی تھیں۔ عوام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بلا سوچے سمجھے خواص کے اِن باریک رموز کو اختیار کریں، جن پر انہیں عبور نہیں ہے۔ اور عوام کے اُن عمومی اعمال واشغال کو خواص اختیار نہ کریں۔

چونکہ اُن کے قرینے غیر مستقل ہوتے ہیں۔ اِس طریقِ عمل میں عوام و خواص کی تفریقِ حدود سے آدابِ دین کی حفاظت ہوتی ہے۔ تقویٰ خود بذاتہٖ متقی کے لئے جامع الحسنات ہو کر مانع المعاصی بن جاتا ہے۔ وہ نہ تو متقی کی سعادتمندیوں کو ضائع ہونے دیتا ہے۔ اور نہ ہی متقی میں غیر اسلامی شعائر کو داخل ہونے کا موقع دیتا ہے۔

وہ ہمیشہ متقی کو حدود دینیہ کے اندر رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ اور حفظِ ماتقدم کے لئے بار بار اس کی روح کو خوفِ خدا سے لرزہ براندام رکھتا ہے۔ یہی خوفِ خدا اساسِ تقویٰ ہے۔

اگر صرف خوفِ خدا میں کمی واقع ہو جائے تو تقویٰ میں کمی واقع ہو جاتی ہے اس واسطے کہ تقویٰ کے معنی اللہ سے ڈر کر احکامات کی بالاحتیاط پابندی کرنا ہے۔ متقی ڈرنے والے کو کہتے ہیں۔ اور ڈر ہی ایک ایسی چیز ہے، جو پرہیز کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

اسلام میں ڈر کے معنی محض ڈرنے کے نہیں۔ بلکہ ڈرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے جو چیزیں حرام کی ہیں، اُن سے بچو۔ اور جو حلال کی ہیں، اُن کو اختیار کرو۔

متقی کو اگر چلتے پانی پر بھی وقتی طور پر شبہ ہو جائے۔ یا اُس کی پاکیزہ روح پر کراہیت واقع ہو جائے تو وضو نہ کرے، تو فقہار کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ چونکہ اس طریق احتیاط میں حفاظتِ تقوٰی کے لئے باریک تر پرہیزگاری کا ثبوت مِلتا ہے۔

اگرچہ علمائے ظاہر کے نزدیک چلتے پانی پر ایک مقدار بہاؤ کے مطابق وضو کرنا جائز ہے۔ مگر متقی کو حالتِ کراہیت میں کسی قریب تر پانی مِلنے کی اُمید ہو، تو وہ ایسے چلتے پانی سے بھی وضو نہ کرے، جس پر اُس کی متقیانہ رُوح میں تکدر پیدا ہو جائے۔

اگر نماز قریب ہو۔ اور وضو ضروری ہو۔ تو یہ حالتِ اضطرار ہے۔ پھر متقی کو محض تکدر طبع پر ترکِ وضو نہ کرنا چاہیئے۔ اور وضو کرنا ہی اس کے لئے بہتر ہے۔

معرفتِ الٰہی کے حصول کے لئے جس سلوک کو ذریعہ بنایا گیا ہے وُہ محض رسم و رواج نہیں۔ بلکہ اسلام کے وضع کردہ ایک طریقِ عمل کا نام ہے۔ غیر متقی راہِ حقیقت نہیں پا سکتا۔

اگر غیر متقی لوگ سالکِ راہ ہونے کا دعوٰی کریں۔ تو اِس طرح حق پرستی کی راہیں دھندلی ہو جاتی ہیں ایسے جہلا جب سالکین کا لبادہ اوڑھ لیں تو اہلِ حق کی تبلیغ میں بڑی خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔

مگر پھر بھی حق حق ہے۔ وہ ہزار مائیلات اور جہالت کے دلدلوں سے اُبھر کر بار بار سامنے آجاتا ہے۔ یہ فیصلہ خداوندی ہے۔ سایہ ہر چراغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور ہر روشن دیوار کا ایک حصہ سایۂ دیوار بھی بن جاتا ہے اور یہ دنیا بھی تو ایک سایہ ہے۔ سائے جہاں سائے ہوتے ہیں، وہاں امتیازِ انوار کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ رات امتیازِ نہار کا ذریعہ ہے۔

کذب کی وجہ سے سچائی کا وجود ختم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے ذریعہ سچائی نکھر کر سامنے آجاتی ہے کفر اسلام کو امتیاز دیتا ہے۔ باطل سے حق واضح ہو جاتا ہے۔ معبودانِ باطلہ کی بے ثباتی معبودِ مُطلق ہونے کے عقیدہ کو ثبات دیتی ہے۔ معبودانِ باطل اپنی فنا کے ساتھ غیر فانی معبود کے لئے ذریعہ امتیاز ہو جاتے ہیں۔

بہرکیف ہر زمانہ میں اہلِ حق سالکینِ طریقت اللہ کے فضل و کرم سے موجود رہتے ہیں۔ اور

تابحدِ قیامت موجود رہیں گے۔ اُن کے متعلق طالبینِ حق کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر طالبِ حق کی مثال پیاسے کے مانند ہونی چاہیئے۔ کہ پیاسہ پانی کی تلاش دمِ واپسیں تک جاری رکھتا ہے۔ اور پانی کے مِل جانے پر زندگی پالیتا ہے۔ ورنہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجازی پانی کی تلاش بھی مجاز ہے۔ اور راہِ مجاز میں تلاشِ آب صرف نفسانی زندگی تک محدود ہے۔ اور اُس کی ناکامی کی موت صرف موت پر ہی اتمام کرتی ہے۔

مگر راہِ حق میں وصول الی اللہ کے لئے سالکِ راہ کی مردِ کامل کے لئے جستجو پیاس کی صورت اختیار کرلے۔ تو یقیناً اللہ تعالیٰ ایسے جستجو کرنے والے کی تائید فرماتا ہے۔

اِس لئے کہ اُس نے اپنے ایماندار بندوں کے ساتھ دوستداری کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کہ وُہ اُن پر ہدایت کی راہیں کھولے گا۔ اور اندھیروں سے روشنی کی طرف لے جائے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادُ اللہ تعالےٰ اپنے وعدے میں خلاف نہیں کرتے۔

اور اللہ کا اہلِ ایمان سے وعدہ ہے۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ یعنی اللہ تعالےٰ اہلِ ایمان کا دوستدار ہے۔ اور وہ اہلِ اسلام کے ساتھ اپنی دوستی اِس طرح کرتا ہے، کہ اُن کو بے دینی سے بچاتا ہے۔ اور اسلام کی ہدایت دیتا ہے۔

نیک بندے اللہ تعالےٰ کی راہ میں ہمیشہ نیک ذریعے، نیک وسیلے ڈھونڈتے رہتے ہیں ایسی جستجو اہلِ حق کا شیوہ رہا ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کو پسند ہے۔ اگر خدانخواستہ راہِ حق میں مُرشدِ کامل کی تلاش میں کوئی جستجو کرنے والا پیاسا موت سے ہلاک ہو جائے۔ تو بھی اُس کو اپنی نیک جستجو کا اجر ملے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ نیکو کاروں کی کسی نیکی کا اجر اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتے۔

طالبِ حق کے لئے ضروری ہے کہ راہِ حق میں جن جن علمی و عملی، صوری و معنوی وسائل کی ضرورت ہے۔ اُن کو تا دمِ آخر تلاش کرتا رہے۔

اگر اہلِ اسلام ایسی جستجو کو محض وہم و گمان کی بناء پر ترک کر دیں تو اُن کے پاس باقی ماندہ جستجو صرف ہوا و ہوس ہی رہ جائیں گی۔

اکثر لوگ راہِ حق میں وسائل کی جستجو میں جہالت یا استکبار نفسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس کی بنا پر انہیں صرف وہی جستجو میسّر آئے گی، جو متقی اہل اللہ کی مجالس کے علاوہ بدعاتِ نفسانی کی پیداوار ہوں گی۔

دنیا میں دو ہی قسم کی مجالس ہوتی ہیں۔ یا مجالسِ نیک یا مجالسِ بد۔ اگر مجالسِ نیک کو تنہا کر دیا جائے۔ تو باقی ماندہ مجالسِ بد ہی رہ جاتی ہیں۔

تو ایسے متکبرین جب مجالسِ نیک کو متکبرانہ طور پر ترک کر دیتے ہیں۔ تو پھر لازماً اُن کے حصہ میں مجالسِ بد ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ اور مجالسِ بد تو لازماً بدعت کا ذریعہ بن جاتی ھیں۔ انجامِ کار وہ کسی ذہنی نشیب و فراز کا شکار ہو کر بالکل بیگانۂ حق ہو جاتے ہیں۔ اور فیضِ نظر سے محرُوم ہو کر ضد و عناد کو ہی اپنی عادت بنا لیتے ہیں۔ جس پر اُن کا مرضِ ضد و عناد بڑھتا ہی رہتا ہے۔

اِس کے بعد فرمایا۔ انسان کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو۔ مکرّم ہے۔ اور خاص طور پر کلمہ گو افراد کے لئے ہمیشہ دعائے خیر کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالٰے عام و خاص مُسلمانوں کا انجام بالخیر کرے۔

تئیسواں باب

والد بزرگوار کے پند و نصائح

سال ۱۹۳۹ء کے شروع میں ایک دن جو یوم جمعہ تھا۔ صبح دس بجے مَیں اور میرے دونوں بڑے بھائی اخوانم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اور اخوانم حکیم عبدالجلیل صاحب تینوں حقیقی بھائی والدین کی معیت میں بیٹھے پند و نصائح سُن رہے تھے۔

حضرت والد بزرگوار نے فرمایا۔

میرے بچو! تم کتنے عاجز و بیکس دُرویشوں کی اولاد ہو، جن کے پاس سوائے عاجزی اور فروتنی اور دُرویشی کے اور کوئی متاعِ دنیا موجود نہیں۔

میرے مولائے کریم نے مجھے اس حالت میں مطمئن رہنے کی توفیق دی ہے۔ میرے دِل میں کوئی ایسی حرص و ہوا نہیں جو مجھے مایوس ہونے پر مجبور کرے۔ یہ طمانیت و سکون اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

کون نہیں چاہتا کہ وہ دنیا میں مال و منال کی آسائش نہ پائے۔ اور یہ کہ اُس کی اولاد سامانِ دنیا سے بافراغت استفادہ نہ کرے۔ اور اس کے جگر پاروں کے لئے معقول جائیداد نہ ہو کون نہیں چاہتا کہ اُس کی اولادیں گوناگوں منافعوں سے بہرہ ور نہ ہوں۔

بیٹو! بس اللہ پر ایمان مضبوط کرو۔ اور توکل کو اپنا سہارا بناؤ۔ کہ اُس سے بہتر کوئی دوسرا سہارا نہیں ہو سکتا۔ میری دعا ہے۔ کہ اِس وراثتِ ایمانیہ کی تم حفاظت کرسکو۔ اور اِس وراثت کی حفاظت سچائی اور تقویٰ پر ہے۔

اِن نصائح پر میرا تجربہ یہ ہے کہ انسان اپنے مقدر پر قادر نہیں۔ جو دنیا میں زیادہ

مال و منال اور عزت و اقبال پاتے ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالےٰ ہی کی عطا ہوتی ہے۔ اور جو کم مایہ ہیں۔ وہ بھی مرضیاتِ الٰہی سے اپنے نصیب کے مطابق عُسرت پاتے ہیں۔ نہ ہی انسان عسرت سے فرار کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی یُسرت پر قادر ہو سکتا ہے۔ ہر عسرت و یسرت اولادِ آدم کے لئے ایک امتحان ہے اور نہ ہی دونو حالتیں مدام ساتھ دیتی ہیں۔ اور نہ ہی مدام تنگ دامانیاں گلوگیر رہ سکتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ عسرت و یسرت میں اہلِ ایمان کی استقامت دیکھتا ہے۔

اقبال مندیاں اگر مقام تواضع لوٹ لیں اور مقام بندگی چھین لیں۔ تو میرے نزدیک وُہ ایسا ثقیل وزن ہے۔ جس کو اپنے بدن پر ڈال لیا جائے۔ اور اُس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا جائے حتیٰ کہ اس پر موت آجائے۔

اور کوئی دوسرا اِس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھالے۔ اگر وہ بھی اپنے پیشرو کی طرح بِلا استفادہ بوجھ اُٹھا کر زندگی گذارنے پر آمادہ ہو جائے۔ تو یکے بعد دیگرے ایک نعمتِ عظمٰی کا بوجھ بلا افادیت اُٹھانے کی رسم بدقسمتی پر محمول ہوگی۔

صرف اقبال مند مشہور ہونے کے لئے دولت کے انبار لگا دینا معنوی خوش بختی پر محمول نہیں ہو سکتا۔

ادب ہا رو پیہ اگر صرف قوتِ لَایَمُوتُ تک منحصر ہو۔ تو یہ قرینہ انصاف کے خلاف ہے۔ اہلِ نظر کے نزدیک قوتِ لایموت تو جنگل کے درند و پرند کو بھی میسّر ہے۔ اور ہر ذی جان کو اللہ تعالےٰ قوتِ لایموت دیتے ہیں۔

غریب اور امیر دونوں قوت لایموت پاتے ہیں۔ حسبِ ضرورت کھاتے پیتے سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اور حسبِ دستورِ فطرت خوشی و غم میں بھی حصہ دار ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ اچھی اور لذیذ غذا نوکِ زبان کے لئے خوش ذائقہ ہونے کے بعد داخلِ بدن ہو کر ناپاک فضلہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

مگر اُس کے آگے صحت و مرض پر بھی خدا ہی قادر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اچھے اور لذیذ کھانے مریض نہیں ہونے دیتے۔ یا مرض الموت اُن سے بھاگ جاتی ہے۔

نہیں دنیا میں ایسا نہیں ہوا۔ کوئی آسودہ حال آدمی نہ تو مرض سے بچ سکا اور نہ ہی مرض الموت

سے ۔ایک خوش پوشاک آدمی کی پوشاک میں ملبوس بدن تو وہی مٹی کا بدن ہے ۔ جو جس صورت میں پیدا کیا گیا ۔اُسی حالتِ خلقی میں ویسا ہی رہتا ہے ۔اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی ۔موٹاپا یا کمزوری یا سُرخی یا سفیدی بھی خاکی بدن پر تصرف خداوندی کا نتیجہ ہیں ۔

مگر جسم کی یہ بوقلمونیاں حقیقت جسمانیہ کے فطری ضعف سے الگ نہیں ہوسکتیں ۔انجام کار وہ اُن ہی فطری راہوں سے گذرتا ہے ۔جہاں سے غربا مفلوک الحال لوگ گذر کرتے ھیں ۔ سب پر شام یکساں طور پر آتی ہے ۔ ہر صبح کا مُسافر شام پاتا ہے ۔اِس میں امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں ۔

اِس طرح ہر صبح حیات کا مسافر شامِ موت سے ہمکنار ہوتا ہے ۔اِس میں بھی آسودہ حال اور غیر آسودہ حال میں کوئی فرق نہیں

پھر اگر فلسفہ زیست کو نفسانی خواہشات پر تعمیر کیا جائے تو فکرِ انسانی کا عروج منتشر الحال اور مغلوب الخواہش نفس کی متزلزل حرص دہوا پر ہوگا ۔

اور ایسی فکریں پتنگ باز بچوں کی اُس ڈوری کے مانند ہوں گی ۔جس کے آگے پتنگ لگا دیا جاتا ہے ۔ اور ڈوری بچے کے ہاتھ میں ہوتی ہے ۔ وہ پتنگ اُڑاتا ہے ۔ جہاں تک ڈوری ہوا کے سہاروں پر پہنچ سکتی ہے ۔

بس پتنگ اتنی ہی اُڑان اُڑ سکتا ہے اور کھینچنے پر واپس ہو جاتا ہے ۔ بعض دفعہ ڈوریاں ٹوٹ جاتی ہیں ۔ اور پتنگ بردوش ہوا بے مُہار ہو کر جدھر چاہے گرتا یا اڑتا ہے یا پھٹ کر پُرزے پُرزے ہو جاتا ہے ۔ ڈور کا ٹوٹا ہُوا کچھ حصّہ بچّے کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے ۔ اور وہ اپنی عادتِ لاعبانہ کے ساتھ دوسرے پتنگ کے لئے دوسری ڈوری بنانے کی تیاری کر لیتا ہے ۔

خدا جانے اِس دنیا میں نابالغ پتنگ باز ہاتھوں سے کتنی ڈوریاں ٹوٹ چکی ہیں ۔ اور کتنے پتنگ برباد ہو چکے ہیں ۔

مگر فضائیں حسبِ سابق جاری و ساری ہیں ۔ اور بچے بھی حسبِ دستورِ فطرت پیدا ہو رہے ہیں ۔اور اُس وقت تک پتنگ اُڑیں گے ۔جب تک یہ ناتمام کھیل باقی رہیں گے ۔

اہلِ نفس فلسفی فلسفہ زیست کی باگ ڈور ناتواں اور نابالغ نفس کے ہاتھوں دے کر اپنے

فلسفۂ زیست کا ترجمہ کرتے ہیں۔ اُن کے افکار فوج در فوج سرزمینِ نفس کی خواہشات کے فکری پتنگ خواہشِ نفس جیسی نازک ترین ڈوری کے ساتھ منتعلق ہو کر فضائے عقل و دانش پر اُڑتے اور بار بار نفس کے میدانوں میں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں۔ اور یہ فلسفیانِ نفس کے لئے ایک ناتمام رہنے والا مشغلہ ہے۔

اہلِ نفس کی اِس قسم کی فکریں کبھی نابالغ بچوں کی طرح پتنگ بازی کرتی ہیں۔ اور کبھی برسبیل افتخار ایک دوسرے پر تفاخر کرنے کے لئے قوّت آزمائی بھی کر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خواہشات و لذّاتِ نفسانی کے ساتھ اپنے تفاخرِ نفسی کی برتری کے لئے وہ عقل کو کبھی کبھی نفس کی دہلیز سے الگ بھی کر لیتے ہیں۔ تاکہ وہ کچھ ایسی فاضلہ قوت کا حصول بھی کر سکیں۔ جن سے اُن کے تفاخرِ نفسی کا لوہا مانا جا سکے۔

اِس طرح اُن کے عقل و دانش کو اسبابِ دنیا میں تجربہ کرنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ اور معلومات کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں تیر و کمان، نیزہ و سنان۔ نشتر و تلوار۔ اور لاؤ لشکر وغیرہ کی صورت برآمد ہو جاتی ہے۔ اور یہ نظام قریوں سے شہروں اور ملک تک پھیل جاتا ہے۔

اگر اس تفاخرِ نفسی کے بل بوتہ پر قوّت و تمکنت میسّر آجائے۔ تو اِس کا انجام عیش و طرب پر اپنا اتمام کرتا ہے۔

اور یہ طرزِ قوّت و حشمت دلدادگانِ نفس تک ہی مسرت کی لہریں پھیلا سکتی ہے۔ دوسرے لوگ اسی طرزِ عزّت و عظمت کی طربناکیوں سے قطعاً محروم ہو جاتے ہیں۔

ایک طرف فلسفۂ زیست جیسا ارفع و اعلیٰ مضمون اہلِ نفس نفسِ حنیف کے حوالے کر کے بار بار مادی حل پر ختم کرتے ہیں۔

پھر بھی زیست کی بلندیوں کا ترجمہ نہیں کر پاتے۔ جو دنیوی زندگی کا مقصدِ وحید تھا۔ بار بار نفس کے دلدل میں گرتے ہیں۔ اور دوسری طرف عقل و دانشِ انسانی جیسی رفیع المرتبت قوت کا تصرف جاہ و حشمت کی صورت میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ وہ ایک دوسرے پر تفاخر کا مظاہرہ جاری رکھ سکیں۔

انسان اِسی عادتِ ضعیفہ کی بناء پر ساری کائنات کی بھی تسخیر کیوں نہ کرلے۔ وہ فکری پتنگ بازی سے نہیں بچ سکتا۔

اُمراءِ انسانیت پر حق لازم آتا ہے۔ کہ وہ قوّتِ لایموت کے ساتھ ساتھ افراطِ عزت کا شکرانہ ادا کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اور اہلِ حق کا حق ادا کریں۔ ستم رسیدوں کی اعانت کریں۔ یتیموں اور بیواؤں کی اندھناکیوں میں اُن کی سرپرستی کریں اور فلسفۂ زیست کی باریکیاں روح کے حوالے کریں۔ جوایک ذی وفا اور عاقبت اندیش قوّت ہے۔ وہ نفس کو بھی جائز طریقوں پر پالتی ہے اور سیراب کرتی ہے

مگر اس کے ساتھ افکار کو لامتناہی بلندیوں کی طرف پرواز دیتی ہے۔ وہ پرِ پرواز نوچتی نہیں بلکہ پرِ پرواز تیز کرتی ہے۔ جس پر فلسفۂ زیست کے مادی پہلو ہمہ گیر طور پر واضح ہو کر افادیت عامہ بن جاتے ہیں۔

ایسے پاکباز افکار انفس وآفاق پر تصرف پالیتے ہیں اور اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر امکانی حدود کو بھی پالیتے ہیں۔ اور سب سے برتر ہستی کا عرفان حاصل کرلیتے ہیں۔

اگر آسودہ حال لوگ بھی فلفسۂ زیست کو روحانیت کا وسیع تر اور رفیع الشان میدان نہ دے سکیں۔ تو اہلِ بینش کے نزدیک وہ غریب تر مفلوک الحال ہیں۔ جو بازارِ حقیقت کے خریدار نہیں ہوسکتے۔

امیری ایک نعمت ہے۔ مگر نفس کے ہاتھوں اس کی بڑی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ تمام انبیاء و اولیاء ایسی خداداد قوت کے مالک ہیں۔ کہ وہ سارے جہانوں کو زیرِ نگیں کرلیتے۔

مگر انہوں نے صرف احوال پر زور دیا۔ اصلاحِ احوال میں روحانی، مادی، ملکی وملّی وسائل کی اصلاحات شامل ہوجاتی ہیں۔ صرف ان کی تبلیغِ مذہب سے متعلق ہو کر انسانی حقوق کی حفاظت پر دعوتِ عام دیتی رہیں۔ اُن کو جو تکالیف درپیش آئیں۔ وہ مذہب کے ایمانی اور اصلاحی احکامات کی وجہ پر تھیں۔ وہ کسی طرح بھی یک طرفہ جاہ وحشمت کے متمنی نہ تھے۔

بلکہ وہ عزت میں مساوات چاہتے تھے۔ اسی واسطے اُنھوں نے معجزات کو زیادہ رواج بھی

نہیں دیا اور نہ ہی انسانیت کو مغلوب کرنے کے لئے معجزات پیش کئے۔ بلکہ معجزات بھی ناانصافیوں کو دائرۂ انصاف میں لانے کے لئے پیش کئے گئے۔

انبیارِ کرام سے عین ضرورتِ وقتی پر حکمِ خداوندی کے مطابق مبہوت کر دینے والے معجزات کا ظہور ہوتا رہا۔ تاکہ باطل کے پُرشکوہ ایوان بھی کپکپا اُٹھیں۔ شمس و قمر پر اُن کے معجزات نے کمندیں ڈالیں۔ ارض و سما آتش آب و باد و خاک کے جہانوں میں معجزاتِ انبیار نے تصرف فرمایا۔

مگر پھر بھی دُکھ دینے والوں نے انہیں دکھ دیا۔ باوجود اِن قوی تر معجزات کے حاملین نے کسی سے مطالبہ حق کے سوا کچھ نہ مانگا۔ اُن کو صرف یہی سمجھایا کہ نفس و دنیا تمہارے نہیں۔ تم اِن کے چاکر نہ بنو۔ دنیا تمہارے لئے ہے۔ تم دنیا کے لئے نہیں۔ نظامِ کائنات کو تمہارے لئے منظم کیا گیا ہے۔ اور تم اپنے خالق و مالک کی شکرگذاری کے لئے ہو۔

اور شکرگذاری عبادات و معاملات کے ساتھ ادا کرو۔ جس میں اللہ تعالےٰ کے حقوق کے ساتھ بندوں کے حقوق بھی پورے ہو سکیں۔ یہ امارت کا صحیح ترجمہ ہے۔ جو انبیار کے اخلاقِ عالیانہ کے ساتھ ہر زمانہ میں سامنے آتی رہی۔

انہوں نے چٹائی پر بیٹھ کر بغیر کسی ہر دم آزادی کے اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کی نگہداشت کی۔ خود زندگی کے لافانی جادۂ حق پر چلے۔ اور دوسروں کو بھی اس راہِ صدق و صفا پر چلنے کی دعوت دی۔

انبیار و مرسلین کا یہ وہ دستور العمل ہے۔ جس میں دونوں جہانوں کی آسودہ حالیاں موجود ہیں۔ بِلا وجہ اہلِ دنیا فکرِ عاقبت سے غافل ہو کر اپنی زندگی کے لامتناہی مقاصد کو دنیا کے فانی الذات تک ہی محدود کر لیتے ہیں۔

دنیا کے سب فائدے عارضی ہیں۔ فقر و شاہی کا انحصار دِل پر موقوف ہے۔ کوئی تخت و تاج کا مالک ہو کر بھی جود و سخا سے محروم ہو جائے۔ تو ایسی حرمان نصیبی بادشاہی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ اُن بخلار کا دستور العمل ہے۔ جو اپنی خود غرضی کی بنا پر بڑے سے بڑے فائدوں کو صرف اپنی حویلی کے اندر رکھنے کے خواہشمند ہوں۔

معاشرے میں ایسی عادات کسی طرح بھی منصفانہ نہیں ہو سکتیں ۔ بلکہ یہ عادات مذموم ہیں۔ جن کا دلدادہ ہو کر تاج و تخت کا مالک ایک حقیر زاویۂ نگاہ میں سمٹ جاتا ہے۔ جو اس کے لئے کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔

ایسے صاحبِ تخت و تاج کا مقام ایک بخیل گداگر سے بھی کمتر ہو جاتا ہے ۔ اِس واسطے کہ گداگر بخیل اپنی معمولی پونجی کے تحفظ کے لئے اگر بخل کرے۔ تو اُس کا یہ بخل جہاں اُن کے لئے مذموم تو ہو گا۔ مگر اضطراری ہوگا اور اُمراء میں اضطرار نہیں ہوتا۔ اس واسطے اُن کا بخل جہاں اُن کیلئے عنداللہ نقصان دہ ہے۔ وہاں اُن کا بخل مستحق عوام کے لئے بھی نقصان دہ ہو کر دوہرا بخل بن جاتا ہے۔

بادشاہوں اور امرائے قوم کے ایوان چونا اور پتھر سے بنتے ہیں ۔ اور اُن کے بنانے والے قوم کے صنعت گر ہوتے ہیں ۔

مگر اِس دنیا کے رسم و رواج بھی عجیب ہیں کہ معمار کا نام بھی مالکان کو ہی دیا جاتا ہے۔ مالکانِ تعمیرات دولت صرف کرنے والے تو کہلا سکتے ہیں ۔ مگر اُن پر معمار کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اہلِ دولت کا مصرف تب ہی سود مند ہوتا ہے۔ جبکہ اہلِ ہنر کے ذریعہ اُس کا مقصد پورا کیا جائے۔ جن کے ذریعہ دولت مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے۔

اگرچہ اہلِ دولت اور اہلِ فن کا مقام صرف اُن کا ہی حق ہے ۔ جو دولت کے مصرف میں ممد ہو کر ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ جن کے ذریعہ امراء ورؤساء کی تاریخی نوعیت باقی رہتی ہے۔

بادشاہوں کے ایوانِ سلطنت محتاجِ معمارانِ قوم ہوتے ہیں۔ تمکنتِ حاکمانہ میں رعیت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

فلہٰذا ایوانوں میں انسانوں جیسے ہی انسان متمکن ہوتے ہیں۔ حاکمِ وقت کو اگر سطحِ انسانیت پر سوچنے کا تقابلی منصفانہ موقع مِل جائے کہ وہ اپنے جیسے لوگوں کے پیدائشی حق کا موازنہ کر سکے تو یقیناً وہ اپنے آپ کو دوسروں کے برابر پائے گا۔ اور اپنی دولت کو خداداد نعمت قرار دے گا۔ اور اِس امتیازی فرق کے ساتھ اُس پر انصاف واضح ہو گا۔ جو خدا نے اُسے تفویض فرمایا۔ پھر اگر اِس پر اِس نعمت کے مقاصد بھی واضح ہو جائیں۔ تو یقیناً وہ ندامت میں ڈوب کر اپنے جیسے لوگوں کی

عافیت کی راہ پیدا کرنے پر غور کرے گا۔ اور یہ معلوم کرنے میں آسانی پائے گا کہ مجھے فی الحقیقت جو عزت دی گئی ہے، وہ صرف میرے ذاتی مفاد کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ اِس میں دوسرے لوگوں کے حقوق زیادہ ہیں۔ جن کی نگہداشت میرے ذمہ ہے۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتِ مقدسہ کی پیروی سے امیر و غریب دونوں پر فلسفۂ زیست واضح ہو جاتا ہے

حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی پیروی کرنے والا کوئی مسلمان اپنے دائرۂ قدرت سے باہر پاؤں نہیں پھیلا سکتا۔ اُسے اپنی حدودِ قسمت میں رہ کر شکر گذار ہونے اور دوسروں کے حقوق پورا کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

یہ طریقِ زندگانی اَمارت و غربت میں یکساں مطمئن کرتا ہے۔ وہ شاہ و گدا ہو کر بھی اپنے مالک کا بندۂ شکر گذار رہتا ہے۔ اور اُسی پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور صرف اُسی ایک ذات کو اپنا بادشاہ مطلق گردانتا ہے۔

ایسے ایمان میں مسلمان حکمران جہاں رعیّت کا احتساب کرتے ہیں۔ وہاں وہ اپنے لئے بھی احتساب پسند کرتے ہیں۔ ایک مخلص دُرویشِ باللہ کا احتساب عرشِ عظیم کو حرکت میں لا سکتا ہے۔ مگر ایک بے عمل بادشاہ اپنے زیر ماتحت کو بھی بغیر امداد غیر کے حرکت نہیں دے سکتا۔ وہ خدا کی مخلوق کے سہاروں پر چلتا ہے۔

اگر اِس جہاں میں دوسرے سہارے ختم ہو جائیں۔ اور کوئی صرف ایک حکمران ہی باقی رہ جائے تو وہ کن سہاروں پر حکمرانی کرے گا۔

حکمرانی صرف اللہ ہی کے لئے زیبا ہے۔ یہ دنیوی بادشاہ صرف عالمِ مجاز میں مجازی ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ ذمہ داری کو پورا نہ کریں گے تو اُن سے اُن کے نجی معاملات اور رعیّت کے معاملات کے بارے میں باز پُرس ہوگی۔

ہر انسان اپنے ذاتی وجود کے ساتھ احکاماتِ الٰہیہ کا مکلّف کر دیا گیا ہے۔ یہ تکلّف عرفِ نفس کے ساتھ عرفِ باللہ کے لئے ہے۔ اِس طرح ہر انسان اپنے جسم و جان کا مجازی حکمران ہوا۔ اور اپنی وجود کی ظاہری و باطنی صلاحیتیں اس کی رعیت ہوئیں۔

لفظِ انسان تکرم کی بنا پر عقل و نطق چاہتا ہے۔ نہ کہ مال و منال۔ تکرمِ انسانیت عقل و نطق کے ساتھ متعلق ہے۔ نہ کہ خارج سے۔ ساری کائنات متاعِ انسان ہے۔ اور متاعِ زندگی کسی طرح بھی خدا نہیں ہو سکتا۔

بس جس نے اتنا پالیا۔ وہ ہر حال خوش و خرم ہے۔ جس نے اتنا بھی نہ سوچا، وہ ہر حال پژمردہ حال ہے۔ اُس کی اصل مایوس کُن ہے۔ جو اس کی موت و زیست میں اُس پر سیاہ بادلوں کی طرح چھائی ہُوئی ہے۔ ایسا آدمی نہ تو ایوانِ شاہی کو اپنی طمانیت کے لئے پناہ گاہ بنا سکتا ہے اور نہ ہی دشت و جبل میں اُسے پناہ مِل سکتی ہے۔

وہ اپنے اندر اور باہر بے پناہ مایوسیوں میں گھرا ہُوا بظاہر انسانی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ مگر نگاہِ حق بیں بڑا ناتواں۔ جس نے سب سے بڑے مالک سے مایوس ہو کر دیگر سہارے پکڑے۔ مگر سب کے سب ضعیف اور بے سُود۔

نہیں۔ صدیقوں، شہیدوں اور صالحوں نے فرمایا ہے کہ ہم غریب رہ کر وہ سلطنت پا گئے۔ جو صحیح اطمینان کا ذریعہ بنی۔ ان کے جھونپڑے استقامتِ ایمانیہ کے وہ وہ محل تعمیر کر گئے۔ جن کے سامنے شاہی ایوان بھی سرنگوں ہیں۔ اِن برگزیدگانِ ربُ العالمین نے لوگوں کو نصیحت فرمائی۔ کہ خداداد نعمتوں کا ہمیشہ شکرانہ ادا کرو۔ اور عملِ صالح کی کھُلی تفسیر بن جاؤ۔

تماشائے جہاں بننے کے بجائے خدائے کریم کی نِگاہِ رحمت کے سامنے رحمت و بخشش کے طلب گار رہو۔ ہر کامیابی پر الحمد للہ وردِ زبان ہو۔ شکرانہ ایزادِ رحمت کا ذریعہ بنے۔ جس کی برکت پُشت ہا پُشت تک جاری رہتی ہے۔

خدا کی نماز کے ساتھ جو شکرانہ ادا کیا جائے۔ وہ زیادہ بخشش و عنایات کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایسی نماز ہو جو وجد آفریں اور کیف انگیز ہو۔ چونکہ تمہارا مالِک سب سے بڑا محبوب ہے۔

اس کے حسن و جمال کے سامنے سارے جہاں جھُلس جائیں۔ وہ جہاں محبوبِ مُطلق ہے، وہاں معبودِ مطلق بھی ہے۔ وہ سب کو پالتا ہے اور پیار کرتا ہے۔ اور عزت و ذلت اُس

کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی سارے جہانوں کا مالک و مختار ہے۔ جو رہنے کے لئے مکان اور پہننے کے لئے لباس دیتا ہے۔

بس اگر ان حالات میں کوئی خوش نصیب اللہ تعالےٰ کا شکر گزار بندہ بن جائے۔ تو اِس بندگی پر بختِ سکندری بھی قربان ہے۔ بخششِ کریمانہ کے مقابل کسی ذاتی ہنرمندی پر ناز نہیں کرنا چاہیئے۔ اِس واسطے کہ ہنرمندی بھی اُسی کی عطا ہے۔

قابلِ قدر بات اللہ و رسول پر اور یومِ آخرت پر ایمان لانا ہے۔ باقی جہان اور اُس کی نعمتیں وقتی ہیں دائمی نہیں۔ پھر ایسے ایمان کی حفاظت اعتراف کے ساتھ ہوتی ہے۔ کہ ہمہ وقت تلافی مافات کے لئے اس طرح توبہ کی جائے۔ کہ گویا مجھ سے کوئی نیکی ہوئی ہی نہیں۔ اعتراف یُوں کرے۔

اے اللہ بس تو نیک ہے۔ تیرے رسول نیک ہیں۔ اپنے نیک بندوں کے توسل سے ہمیں بھی راہِ راست پر قائم رکھنا اور نفس و شیطان سے ہمیں اپنی پناہ میں رکھنا۔

پناہ حاصل کرنے کے لئے توبہ ہی بہتر ذریعہ ہے۔ اور مقبول توبہ عُجبِ نفسی کے برعکس اعتراف عجز کے ساتھ میسر آتی ہے۔ معمولی سا غرور بھی توبہ کو ضعیف کر دیتا ہے۔ اور غرورِ نفس کے ساتھ توبہ ساقط ہو جاتی ہے۔

چونکہ غرور و تکبر اللہ کی صفت ہے۔ یہ کسی اور کے لئے زیبا نہیں۔ توبہ عبودیت کے ساتھ اظہارِ اعتراف کا نام ہے۔ جو اپنے مالک و مختار کے سامنے کی جاتی ہے۔ اسلام میں کردہ اور ناکردہ گناہ کی تفصیل پانچویں اور چھٹے کلمۂ استغفار اور کلمۂ ردِّ کفر میں تعلیماً بیان کر دی گئی ہے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ۔ اے میرے پالنے والے خدا میں تجھ سے بخشش مانگتا ہُوں۔ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ۔ ہر قسم کے کبیرہ اور صغیرہ گناہ سے۔ اَذْنَبْتُهٗ عَمَدًا۔ اُن گناہوں سے بھی توبہ کے ساتھ بخشش کا خواستگار ہُوں، جو مجھ سے عمداً سرزد ہُوئے۔ اَوْ خَطَأً یا خطا سے سرزد ہُوئے۔ اَوْ سِرًّا یا لوگوں سے چھُپ کر سرزد ہوئے۔ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ میں اعترافِ گناہ کے ساتھ صدقِ دِل سے توبہ کرتا ہُوں۔ اور توبہ کے ساتھ تیری طرف لوٹتا ہُوں۔ گناہوں سے مُنہ پھیر کر تیری طرف یعنی تیرے دین کی بنائی ہوئی راہ پر لوٹتا ہُوں۔

مِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ اَعْلَمُ اُن گناہوں کی بھی توبہ کرتا ہوں، جو میری دانست میں ہیں یعنی مجھے یاد ہیں یا میرے علم میں ہیں۔ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ لَآ اَعْلَمُ اور اُن گناہوں سے بھی توبہ کرتا ہوں، جو میری دانست یا علم میں نہیں یعنی مجھے اُن کی یاد نہیں۔

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ اِس واسطے نامعلوم گناہوں کی توبہ کرتا ہوں۔ شاید کہ مجھ سے کچھ ایسے گناہ ہوگئے ہوں، جو مجھے یاد نہ ہوں۔

مگر چونکہ اے اللہ تو پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں صرف اُن گناہوں کی توبہ کروں۔ جو میرے علم میں ہیں۔ تو دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔ کہ اس سے اور بھی گناہ سرزد ہو چکے ہیں۔

یہ اعتراف کردہ اور ناکردہ معلوم اور نہ معلوم دونوں قسم کے گناہوں سے توبہ کرنے کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ وَسَتَّارُ الْعُیُوْبِ تو اپنے بندوں کے گناہوں کو لوگوں کی نظر سے چھپاتا ہے۔ اور اس طرح اُن کو ذلت و رسوائی سے بچاتا ہے۔ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ اور توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کر کے اُنہیں بخشنے والا مہربان ہے۔ تیرے سوا کوئی طاقت ایسا کرنے پر قادر نہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ اے میرے اللہ میں تجھ سے یہ پناہ بھی چاہتا ہوں کہ میں تیری ذات کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ گردانوں۔ وَاَنَا اَعْلَمُ بِہٖ اور وہ میری دانستہ ہو۔ وَاَسْتَغْفِرُكَ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں۔ لِمَا لَآ اَعْلَمُ بِہٖ اور اس قسم کے شرکیہ گناہ جو میری دانست میں نہیں اُن کے متعلق بھی معافی کی درخواست کرتا ہوں۔ وَتَبَرَّأْتُ مِنَ الْکُفْرِ اور اِس توبہ کے ساتھ کفر سے برأت کرتا ہوں۔ وَالشِّرْكِ اور اس سے برأت کا اعلان کرتا ہوں کہ مُسلمان ہو کر پھر کسی کو تیرا شریک ٹھہراؤں۔ وَالْکِذْبِ اور جھوٹ سے بھی اس توبہ کے ساتھ بریت کا اقرار کرتا ہوں۔ وَالْغِیْبَۃِ اور پسِ پردہ کسی کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں کروں گا۔ جس سے شریعتِ اسلام نے منع کیا ہو۔ اور اِس بات سے عند الاسلام غیبت کا اطلاق ہوتا ہو۔ وَالْبِدْعَتِ اور کتاب و سنت اور اجماعِ صحابہ اور سلفِ صالحین کی بتائی ہُوئی باتوں یا بتائے ہُوئے اعمال کے سوا کسی نئی بات پر چلنے یا نئی بات بنانے، جس کو اسلامی شریعت نے بدعتِ شنیعہ قرار دیا ہو اِس قسم کی بدعات سے بھی بریت کا اقرار کرتا ہوں۔ وَالنَّمِیْمَۃِ اور کسی کی پسِ پردہ چُغلی بھی نہیں

کروں گا۔

اور اس قسم کی چغلی خورانہ مردم آزاری سے بھی بریت کا اعلان کرتا ہُوں۔ وَالْبُھْتَانِ اور کسی پر بہتان تراشی سے بھی بریت کا اقرار کرتا ہوُں۔ وَالْمَعَاصِیْ کُلِّھَا اور اُن تمام صغیرے اور کبیرے گناہوں سے بھی بریت کا اقرار کرتا ہوُں۔ جن کو دینِ اسلام میں گناہ قرار دیا گیا ہے۔

اِن دو کلموں میں جس پاک انداز سے باریک تفصیل کے ساتھ بندۂ مومن کو اعتراف کے ساتھ طریقِ توبہ سکھایا گیا ہے۔

اگر پورے غور و خوض کے ساتھ کوئی بندۂ خدا اسی کے معانی پر نظر رکھتے ہُوئے اپنے حال کا احتساب کرے۔ تو خوفِ خدا سے اِس کا ظاہر و باطن لرز اُٹھے تو پھر اُسے اپنی نیکیاں بھول جائیں وہ سراپا بندگی ہو جائے۔ اور اس کا رونگٹہ رونگٹہ توبہ بن جائے۔ اور خدا کے دامنِ رحمت میں پناہ لے لے۔ خدا نے یہ توبہ اپنے بندوں کو اسی واسطے عطا فرمائی ہے۔ کہ وہ میرے احکامات کی بجا آوری کرتے رہیں۔ اور توبہ کے ساتھ میری طرف بار بار لوٹتے رہیں۔ اور میری رحمت بار بار اُن کو اپنی پناہ میں لیتی رہے۔

عاجزی اور فروتنی سے مراد یہ نہیں، کہ کوئی دریوزہ گر ہو جائے۔ اور ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر کُنجِ قفس میں بیٹھ جائے۔

بلکہ انبیاء و اولیاء کی تاریخ احوال میں عنداللہ عاجزی اختیار کرنے سے مراد یہ ہے کہ بندۂ مومن بہر طور متقیانہ اندازِ فقر کے ساتھ صِرف اللہ کے نزدیک عاجز ہو جائے۔ اور اپنی صلاحیتوں کے تمام ہتھیار خدا کے سامنے ڈال کر محض اُس کا بندۂ خاص بن جائے۔ اور غیر اللہ پر غالب رہے کسی غیر اللہ کے سامنے اس طرح مغلوب نہ ہو، جس طرح وہ اللہ کے سامنے مغلوب ہُوا۔

جب محوِ عبادت ہو۔ تو تمام کائنات سے کٹ کر صرف اُسی کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اور ایسی عبادت رات کے پُرسکون ماحول میں زیادہ میسّر آتی ہیں۔ اور دِن میں کاروبارِ دنیا میں اتنا مشغول ہو۔ کہ نمازِ پنجگانہ کے علاوہ باقی اوقات معاملاتِ دینیہ میں خرچ کرے۔ تو محض لِلّٰہِ تعالےٰ اور دُشمنی بھی محض لِلّٰہِ تعالےٰ ہو۔

اور بندوں کے لئے ضروری ہے۔ کہ اللہ کے دوستوں سے اِس واسطے دوستی کریں کہ اُن کی

دوستی میں اللہ کی خوشنودی ہے۔ اور اُن کے ذریعہ ہدایت ملتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے دُشمنوں سے ایسا سلوک کرے کہ نہ تو وہ دوستی ہو، کہ خدا ناراض ہو۔ بلکہ اس کو اخلاقِ اسلامیہ کے ساتھ ہدایت دے۔ اور کوشش کرے کہ وہ بھی صالح ہو جائے۔ اور اُس کی خدمت کرے۔ رواداری کرے تاکہ وہ خدا کی دشمنی میں ہلاک نہ ہو جائے۔

یہ اِسلامی رواداری ہے، جو وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ اخلاقی تبلیغ بن جاتی ہے۔ مگر کوئی دُشمنِ خُدا جب اِس حد تک پہنچ جائے۔ کہ وہ اعلانیہ خدا اور رسول کی توہین کرے۔ اور خدا کے دین کی توہین پر اُتر آئے۔ تو ایسی حالت میں اس کے ساتھ رواداری ترک کر دے۔ اور دشمنی بھی اللہ ہی کے لئے کرے۔ ذاتی عصبیت کو ایسی دُشمنی میں شامل کرنے سے مقصدِ ایمان فوت ہو جاتا ہے۔

مُسلمان کی دشمنی اور دوستی دونوں اسلامی اخلاق کے دائروں میں ہوں۔ تو زیادہ بخشش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

مسلمان باطل کے سامنے سینہ سپر ہو سکتا ہے مگر منافقت نہیں کر سکتا۔ مومن ولی اللہ ہے۔ وُہ اللہ کے سوا کسی غیر سے خوف نہیں کھا سکتا۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ یعنی اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف نہیں اور نہ ہی آئندہ کوئی حزن و ملال ہو گا۔

اِس آیت میں لفظِ اولیاء کو تعلق باللہ کی بناء پر خوف و حزن سے آزاد قرار دیا گیا ہے۔ تعلقِ باللہ سے مُراد اللہ پر کامل بھروسہ رکھنے والے سالکین راہِ حقیقت ہیں۔ جو سوائے اللہ کے کسی دوسری طاقت سے اِس واسطے نہیں ڈرتے، کہ اُنہیں اللہ تعالےٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اُن کا ذاتی کردار نہیں۔ بلکہ تعلقِ باللہ کا نتیجہ ہے۔ متعلقِ بالغیر نہ تو ولی اللہ ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی خوف و حزن سے نجات پا سکتا ہے۔

دنیا خوف و حزن و ملال کا گھر ہے۔ زندگی خود ایک آزمائشی خوف و خطر ہے۔ احساسات زندگی حزن و ملال کی نوک پلک تیز کرتے ہیں۔ اور قلب و جگر کے لئے تیز نشتر بن جاتے ہیں۔ تمام

مجازی مقاصد ایک فتنۂ عظیم ہیں۔

خدا نے بھی اموال و اولاد کو تمہارے لئے فتنہ یعنی آزمائش بنایا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ یعنی تمہارے مال اور تمہاری اولاد دونوں تمہارے لئے آزمائش ہیں۔

ہر راحت کے ساتھ غم، ہر عروج کے ساتھ زوال، ہر صحت کے ساتھ مرض، ہر زندگی کے ساتھ موت، ہر دِن کے ساتھ رات، ہر بہار کے ساتھ خزاں۔ یہ رعد و برق، یہ کڑکتی بجلیاں، یہ زلزلے، یہ وبائیں، یہ آلام و آشوب در آشوب، فراق در فراق ایامِ زندگی کے لئے ایک مجموعۂ خوف ہیں۔

اِس جہانِ مرغوب کے حادثات، یہ پرلطف زندگی کے قلوب و اذہان میں قہر آفرینیاں۔ پھر کیسے اور کیونکر کہا جائے کہ دنیا راحت کدہ ہے۔

دنیا کسی طور راحت کدہ نہیں۔ یہاں کسی کروٹ چین نہیں۔ یہاں تو درحقیقت ہر تبسم کے بعد آنسو بہانے پڑتے ہیں۔ یہاں ہر راحت کا اتمام کلفت پر ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی راحت مستقل نہیں کوئی تبسم یا شادکامی دیرپا نہیں۔ گردشِ لیل و نہار دونوں مِل کر جہاں روشنی اور آرام پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ وہاں محبوب ترمتاعِ حیات کو یوماً فیوم کم کرنے میں بھی مصروفِ عمل ہیں۔

یہ کِس قدر فریبِ نفس ہے کہ ہر انسان موت سے دور رہنا چاہتا ہے۔ مگر اس تمنا کے باوجود وہ کشاں کشاں موت کی طرف برق رفتار کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

کون ہے؟ جو یہ نہیں جانتا! کہ میری شام میری زندگی کے بارہ گھنٹے کم کر دے گی۔ اور میری صبح میری زندگی کے مزید بارہ گھنٹے کم کر کے چوبیس گھنٹوں کے ساتھ موت کی طرف دھکیل دے گی۔

کون نہیں جانتا؟! کہ مہینہ بھر کی عرق ریزی اور پہلی تاریخ کا بے قرار کر دینے والا انتظار اس کی زندگی کے تیس یوم لوٹ لے گا۔

کون نہیں جانتا؟! کہ سال کے اختتام پذیر ہونے کی بے قراریاں اُس کی زندگی کے بارہ

مہینے سلب کرلیں گی۔

کون نہیں جانتا کہ اولادوں کی شباب آفرینی اگرچہ شادمانی کا باعث ہے۔ مگر اُن کا شباب ماں باپ کو بڑھاپے میں لاکھڑا کرتا ہے۔

مگر یہ سب کچھ جانتے ہُوئے بھی سب لوگ دِن کی تھکان دُور کرنے اور بچوں میں مِل بیٹھنے کے لئے کتنی تعجیل سے دِن گذار کر رات سے مِلنا چاہتے ہیں۔ اور رات کے وقوع کے بعد پھر صبحِ نَو کی اُمید لگا لیتے ہیں۔

دنوں کے ہفتے اور ہفتوں کے مہینے اور مہینوں کے سال اور سالوں پر عمریں اور عمروں پر موت مرتب کر لیتے ہیں۔

یہ لذتِ دنیا و لذتِ نفس ہے۔ جو وقت کی اہمیت اہمیت سے بیگانہ بنا دیتی ہے۔ اور حیاتِ جاوداں کو حیاتِ موہوم بنا کر مقصدِ دوام سے دُور کر دیتی ہے۔ زندگی امیر ہو یا غریب وہ زندگی ہے۔ دریدہ حال ہو، یا فاقہ کش۔ بہر حال زندگی جس بھی جامہ میں ہو۔ دارالفراق کی مسافر ہے۔

اور یہ زندگی بڑی قیمتی ہے، جس کو اہلِ دُنیا محض نفس کے دلدل میں پھنسا لیتے ہیں۔ اور دنیا کے مستعار سودے کئے جاتے ہیں۔ جو موت کے بعد زادِ راہ نہیں بن سکتے۔

حلال محنت کی حلال کمائی کھانے والے ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اور سچائی ہی تقوے کی بنیاد ہے۔ حرام کھانے والا سچ نہیں بول سکتا۔ اور سچ نہ بولنے والا سچائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس سے بندگی کو سخت نقصان پہنچتا ہے

حلال کمائی کر کے خود کھانے والے سخی بھی ہوتے ہیں۔ اُن کے دسترخوان بابرکت ہوتے ہیں۔ جس سے مُستحقین فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

ایسے صالحین لوگوں کے دسترخوان خود سیراب ہونے کے بعد دوسروں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ اِن کے گھر بار، رہنا سہنا، جلوت و خلوت، سفر و حضر بابرکت ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو حلال کمائی پر صبر و توکل بھی مِل جاتا ہے۔ اِن لوگوں کا توکل راہبانہ نہیں ہوتا بلکہ محنتِ شاقہ سے حلال کمائی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔

حرام کھانے سے صبر و توکل کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ہر قسم کا حرام بدن کے مختلف حصّوں سے شروع ہو کر سارے جسم پر اپنا بُرا اثر ڈالتا ہے۔ اور بدن بجائے نیکیوں کے بدیوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

جو لوگ دین کے مطابق توکل اختیار کرتے ہیں۔ اُن کی روزی میں برکت ہوتی ہے اُن کے جان و مال و اولاد رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ صلاحیتیں پاتے ہیں۔ متوکل کا ایک لُقمہ ہزار لقموں سے بہتر اور تاثیرات میں شفائے روحانی اور شفائے جسمانی بخشتا ہے۔ متوکل باللہ کی امارت و غربت دونوں بابرکت ہوتے ہیں۔ وُہ حریص نہیں ہوتا وہ قانع اور بُردبار ہوتا ہے۔

زیادہ ملنے پر حیوانوں کی طرح سرمستی نہیں کرتا۔ اور تھوڑا ملنے پر مایوس نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی خدا سے نا اُمید ہوتا ہے۔

چوبیسواں باب

راضی برِضا رہنا

راضی برضائے خدا ہونا ہی رضا جوئی حق حاصل کرنے کا صحیح ذریعہ ہے۔ اگر اہلِ ایمان اِس پر استقامت پالیں۔ تو اللہ تعالےٰ دنیا و عقبےٰ میں اُن کی مدد کرتا ہے۔

میرے ابا جان نے جب مجھے خرقۂ خلافت عطا فرمایا، جو آپ کو بغداد شریف سے خرقۂ خلافت کی صورت میں تفویض ہُوا تھا۔ تو نصیحت فرمائی تھی کہ اصلی لباس ایمانِ باللہ ہے۔ اور بندگی ہے۔

یہ خرقہ اہل اللہ کی امانت ہے۔ یہ لباسِ محض نہیں۔ یہ صابرین و شاکرین اور متوکلین کا لباس ہے۔ لباس بدن پر ہوتا ہے، اور بدن لباس کے اندر۔ اگر بدن ہی غلط ہو جائے تو خرقۂ محض بجائے برکت کے لبادۂ ریا ہو جائے گا۔ اور قیامت میں تمہارے خلاف گواہی دے گا اِس نصیحت نے میرا ایمان تازہ کر دیا۔ اور فرمایا:۔

حلال کھاؤ، تاکہ سچ بولو۔ اور سچ بولو، تاکہ متقی ہو جاؤ۔ پھر اِس خرقۂ مُبارک کی کرامات تم پر واضح ہو جائیں گی۔

مَیں نے حتی المقدور نصیحت پر عمل کیا، جس کا نتیجہ مجھے بندگی کی صورت میں مِلتا رہا۔ یہ تمام چیزیں چاہے مال ہُوں یا اولاد، یا روحانی کرامات سب اللہ تعالےٰ کی عطا ہوتے ہیں۔ علم و ہُنر و اعلیٰ منصب سب عطائے خدا ہیں۔ اِن کے مِلنے کے بعد بھی اگر انسان سچائی پر قائم رہے تو یہ سب عطیاتِ خداوندی مزید برکات سے نوازتے ہیں۔

وُہ فقر و غنا جو اللہ تعالےٰ کی بندگی سے مِلے۔ دنیا بھر میں اِس سے بہتر کوئی دُوسرا متاع

نہیں ہو سکتا۔ مگر یہی فقر اگر محض ظاہری لبادہ بن جائے۔ تو ایک ریاکارانہ فریب بن کر بے معنویت کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہر حلال چیز چاہے تھوڑی ہو، یا بہت۔ انعامِ خداوندی ہے۔ ایسی نعمت کو ریا سے بچانا انعامات کو زیادہ کرتا ہے۔ تصوّف یا فقر کسی جبہ و دستار یا کسی تسبیح و مسند کی میراث نہیں بلکہ ہر وہ مسلمان اُس کا وارث ہے، جو حلال کھاتا اور حرام سے بچتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کے بعد مشکور ہوتا ہے۔ ایسے سب مسلمان ولی اللہ ہیں۔

بس درجاتِ بندگی کے لحاظ سے ان میں فرق مراتب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بعض زیادہ متقی ہونے کی بنا پر اعلیٰ مقامات پر فائز کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر ان میں بعض ولی اللہ صاحبِ خوارقِ عادت ہو جائیں۔ تو ان کو زمین پر روحانی خدمات کے لئے مامور کر دیا جاتا ہے۔

درجات کے لحاظ سے سب سے بڑا متقی غوثِ وقت ہوتا ہے۔ اسی کو قطب الاقطاب بھی کہا جاتا ہے۔ ہر قطب الاقطاب کے ماتحت چار قطب ہوتے ہیں۔ جو پوری دنیا میں شرقاً غرباً شمالاً جنوباً چار حصوں پر مامور کر دیئے جاتے ہیں۔

اوتاد و ابدال اِن چار اقطاب کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام متقی اولیائے اُمّت جو صاحبِ نظر ہوتے ہیں۔ ابدالوں اور اوتادوں کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اِن متقی ولیوں میں بعض صاحبِ منزل سالک بھی ہوتے ہیں اور تمام کلمہ گو افراد کو ان کے تابع کر دیا جاتا ہے اور کلمہ گو افراد کو پوری غیر مسلم انسانیت پر فضیلت حاصل ہے۔

اللہ کے نزدیک ساری دنیا ان کے تابع ہے اور صرف اہلِ ایمان کی برکت سے دنیا آباد ہے۔ یہی لوگ اسلام کے عوام ہیں۔ جن کو تمام دنیا کی مجموعی قوت کہا جاتا ہے۔ تمام تصرفات و انعامات کے لئے ہی من جانب اللہ دنیا میں وارد کئے جاتے ہیں۔ در اصل یہ نظامِ روحانیت تزکیہ کے لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔

اس نظام کو اصلاحِ فردیت کی بنیاد سے شروع کر کے اسلامی اجتماعیت تک پھیلایا جاتا ہے۔ بعد میں جب یہ لوگ اسلامی ریاضت کے ذریعہ اسلامی اخلاق پا لیتے ہیں، تو انہیں تصرفات دے کر انتظامات پر مامور کر دیا جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کے نزدیک تصرفاتِ ارضی کے لئے وہی لوگ موزوں ہیں جو اسلامی اخلاقیات کے حامل ہوں۔ روحانی یا مادی دونوں تصرفات پر وہی لوگ مامور ہوتے ہیں، جو عقائد، عبادات و معاملات اور معاشرت کے مسائل کو سمجھ سکتے ہوں۔

اِس روحانی اور مادی نظام کا مقصد اللہ تعالےٰ کے نزدیک ملّتِ اسلامیہ کو اجتماعاً حزب اللہ بنانا مقصود ہوتا ہے۔ تاکہ ملتِ اسلامیہ کے ساتھ غلبہ پاکر بنی نوعِ انسان کو اسلامی اخلاق کا درس دے سکے۔ اسلام کی یہی وہ تنظیم عظیم ہے۔ جس کو ادیانِ عالم پر غالب کر دیا گیا ہے۔

بشرطیکہ مُسلمان اِس نظام اسلامی کو اپنا ضابطۂ حیات مان لیں۔ اور اس پر عمل کریں۔ اسلام کی سیاست کی مثال جسم و روح کے مانند ہے۔ جس طرح اشتراکِ جسم و رُوح نظامِ حیات کا باعث ہے۔ اور جسم روح کو پاکر ہی صاحبِ احساس ہوتا ہے۔

پھر بیداریٔ احساس کے بعد اُسے ضروریات درپیش آتی ہیں۔ اور اُن ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہر فرد دوسرے فرد کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اور فرد اجتماع کے لئے اور اجتماع فرد کے لئے لازم و ملزوم کر دیئے جاتے ہیں۔

اِسی واسطے یہ ساری کائنات انسانی ضروریات پورا کرنے کے لئے کفائت سے کہیں زیادہ نعمتوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

دستورِ رحمانی منتفیانہ نظم و ضبط کے ساتھ کائنات پر اہلِ ایمان کا تصرف چاہتا ہے۔ تاکہ وہ اِس کائنات کو اللہ تعالےٰ کا دسترخوانِ نعمت سمجھ کر اس کو اپنے مصرف میں لائیں۔ اور یہ مصرف ایسا ہو۔ کہ بنی نوعِ انسان تک اس کے استفادے عام کر دیئے جائیں۔ اور راہِ خدمتِ انسانیہ میں یہ تنظیم عصبیت سے کلّیتہً پرہیز کرے۔

یہ تنظیم فرداً و اجتماعاً نیک بنے۔ خود کو پابندِ احکام بنائے۔ اور رحمتِ خداوندی کو پوری مخلوق کے لئے عام جانے۔

اِس زاویہ سے ہٹ جانا اللہ تعالےٰ کی رحمت کے منافی ہے۔ وہ شخص جو رحمتِ خداوندی اور عامۃ الناس کو الگ الگ جانے۔ ولایت کے مرکز سے ہٹ جاتا ہے۔ اس کی ولایت سنت اللہ کے خلاف ہے۔

چونکہ اس نے خدا کی رحمتِ عامہ سے خود استفادہ کیا ہے۔ اب وہ دوسروں کو اس رحمت سے کیوں الگ جانے۔ یہ منفیانہ بندگی کے بھی منافی ہے۔

اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ وَسِعَتْ رَحْمَتِی کُلَّ شَیْءٍ میری رحمت ہر چیز پر مُحیط ہے۔

اللہ کے اس فرمان کے بعد اللہ کا کوئی بندہ انسانی حقوق کی ادائیگی سے غافل نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی رحمت سے مخلوقات کو بیگانہ سمجھنا بیگانۂ ایمان لوگوں کا خیال ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ کے لئے دو حکومتیں اس طرح قائم کر رکھی ہیں۔ جس طرح نظامِ جسم میں روحانیت کا نظام لازم۔ اور بدن کا انتظام اس کے ساتھ ملزوم کر دیا گیا ہے۔ چونکہ جسمِ مادی سے کہیں زیادہ روحانیت نیک صلاحیتوں کی حامل ہے۔ یہ جسم ایک میدان ہے۔ جس میں نیکی و بدی دونوں کے تجربات کئے جا سکتے ہیں۔

اگر نیک اعمال کے ساتھ روحانیت جسم میں نیک تجربات جاری رکھے۔ تو انسان نیک ہو کر ولی اللہ کا مقام پا لیتا ہے۔ اور بُرائی پر تجربات کرنے سے جسم اللہ کے سوا غیر کا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ محض دنیا دار ہو کر خواہش کے بندے بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ لازم پر ملزوم کو ترجیح دیتے ہیں، جو اُصولِ فطرت کے خلاف ہے۔

اِس غلط زاویۂ حیات پر کسی طرح بھی اطمینانِ کامل نہیں مل سکتا۔ دنیا کی روحانی اور مادی دونوں حکومتیں بظاہر افراد کے ہی سپرد ہوتی ہیں۔ مگر یہ افرادِ قوم روح کے مانند ہوتے ہیں۔ اور قوم مانندِ جسم۔

وہ افرادِ قوم جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے انسانیت کے لئے استفادہ عام کے قائل ہوتے ہیں اُن کے تزکیۂ نفس کا مقصد بھی ہوتا ہے۔ کہ وہ مجاہدات کے ساتھ نفس کو اُن قباحتوں سے صاف کر لیں۔ جو خدا کی بندگی اور مخلوق کی خدمت میں ریا و نمود کا ذریعہ بنتی ہیں۔ تعصب کا مرض پیدا کرتی ہیں۔

ریا و نمود اور عصبیت مادہ پرستی کی پیداوار ہیں۔ اور وہ مادی زندگی جس میں خوفِ خدا نہ ہو۔ کسی طرح بھی ایسے امراض سے نجات نہیں پا سکتی۔

البتہ اگر مادہ پرست زیادہ سے زیادہ مادی اخلاق کا روادار ہوگا۔ تو لوگوں تک اپنی مادی

خدمات پہنچا سکے گا۔ بیماروں کی عبادت اور اہلِ احتیاج کی خدمات بھی کر سکے گا۔

مگر چونکہ وہ دِل کو خدا سے الگ کرنے کے بعد ایسا کرتا ہے۔ اِس واسطے اُس کی رُوح بے لوث جذبات نہیں پا سکتی۔

جب روح کا تعلق قطعی مادیات کے ساتھ ہو جائے۔ تو اُس کی تربیت اِنسانی تربیت سے الگ ہو کر نفسانی تربیت کی تابع ہو جاتی ہے۔ اور اُس کی نشو و نما سراسر نفس کے سائیوں میں نفس ہی بن جاتی ہے۔

چنانچہ ایک مدت کے ساتھ جسم و روح دونوں کا ایک ہی مسلک ہو جاتا ہے۔ اور ایسی حالت میں انسان سوائے ریا و نمود کے کچھ نہیں رہتا۔

اصلاً ایسی طبع نگاہِ انصاف میں کسی کی خیر خواہ نہیں ہوتی۔ اگر وہ افرادِ قوم جو انسانی معاشرہ میں کسی پہلو پر بھی خاص ہو جائیں۔ اور معاشرہ پر اُنہیں درجہ بھی مِل جائے۔ تو ایسے لوگوں کے ذریعے معاشرہ کو مادی آسودگی ہی مِل سکتی ہے۔

مگر یہ آسودگی اپنے روحانی لازمہ سے الگ ہو کر پورے معاشرہ کو محض نفسانی حرص و ہوا کا بندہ بنا دیتی ہے۔ اور پورا معاشرہ جب ایسے نظریہ کی لپیٹ میں آجائے۔ کہ بس زندگی یہی کچھ ہے۔ کہ موت تک اس کے لوازمات بعیش و طرب پورے کئے جائیں۔ تو ایسے معاشرہ کا باطن خالص نہیں رہ سکتا۔

ایسا معاشرہ اور اس کے مادی راہنما دونوں مِل جُل کر ایک راہ پر چل پڑتے ہیں، جس کا اتمام موت پر اپنی حد پورا کر لیتا ہے۔

مگر اخلاقِ مزکّیانہ سے تہی دامن لوگ موت کے بعد کے متعلق زندگی کا اعتبار ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ اور اس اعتبار کی عدم موجودگی میں جسم و روح دونوں اگر مادہ پرست ہو جائیں۔ تو فطری نیکی کی بنیاد ہی اُکھڑ جاتی ہے۔ ہر نیکی کا تعلق خدا سے وابستہ ہو کر ہی نیکی بنتا ہے۔

اسلام میں تزکیۂ نفس سے خاص یا خاص الخاص ہونا اپنی اور معاشرہ کی بخشش حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اور اس کی بنیاد تقوٰی پر ہے۔

جو شیوخِ تقوٰی نصابِ تقوٰی کے ساتھ عملاً کسی درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں۔ تو اُن کو عالمِ

امر کی طرف سے معاشرہ کی روحانیت و مادیت دونوں کی اصلاح پر من جانب اللہ مامور کردیا جاتا ہے۔

مگر یہ لوگ رؤسائے دنیا کی طرح مال و دولت کو حشمتِ نفسی کے لئے خرچ نہیں کرتے۔ اور نہ ہی دوسری صلاحیتوں کو محض برائے مادہ تصرف میں لاتے ہیں۔

ایسے لوگ حاکمانہ تمکنت سے بھی طبعاً بیزار ہوتے ہیں۔ البتہ ان کا مقصد خدمت للہ تعالیٰ برائے نجات ہوتا ہے۔ ایسے لوگ ہر چیز کو خدا کی عطا کردہ نعمت جانتے ہیں۔ اُس کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتے۔ یہ ایک ایسا انسان ہے۔ جو عبادت میں اور خدمتِ خلق میں یکساں جذبۂ ایمان کے ساتھ کام کرتا ہے۔ بس اُس کا ایک ہی مقصد ہے۔ کہ اِس فانی دنیا میں کوئی انسان بھی اللہ سے غافل نہ ہو۔ اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی کا محتاج ہو۔

ایسے لوگوں کی تبلیغ قولاً اور عملاً اظہارِ عبودیت کے لئے ہوتی ہے۔ ان کی خدمات سے معاشرہ نیکی پاتا ہے۔ اور خوفِ خدا حاصل کرتا ہے۔ جس کی بنا پر ظلم و ستم بداخلاقی اور جرائم کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جب اربابِ بست و کشاد ایسے نیک ہو جائیں۔ تو اُن کی مثال قلب و روح کے مانند ہو جاتی ہے۔ اور نیک معاشرہ کی مثال نیک جسم کے مانند ہے۔ جس طرح رُوح و جسم کے صحت مند ہونے سے آدمی زیادہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اِس طرح نیک رہنماؤں کے ساتھ معاشرہ کا صحت مند ہونا اجتماعی طمانیت بن جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کا یہی منشا ہے۔ کہ فردِ قوم نیکی کا مجسمہ بن کر اجتماعِ قوم میں مدغم ہو جائے۔ اور اجتماعِ قوم صالح ہونے کے لئے افراد پر اپنی تعمیر مکمل کرے۔ اگر دونوں نیک ہو جائیں تو فانی زندگی آسودگی کے علاوہ خدا کو بھی پالے گی۔

اور ایسے لوگوں کے نزدیک سفرِ حیات صرف موت تک ہی محدود ہو کر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اُن کے نزدیک قیامت تک جاری رہنے والا سفر ہے۔

ابّا جان نے مجھے خرقۂ خلافت تفویض فرمایا۔ اور پند و نصائح فرمائے۔ اور فردیت کی جامع تشریح فرمائی۔ اور ایک متقی فرد کے اجتماعی مفاد پر عارفانہ روشنی

ڈالی۔ جس پر مجھے معلوم ہوا۔ کہ بندگی کے تاثرات محض اپنے لئے ہی نہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لئے خیرو برکت کا ذریعہ ہیں۔

چونکہ وہ اپنے اُس مالک و مختار کا بندہ ہے۔ جو ساری مخلوقات کا پالنے والا ہے۔ جب وہ اپنے مالک و مختار کا بندہ ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالےٰ اُس کی برکت کو بھی وسیع کر دیتا ہے۔ جس پر پوری دنیا استفادہ کرتی ہے۔

گاہے انسانی گناہ خطرہ کی اِس حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ کہ بارشیں بند ہو جاتی ہیں یا بے قوّت بارشوں کا نزول ہوتا ہے۔ یا بیماریاں بڑھ جاتی ہیں۔ نظامِ کائنات درہم برہم ہونے والا ہوتا ہے۔ کہ اِن نفوسِ قدسیہ کی بدولت بارشیں جاری ہو جاتی ہیں۔ وبائیں ختم کر دی جاتی ہیں۔ اور نظامِ کائنات کو بحال کر دیا جاتا ہے۔

یہ ایک ایسی برکت ہے۔ جس سے مادہ پرست اہلِ نفس بے خبر رہتے ہیں جس طرح جسم کو دِل نظر نہیں آتا۔ حالانکہ وہ دل پر ہی زندہ ہے۔ اور دل ہمیشہ معلوم ہو کر بھی مخفی ہی رہتا ہے اور اپنی مربیانہ خدمات انجام دیتا ہے۔ اور جسم کو پہلی حرکت بھی دِل ہی سے ملتی ہے۔

اور دِل کی یہ عادت ہے۔ کہ وہ جسم میں تادمِ آخر جاگتا ہی رہتا ہے۔ اور ایک لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں سوتا۔

نیز۔ جسم کو سلاتا، جگاتا، کھلاتا، پلاتا اور خوش رکھتا ہے۔

جب خوشی و غمی کے احساس کی ضرورت ہو۔ تو خوشی و غمی دونوں دیتا ہے۔ اور جسم کی تمام تر خوشیوں کا دارو مدار دل پر موقوف ہے۔

مگر دِل کبھی ایسی ریا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ کہ مَیں جسم کی آنکھوں کے سامنے آؤں۔ اور یہ کہ میں بازارِ انسانیت میں سامنے آکر اپنی عزت کراؤں۔ اُس کی یہ عادت نہیں چونکہ وہ شفیق ہے۔ اُس کی شفقت بغیر ریا و نمود کے بے لوث ہوتی ہے۔

دِل پہلی حرکتِ جسم سے لے کر آخری حرکتِ جسم تک اپنی استطاعت کے مطابق پوری خدمات انجام دیتا ہے۔ وہ بوقتِ موت جسم میں سارے اجزائے جسم کے بعد مرتا ہے۔

اِسی طرح انسانی قوم ایک جسم ہے۔ اور اہل اللہ صالحین اس کا دِل ہیں۔ جو ہمیشہ قوم میں

مخفی رہ کر قوم کی زندگی بحال رکھتے ہیں۔ پروردگارِ عالم نے عالمِ ہست و بود پر ایک ایسی حکومت قائم کردی ہے۔ جِن کی بدولت دنیا پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ بارشیں برستی ہیں۔ اور نظامِ کائنات چلتا ہے۔ اُن کے غیر مرئی تأثرات بادشاہوں اور اُن کی رعیتوں تک خیر و برکت لاتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کی خاموشیاں جہانوں کے فیصلے کر لیتی ہیں۔ کائنات میں جتنے ردّ و بدل ہوتے ہیں۔ وہ اِن ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

انسانی دنیا میں بظاہر مادی حکومتوں کا غلبہ و غلغلہ ہوتا ہے۔ مگر یہ مادی پرزے ہوتے ہیں۔ اِن کا اقتدار مادہ پر قائم ہو کر مادہ پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ نہ تو خود روحانی اطمینان پا سکتے ہیں۔ اور نہ ہی دوسروں کو روحانی اطمینان دے سکتے ہیں۔ بلکہ امنِ انسانیت میں اُن کا دباؤ دہشت غلبہ خودسری رعونت تکبّر جلالتِ مادی رخنہ انداز ہو جاتی ہے۔ طبائع خائف ہو کر زندگی کے الطاف سے محروم ہو جاتی ہیں۔

بہرکیف اللہ کی مرضی ہے۔ کہ کائناتِ انسانیہ میں ایک باطنی حکومت ہو جو اولیاءُ اللہ کے سپرد کی جائے۔ اور ایک ظاہری حکومت ہو۔ جو اہلِ دنیا کے سپرد ہو

اسلام نے ان دونوں حکومتوں کی اصلاح کے لئے تقویٰ کو معیارِ تکرّم و تشرّف قرار دے کر دونوں کو حدودِ تقویٰ میں پابند رہ کر خدمات انجام دینے کی تلقین فرمائی ہے۔

اگر اولیاءُ اللہ اپنی باطنی حکومت میں نیکی پر فخر کریں۔ اور اپنے فرائض سے تغافل برتیں۔ تو اُن کو اپنے متصرفانہ عہدوں سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔

مگر یہ گروہ تائبین کا گروہ ہے۔ اِسی واسطے برطرف ہونے پر بھی اُنہیں عہدوں سے الگ ہونے کا غم نہیں ہوتا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا غم ہوتا ہے۔ اور توبہ کے ساتھ اپنی غلطی اور ظلم کی تلافی کرانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنّت الفردوس سے نکلنے کے بعد توبہ کے ساتھ تلافی مافات چاہی اور آخر کامیاب ہوئے۔ اس تلافی کے لئے آدم علیہ السلام کی وہ

توبہ جو آپ نے دانہ گندم کھانے پر احساسِ ندامت پانے کے بعد اور اپنی غلطی کا احساس پیدا ہونے کے بعد کی تھی۔ وہ توبہ جذبہ منتقیانہ تھا۔ اور وہ معترفانہ دعا جو آپ نے رو رو کر بصورتِ توبہ ادا کی۔ قرآن مجید میں موجود ہے۔ وہ دعا توبہ یہ ہے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

اے اللہ ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں اپنے فضل و کرم سے معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم و کرم نہیں فرمائے گا۔ تو یقیناً ہم خسارہ میں ہیں۔

چنانچہ ہر نبی کے زمانہ کے اہل اللہ نے اپنی غلطیوں پر اسی طرح توبہ کی۔ اور تلافیٔ مافات چاہی۔ اور کامیاب ہوئے۔ مگر وہ دنیا دار حکمران جو غرورِ نفس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور انائیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی حکمرانی کو اپنا اکتسابِ ذاتی جاننے لگتے ہیں۔ اور خدا کو بھول جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو جب بھی اللہ تعالےٰ اقتدار سے محروم کر دیتا ہے۔ تو انہیں سخت خفت، ندامت، غم و اندوہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُن کی اس خفت و اندوہ کا زیادہ سے زیادہ تعلق نفسِ امارہ سے متعلق ہوتا ہے۔

نفسانی عزت کے کھو جانے پر اور اُس سے محروم ہونے کی بنا پر وہ کفِ افسوس ملتے ہیں۔

ان لوگوں کے محروم اقتدار ہونے پر لوگ بھی اِن کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بلکہ اُن کی حالت پہلے سے بھی کہیں زیادہ ابتر اور پراگندہ ہو جاتی ہے۔

برخلاف اس کے اولیائے منصرفین کبھی کسی حالت میں بھی اپنے اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہیں ہوتے۔

نیز لوگ اُن سے ہر حال پیار کرتے ہیں۔

یہی اعتراف اور کسرِ نفسی جیسے خصائل اُن کو خدا اور انسان کے سامنے معزز بنا دیتے ہیں۔ لوگ اُن کی مٹیوں سے بھی اتنا پیار کرتے ہیں۔ کہ شاید کوئی شاہی محلات سے بھی اتنا پیار نہ کرتا ہو۔

پچیسواں باب

مُرشدینِ کاملینُ اور اُنکے تفویضات

اِس مشہور گواہی کے ملنے پر مجھے عبادات پر ریاضت کا زیادہ جذبۂ شوق ملا۔ میرے لئے اباجان کے خرقۂ خلافت کے بعد یہ دوسرا خرقۂ خلافت تھا۔ اور یہ خرقۂ خلافت بھی سِلسلۂ قادریہ کی طرف سے تھا۔

میرے والد بزرگوار سلسلۂ قادریہ کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ کے بھی اجازت یافتہ خلیفہ تھے۔ اِس طریقہ سے مجھے حضرت عبدالرّحمٰن صاحب کابلی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت لینے تک دو طریقوں سے خلافت میسّر آئی۔

اباجان نے مجھے خلافتِ قادریہ اور خلافتِ چشتیہ دونوں سے نوازا اور حضرت عبدالرحمٰن کابلی رحمۃ اللہ علیہ سے مجھے جو خلافتِ قادریہ ملی۔ یہ قادریہ خلافت دوسری بار تھی۔

حضرت والدِ بزرگوار نے بوقتِ اجازت مجھے لوگوں کو بیعت کرنے کی اجازت دی۔ اور فرمایا تھا۔ کہ بیعت سے مراد دین کی تبلیغ ہے۔ اور تزکیۂ نفوس کے سلسلوں کو جاری کرنا ہے۔ جو مُرشد بوقتِ بیعت دین کو فراموش کرے۔ وہ صاحبِ فیض نہیں ہو سکتا۔

اگر بیعت میں خود غرضی یا تشہیر یا ریا و نمود غرض ہو۔ تو یہ عادت سراسر جہل ہے جس سے بجائے دین حاصل ہونے کے اُلٹی بدعات پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔

اِس غلط دستور العمل کو کسی متقی ولی اللہ نے پسند نہیں کیا۔ بلکہ ایسے لوگوں کو دینِ اسلام اور طریقتِ اسلام کے لئے مُضر قرار دیا۔ چونکہ ایسے افراد کے ذریعہ سادہ لوح عقیدتمند

اپنی ذہنی صلاحیتیں کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ بے اُصول فقر کے بے اُصول ماحول ومشاہدات سے ذہنی تعیش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور عقلِ جسمانی میں سمٹ کر قیدِ نفس میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

بعض دفعہ اُن کا جسمانی عقل بے اُصول محنت سے جذب ہو جاتا ہے۔ اور وہ بہک جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک مدّت تک کسی امید کے ساتھ وابستہ رکھتے ہیں۔ وہ اُمید تو پوری نہیں ہو پاتی۔

مگر وہ ایسی لا اُبالانیہ طرز کے عادی بن جاتے ہیں۔ ایک مدّت العمر تک ایسے طالبینِ تصوّف دین و دنیا کھو بیٹھتے ہیں۔ نہ ہی وہ متشرع ہو سکے۔ نہ ہی صوفی بن سکے۔ نہ ہی کاروبارِ دُنیا حاصل کر سکے۔

جب وہ اپنے آپ کو چہار جانب سے بے بس و بے کس پاتے ہیں۔ تو لامحالہ انہیں پھر وہی مایوسانہ طرزِ فقیرانہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ اہل اللہ کے محض نقال بن جاتے ہیں۔ اور اِسی طریقہ پر انحصار کر لیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ کوئی صاحبِ کمال نہیں۔ مگر پھر بھی اپنے آپ کو صاحبِ کمال کہلاتے ہیں۔

فرمایا اِس طرح غلط مرشد عنداللہ و عندالناس بڑے گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ خود صاحبِ اُصول نہیں۔ مگر اپنے آپ کو صاحبِ اُصول صوفی کہلاتے ہیں۔ دوئم یہ کہ ایسے تصور سے نُور پیدا ہوتا ہے۔ سوئم یہ کہ لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ چہارم یہ کہ لوگوں کی عادت کو صراطِ مُستقیم سے ہٹا کر بدعات کا عادی بنایا جاتا ہے۔ پنجم یہ کہ بدعات کو رواج دیا جاتا ہے۔ ششم یہ کہ ایک فرقہ بن جاتا ہے۔ جو دُور دراز تک پھیل کر بدعات کو ایسے مذموم انداز سے فروغ دیتا ہے۔ جو سفیہوں کو سراسر تن آسان بنا کر اُنہیں دینی و دنیوی محنت سے الگ کر لیتا ہے۔

ایسا مرشِد اس قسم کی لاتعداد برائیوں کا ذمہ دار ہے۔ فرمایا شاید سادہ لوح عقیدت مند معاف کر دیئے جائیں۔

چونکہ انہوں نے جو فریب کھایا ہے، وہ بر بنائے عقیدہ ہے۔ وہ مرشد کو ولی اللہ

سمجھ کر اُس کے پاس آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ولی اللہ وہی ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالٰی کا فرمانبردار ہو۔ اُن کا اعتقاد ہے۔ کہ ایسے متقی ولی اللہ اگر دعا کریں، تو اللہ بخشش فرماتے ہیں۔ اور مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

مگر جب وہ بجائے ہدایت کے گمراہی پائیں۔ اور بجائے دعائے خیر کے سُوءُ الاخلاق ہو جائیں۔ تو یقیناً یہ سب جرم اُس مصنوعی مرشد پر عائد ہو گا۔ جس نے اپنے فقر کی بنیاد دینِ اسلام کے خلاف رکھی ہو۔ وہی اِن تمام بدعات کا بانی مبانی ہے۔ اُس نے بدعات کی بنیاد ڈالی اور یہ کہ ہر بدعتِ قبیحہ کا راستہ شرک سے جا ملتا ہے۔ انجام کار ایسے لوگ شرک و بدعت کا شکار ہو کر محض نفاق پسند رسمی قسم کے مُسلمان رہ جاتے ہیں۔

فرمایا بیٹا! تمہیں خلافت تو دیدی گئی ہے۔ اب مجھے اندیشہ ہے۔ کہ تم کہیں انانیتِ نفسی کا شکار نہ ہو جاؤ۔

یاد رکھو کہ بندگانِ خدا نے ہمیشہ عاجزی کو پسند فرمایا۔ عاجزی مردِ فقیر کی وہ ڈھال ہے جس سے وہ تمام نفسانی شیطانی اور دنیوی مہلکات کا دفاع کرتا ہے۔

فرمایا وہ فقیر جو کشف و کرامات پر فخر کرے۔ یا وہ عالمِ دین جو فضیلتِ علوم دینیہ کی کرامت پر فخر کرے۔ اور لوگوں کو اپنے سے کمتر جانے، وہ متکبر ہے۔ ایسے متکبرین کبھی ولی اللہ نہیں ہو سکتے۔

فرمایا ولی اللہ کی بڑی تعریف یہ ہے۔ کہ اُسے سارے جہان کی نعمتیں بھی مِل جائیں، تو وہ اُن کو اپنا ذاتی اکتساب نہیں سمجھتا۔ اور ہر حال پر راضی رہ کر خدا کی رحمت و بخشش چاہتا ہے۔

بیٹا! عاجزی کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لو۔ اس طرح تم اپنے خدا کو راضی رکھ سکو گے۔ ورنہ دعوؤں سے کام نہیں چلتا۔ خدا دعائیں تو سب مخلوقات کی سُنتا ہے۔ اِس لئے کہ ساری مخلوقات اُس کی رعیت ہے۔ وہ اِن سب کا مربی ہے۔ یہ اُس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہے۔ جس میں کوئی دوسرا دخیل نہیں ہو سکتا۔

مگر اپنے ولیوں کی دعاؤں کو دوسروں کی نسبت زیادہ قبول کرتا ہے۔ اور اُن سے محبّت

کرتا ہے۔ اُن کی دعائیں محبت سے قبول ہوتی ہیں۔

اگر کوئی دُعا بظاہر نہ قبول ہو۔ تو بھی اس میں بھلائی ہوتی ہے۔ شریعت طریقت کی بانی ہے۔ جس کے ذریعہ رُہبانیت، سادھوتیت اور کاہنیت اور ملنگیت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

فلہٰذا اس خرقہ کو پہننے کے بعد شریعت کی پابندی کرو۔ طریقت کو ہمہ وقت شریعت کے پیمانہ میں تولو۔ کہیں ذرہ برابر بھی نقص نظر آئے۔ فوراً توبہ کرو۔ اور ایسے حال سے اجتناب کرو۔ لوگوں کو نصیحت کرو۔ تمہارا کام نصیحت کرنا ہے۔ ہدایت دینا خدا کا کام ہے۔ تم لوگوں کو نیک دعائیں دو۔ جو دعائیں صدق و صفا سے کی جائیں۔ وہ اپنے لئے بھی مقبول ہوتی ہیں۔ اور دوسروں کے لئے بھی اللہ تعالےٰ قبول فرماتے ہیں۔

اِس کے بعد فرمایا۔ کہ اپنی اولاد میں سے جس کو اہل پاؤ، اُس کو یہ جُبہ عنایت کرنا۔ مگر یاد رکھنا کہ تفویض کے وقت اعلان نہ کرنا۔

فرمایا یہ جُبّہ سِلسلۂ قادریہ کی طرف سے ہے۔ مگر تمہیں اور بھی مردانِ خدا راہِ سلوک میں ملیں گے۔ جِن سے تمہیں مزید فیض حاصل ہو گا۔ اُن کا ادب و احترام کرنا۔ اُن کے احکامات کی تعمیل میں تاخیر نہ کرنا۔

حضرت فقیراللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ کی پیشنگوئی کے مطابق تُمہیں دشت و جبل میں دورانِ ریاضت کسی مردِ خدا سے ایک خاص فیض بھی ملے گا۔ جِس سے تمہارے علمِ دین میں اضافہ ہو گا۔ اِس پیشنگوئی پر یقین رکھنا۔ آگے جو کچھ اللہ کو منظور ہو گا، وہی ہو گا۔

نیز۔ حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اِس بارے میں پیشنگوئی فرمائی ہے۔ اور میرا گمان بھی یہی ہے، کہ اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم تمہارے شاملِ حال رہے گا اور ایسے مردانِ خدا تمہیں وقتاً فوقتاً ملتے رہیں گے۔

فرمایا مجھے یہ ہوس نہیں۔ کہ تم بہت بڑے عالمِ دین بنو۔ بلکہ میں اس پر حریص ہوں۔ کہ تمہارے نصیب میں جتنا علم آئے۔ اُس پر امکانی کوشش سے عمل کر سکو۔ عالم

باعمل کا بڑا مقام ہے۔

فرمایا۔ متقی کے لئے علمِ دین حلال وحرام کے امتیاز کے لئے ہوتا ہے۔ اور بغیر امتیاز حلال وحرام کے کوئی مومن تقوٰی میں کمال نہیں پا سکتا۔ کمالِ تقوٰی کے لئے ارکانِ طہارت، ارکانِ عبادات، ارکانِ معاملات، ارکانِ معاشرت اور ارکانِ اخلاق کے علوم وآداب سے باخبر ہونا ضروری ہے۔

یہ وہ آداب ہیں جو حلال کو حلال جان کر استعمال میں لانے اور حرام کو حرام جان کر اِس سے اجتناب کرنے سے مُیسّر آتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ علمِ دین کے ذریعہ حلال وحرام کے متعلق معلومات حاصل کرنے تک ہی اکتفا کیا جائے۔ تاکہ نخوت وغرور عملی کا اندیشہ و احتمال کم ہو۔

اور اگر متقیانہ فہم وفراست مِل جائے۔ اور اللہ کی بندگی عجز وانکسار کے ساتھ ادا کرنے پر توفیق مِل جائے۔ تو مزید علومِ دینیہ صرف ونحو، منطق ومعقول تک اور اِس سے آگے تفقُّہِ دین تک مزید علومِ دینیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ تو نُورٌ علی نُور۔

اللہ کے بندوں کے لئے ایزادِ علم فروغِ بندگی کا ذریعہ بن جاتا ہے، جِس سے تقوٰی میں عُروج مِلتا ہے۔ بغیر تقوٰی کے علم باعثِ عُجب ہو کر مُتکبّر بنا سکتا ہے۔ جو مُہلک ہے۔ جِس سے قلب ونظر پر بجائے لطافت کے تیرگی وشقاوت آجاتی ہے۔

ایسی حالت میں طبیعت متقیانہ فضیلتِ عملیہ دینیہ پر مُشتبہ ہو جاتی ہے۔ اِس طرح کا علم غرورِ نفسی کا شکار ہو کر محرومِ رحمت ہو جاتا ہے۔

اور دوسری طرف وہ وسائل سلوک پر اپنے شبہات کی بنا پر استمداد وسائل سے محروم ہو کر عملاً صراطِ مُستقیم کی جانب رجعت نہیں کر سکتا۔ نہ تو وہ خوشنودیِ رب حاصل کر سکا۔ اور نہ ہی رجعت کے لئے راجعین کو پا سکا۔

اِس واسطے علم محض جو برائے تشہیرِ نفسی حاصِل کیا جائے۔ وہ غیر مفید ہے۔ اور

علم کو بر سبیلِ تقویٰ وصول اِلی اللہ کے لئے حاصل کیا جائے۔ تو وہ ہر گام زندگی پر یار و مددگار اور رفیقِ منزل ہو جاتا ہے۔

فرمایا علم چراغِ راہ ہو سکتا ہے۔ مگر منزلِ مقصود نہیں ہو سکتا۔

عالمِ بے عمل چراغِ راہ کو مقصود قرار دے کر صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔ اِس کے بعد اگر وہ رجعت الی الحق نہ کر سکے تو بے مُراد ہے۔ وہ اپنے نصب العین سے دور تر ہو کر بے یقین ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی علم کو حجابِ اکبر کہا گیا ہے۔ جس نے بجائے بندۂ خدا بنانے کے بندۂ نفس بنا دیا ہو۔ اور نفس وساوسِ شیطانی کو جلد قبول کر لیتا ہے۔

جب زمامِ نفس شیطان کے ہاتھ آجائے۔ تو وجود پر شیطان اپنا تسلط جما لیتا ہے اور قلب و نظر کو اپنے تصرف میں لے لیتا ہے۔ جب علم و عقل ہدفِ شیطان ہو جائیں تو لامحالہ طبیعت بھی مائل شیطنت ہو جاتی ہے۔ جو علم وسوسہ بن جائے۔ اُسی پر حجابِ اکبر کا اطلاق ہوتا ہے۔ ورنہ علم دین بنفسہٖ نور ہے۔

فرمایا علم کیلئے ظرفِ نیک کی ضرورت ہے۔ اور وہ ایمان ہے۔ ایمانی علم علوم کو اور علوم اسلامیہ ایمان کو تقویت دیتے ہیں۔

فرمایا اسی واسطے قبل از علوم اور بعد از علوم مرشدینِ صالحین کی نگرانی میں رہنا علومِ دینیہ کے لئے ضروری لوازمات میں سے ہے۔

بہر کیف علمِ دین کا مقصد بر بنائے تقویٰ وصولِ الی اللہ ہے۔ ورنہ علم بے معنی ہو جاتا ہے۔

فرمایا اہلِ سلوک کی ایک ایسی منزل ہے۔ جس پر پہنچ کر وہ علم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ وہ صرف تعیناتِ عبادات و معاملات کے حقوق کی رعایتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد جملہ فلسفیانہ موشگافیوں سے نجات پا لیتے ہیں۔

اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا۔ کہ ایسی طلاق سے علم کی طلاق ہو جاتی ہے۔ بلکہ اِس کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ زائدہ علم کی موجودگی میں ذہن پر بے ہنگم افکار کا

زائد دباؤ نہ پڑے۔

اِس طرح وہ اپنے فکری دباؤ سے ایک طرف ہٹ کر صرف حلال وحرام کے معلومات تک ہی اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں۔ تاکہ دلجمعی سے وہ بجاآوریِ احکاماتِ الٰہیہ کر سکیں۔ اور یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ میں استغراق ومحویت پا سکیں۔

اسلام میں توجہ الی اللہ حدود اللہ کی پابند ہیں۔ اور حدود اللہ میں اعمال کی تقسیم کر دی گئی ہے۔

مگر یہ عوامل منقسمہ تواتر کے ساتھ سبیلِ بندگی میں یکے بعد دیگرے بندۂ راہ کو قرینہ بہ قرینہ ملتے رہتے ہیں۔

ایمانِ بالغیب پہلا قرینہ ہے۔ اِس کے بعد طہارتِ بدنیہ دوسرا۔ پھر نمازِ پنجگانہ تیسرا قرینہ ہے۔ یہ بندگی کے بنیادی قرینے ہیں۔ جن کی جڑ کلمۂ توحید و رسالت ہے۔

اِس کے بعد تقسیم معاملات چوتھا، پھر معاشرتِ اسلامیہ پانچواں، اور اخلاقِ اسلامیہ چھٹا قرینہ بن کر منزل بمنزل یوماً فیوماً ہفتوں، مہینوں، سالوں اور عمر بھر راہِ بندگی میں بندۂ خدا کو یہ قرینے مل کر اُس کے عمل کو عروج دیتے ہیں۔

یہ مجوزہ قرینے بندگی کی وہ لازوال کڑیاں ہیں۔ جو حدِ قیامت تک ملی ہوئی ہیں۔ جن پر حیاتِ جاوداں مرتب ہوتی ہے۔

جنت کی یہی کڑیاں خلود دوام کی دائمی راحت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ گویا بندۂ خدا احکامات کی منزل بمنزل ملنے والی کڑیوں کی صوابدید کے ساتھ اپنی بندگی کو ترتیب دیتا ہے بندۂ حق کی منزل بے عمل نہیں۔ اُس کے اعمال عقل ودانش کی اختراعات نہیں ہوتے بلکہ خالقِ مطلق کے متعینہ اعمال پر وہ منزل بہ منزل قدم رکھتا ہے۔

جس بندۂ حق کا مقصود حق ہو۔ اُس کے اعمال بھی حق ہوں گے۔ اور وہ صحیح راہ پر متلاشئ حق ہوگا۔ تو یقیناً اس کی یہ حالت حق ہوگی۔ ایسا عالِم سالک ہوگا۔ اُس کا علمِ دین وصولِ الی اللہ کے لئے ہوگا۔

اور سلوک سے مراد اللہ کو پانے کی راہ ہے۔ اللہ کو پانے کی راہ دینِ حق اور رسولِ آخر الزمان کی برحق اطاعت اور با دینِ مرشد، شریعت و طریقت ہیں۔

ایسے لوگوں کا علم بھی ان کے لئے سود مند ہو جاتا ہے، جس بندۂ حق کا علم ایسا ہو۔ وہ ہر طرح اور ہر حال ترجمانِ حق ہوگا۔ اور اُس کی حقانیت بندگی کی گواہی اُس کی اپنی صداقتِ دینیہ ہوگی۔

وہ اپنے قادرِ مطلق کا حق پرست بندہ ہوکر اپنے قادرِ مطلق کو اپنا گواہ بنالیتا ہے۔ اور جو ایسا ہو جائے۔ وہ اللہ کی صحیح پناہ میں آجاتا ہے۔ اُسے کوئی خارجی قوت گزند نہیں پہنچا سکتی۔ فرمایا

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ کی روشنی میں بندۂ حق کی ہر ادائے زندگی صرف اللہ تعالےٰ کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اور وہ بندگی کی ایک واضح صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اُس کی زندگی اور موت سب اپنے مالک و مختارِ حقیقی کے لئے ہوتے ہیں۔ بس وہ صرف مسافرِ راہِ حقیقت بن جاتا ہے۔

جو عملاً حقیقتِ بندگی کا مظہر ہوتا ہے، جس سے حقیقتِ حقہ آشکار ہوتی ہے۔ وہ حقیقت پسند ہو کر حقیقت کا علمبردار ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں اپنے لئے طلبگارِ ہدایت ہوتا ہے۔ وہاں دوسروں کے لئے بھی موجبِ رشد و ہدایت ہو جاتا ہے۔ جس کی پابندِ اُصول ریاضتیں لوگوں کے دلوں کو نورِ ہدایت دیتی ہیں۔

اِس کے بعد والد بزرگوار نے مجھے خرقۂ خلافت دینے کے بعد پند و نصائح فرمائے اور دعائے خیر فرمائی۔

مجھے ریاضت کے اسلامی اصول بتائے۔ آپ نے دمِ واپسین تک مجھے گاہے گاہے مزید تفویضات سے بھی نوازا۔ راہِ سلوک پر چلنے اور منزلِ مقصود کو پانے کے لئے مجھے باعمل رختِ سفر دیا۔ نصابِ سلوک کی تکمیل کے لئے میرے بنیادی اُصول درست کرائے اور مجھے راہِ حق پر چلنے کی ترغیب و تحریص دی۔

آپ کی بزرگانہ شفقتیں میرے لئے ناقابلِ فراموش ہیں۔

فی الحقیقت میرے والدین نے راہِ بندگی میں میرے ساتھ حقِ مرشدانہ ادا کیا۔ جو ایک ذمہ دار مرشد کے فرائض میں داخل ہے۔

میرے اللہ نے مجھ پر کتنا احسان فرمایا۔ کہ اُس نے مجھ ناچیز کو ایسے کریم النفس اور عاجزانہ طبع کے والدین عطا فرمائے۔ جو بحرِ علم و عرفان کے غواص ہونے کی بنا پر بھی لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے۔ اور بظاہر تبلیغِ دین کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اور مجھ عاجز و نادار کو اپنی عنایات سے نواز کر عاجزی کی راہ پر چلایا۔ اور مجھ پر عاجزانہ بندگی کا راز کھول دیا۔

یہاں تک کہ میں عاجزانہ زندگی اختیار کرنے پر بہ دل و جان تیار ہوگیا۔ اور عاجزانہ زندگی سے میری روح اتنی مانوس ہوگئی۔ کہ وہ میری جانِ عزیز بن گئی۔ اور میں عاجز بندہ بالعجز مقامِ بندگی سے روشناس ہو کر صراطِ بندگی پر آنے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ اور خدائے برتر کی برتری کے سامنے اپنے ظاہر و باطن سے سجدہ ریز ہونے پر واقعتاً میں نے اپنے آپ کو عاجز ہی پایا۔ اور سب مخلوق صورۃً اور معناً مجھے اللہ کے سامنے عاجز ہی نظر آنے لگی۔

اِس رضا جوئی میں اللہ تعالےٰ کے خاص فضل و کرم سے مجھے والدین کی سالکانہ عاطفت میں ہی ریاضت شروع کرنے کا موقع مِل گیا۔ اور میں نے مجوزہ ریاضت شروع کر دی۔

چھبیسواں باب

سالکِ منزل اور وادیٔ سلوک

مبادیاتِ ریاضت کے دوران میری کچھ موہوم فکریں جو میری لطافتِ قلبی کے سامنے حائل تھیں۔ اور سینے میں کھٹکتی تھیں۔ اِس بااُصول آغازِ ریاضت کے ساتھ یقین و ایمان میں تبدیل ہو کر میری رفیقِ منزل ہو گئیں۔

یہ اسلامی تقوٰی کی پہلی کرن تھی۔ جس نے مجھے اپنا باایمان منقاد بنایا۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا۔ کہ گویا اسلامی تعلیمات کے تابع عملِ صالح وہ نورانی چراغ ہے، جو تیرہ و تار کمرے میں جلا دیا جائے، جس سے کمرے کی تاریکیاں معدوم ہو جائیں۔ اور کمرہ منور ہو کر اپنے داخلی حیثیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے روشن ہو جائے۔ اور ناظر پر اُس کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہے۔ اور وہ روشنی تعارف وضاحت کی ترجمان ہو۔

ایسے ہی میری مبادیاتِ ایمانی نے میرے جسم و جان کے اندرونی گھر میں نورِ ایقان کا چراغ روشن کر دیا۔

جس نور کی روشنی میں مجھے نفس ——— کا داخلی تعارف ہُوا۔ اور مجھ عاجز پر خدا کی ذات وصفات کی باریکیاں واضح ہُوئیں۔ اِس وضاحتِ عرفِ نفس نے مجھ پر محبت کی پہلی ضرب کاری لگائی۔ جس نے مجھے بالمحبّت راہِ سلوک پر چلنے کا جذبہ عطا فرمایا۔

یہ محض اللہ تعالٰے کا فضل وکرم تھا۔ ورنہ مَیں غریب کون ہوتا ہُوں، جو اِس

پاک وادیٔ ریاضت میں قدم رکھ سکتا۔

نفس سے من حیث الاشتراک روح وجسم دونوں مراد ہیں ۔ پہلا تعارف بالایمان قلب کی روحانی تجلیات پر ہوتا ہے۔ اور تزکیہ نفس سے قبل یہ نورانیت اقرار وتصدیق کی صورت میں بلا تزکیہ حجابات ِنفس میں محجوب رہتی ہے۔

اسلامی طریقِ تقوٰی پر ایمانی اقرار وتصدیق تزکیۂ نفس کی ریاضتوں کے ساتھ حجاباتِ نفس سے آزاد کرانے میں سالکِ راہ کو ممد ہوتے ہیں ۔

حجاباتِ نفس سے جس طرح فکریں لاشعور کے حجاب سے صفحۂ شعور پر اُتر اُتر کر ظاہر ہوتی رہتی ہیں ۔ اور شعور اُن کا ادراک کر لیتا ہے ۔ یہ فکریں باطن کے خیالی دباؤ سے شعور میں واقع ہوتی ہیں ۔ شعور یا لاشعور دونوں جذبۂ باطن کے تابع ہوتے ہیں۔

اِس قسم کا ہر دباؤ جذبۂ باطن کی ایمان افروز فکری محنت ہوتی ہے ۔ ہر لمحہ یہ دباؤ جذبۂ باطن کی فکری محنت پر ترقی پاتا ہے ۔ اور ہر لمحہ یہ دباؤ جاری رہتا ہے ۔ یہ دباؤ جن جذبات کے تابع ہوگا۔ اسی نوعیت کے خیالات اور افکار شعور پر مرتب ہوں گے۔

جس طرح کسی رَس بھرے پھل پھول کو دباؤ ڈالنے پر اس سے عرق ریزی ہونی شروع ہو جاتی ہے ۔ اور ان کے عرق کو جمع کیا جا سکتا ہے ۔ بعینہٖ لاشعور پر جذباتِ باطن کا نظریاتی فکری دباؤ حسبِ منشا اپنے ارادی مافی الضمیر افکار کو کسی فیصلہ طلب مقصد کے لئے شعور تک بھیج دیتا ہے ۔ جذباتِ باطن شعور کے ذریعہ ہی اپنے ماحصل کو وصول کر سکتے ہیں۔

اور شعور کا کام جذباتِ باطن کے مطابق انتخابِ خیال اور اُس کا ادراک ہوتا ہے ۔ پھر جس نوعیات کے خیالات کا ادراک ہوگا ۔ اُن کو اُن کی حسبِ حیثیت معلومہ راہوں پر ڈال دینا شعور کا کام ہے ۔ اِس کے بعد قوائے جواسیس کی ذمہ داری ہوتی ہے ۔ کہ وہ شعور کے ادراک شدہ جذباتِ باطن کو وصول کریں ۔

اگر وہ جذبہ قوت باصرہ کے لئے ہے ۔ تو اُسے سبیلِ باصرہ وصول کرے گی ۔ اگر

سامعہ کے لئے ہے، تو قوت سامع وصول کرے گی۔ اگر شامہ کے لئے ہے۔ تو سبیل شامہ وصول کرے گی۔ اگر بولنے یا ذائقہ کے لئے ہے۔ تو سبیلِ زبان وصول کرے گی۔ اور اگر احساس لامسہ کے لئے ہے۔ تو سبیل لامسہ وصول کرے گی۔

یہ سارا تردّد جذباتِ باطنیہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اگرچہ بغیر تزکیۂ نفس کے یہ باطنی انکار و تخیلات و تصوّرات نورانیت نہیں پا سکتے۔

تاہم غیر مرئی طور پر انسانی وجود میں بنفسہٖ مکرّم ہوتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی طرح باطن سے میدان عقل و شعور پر چل کر براستہ عقل و شعور پر آجاتے ہیں۔ اور ادراک کئے جا سکتے ہیں۔

اِس طرح انسان کا باطن بہر نوع غیر مرئی عالم مدرکات کا مقام پالیتا ہے بلکہ سالکینِ راہِ حقیقت کے نزدیک ماضی، حال و مستقبل اور عالمِ خارج کے جملہ خصوصیاتِ داخلیہ اور خارجیہ کا محورِ کبرٰی انسان کا جہانِ باطن ہے۔

تمام چھوٹے بڑے جذباتِ انسانیہ مَطلعِ باطن سے طلوع ہو کر سب سے پہلے انفس کو منور کرتے ہیں۔

اِس کے بعد اِسی نورانیت سے جسم و جانِ انسانی کی صلاحیتیں انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہیں۔ جس طرح مطلع تاباں سے آفتابِ عالمتاب کے طلوع ہونے پر سب ذی جان مخلوقات انگڑائی لے کر جاگ اُٹھتی ہے۔ سوائے چمگادڑ اور اُلو کے کہ یہ رات ہی کو انگڑائی لے کر جاگتے ہیں۔

چمگادڑ اور اُلو سے صوفیائے سالکین نے حقائق پر وہم ید رکھنے والے لوگ مراد لئے ہیں۔ جو نہ تو بازارِ شعور کے مکین ہیں۔ اور نہ ہی لاشعور کے۔

یہ نفس کے دبیز پردوں میں فلکِ عقل و دانش کے اجرام افکار کی روشنی میں، نفس کی تاریکیوں میں پروردۂ نفس آنکھیں کھولتے ہیں اور جلبِ منفعت کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔

جِس طرح چمگادڑ اور اُلو اجرامِ فلکی کی چمک کے ساتھ آنکھ کھولتے۔ اور

روشنی پاتے ہیں۔ اور اپنی محدود پرواز جاری رکھ کر شبِ تیرہ و تار میں تلاشِ معاش کرتے ہیں۔

اِسی طرح دینِ فطرت کے بدعقیدہ لوگ ہیں۔ جو نفس کے دبیز پردوں میں افکارِ انسانی سے استفادہ کرتے ہیں۔

مگر نورِ ایمان کے مطلعُ الاَنوار کے نورِ تاباں سے اپنے باطن کے جہانِ نور میں اقامت اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ چمگادڑ یا اُلو حیوانِ مطلق ہیں۔ بس وہ فعلِ خلقی کے تابع ہیں۔ جو اپنی جبلّت تبدیل نہیں کر سکتے۔

مگر انسان وہمِ بد کا شکار ہونے کے بعد نفس کے تیرہ و تار جہانوں میں افکار کی روشنی میں ایک مدتِ مدید رہنے کے بعد بھی جہانِ باطنیہ میں نورانیتِ صالحہ حاصل کر کے صاحبِ ایمان ہو سکتا ہے۔ اِسی پُر امید فکری نوعیّت کے اعتبار پر غیر مسلمین کو دعوتِ حق دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔

سالکین کے نزدیک تزکیۂ نفس کے ساتھ نورِ ایمان حجابِ باطن سے نِکھر کر بصیرت کے سامنے آجاتا ہے۔ جس سے عارفِ باللہ نفسِ باطن کا تعارف حاصل کر لیتا ہے۔ اور مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کا مصداق ہو کر عرفِ نفسی کے ساتھ عرفِ ربانی حاصل کر لیتا ہے۔

جس طرح فکریں سبیلِ شعور پر آکر گوشۂ وجود پر اپنے انوار ظاہر کرتی ہیں۔ اِسی طرح تزکیۂ نفس سے بصیرت پر نورِ عرفان اترتا ہے۔

میں نے ریاضت کا ابتدائی آغاز طریقہ سلسلۂ قادریہ پر شروع کیا۔ جِس میں مجھے یہ تعلیم دی گئی تھی۔ کہ سلسلۂ قادریہ ہر خارجی تاثیرات بے گانگی کے ساتھ نظریۂ توحید پر یقین کامل حاصل کرنے کے لئے کلمۂ توحید کو نقطۂ آغازِ سلوک اور انتہائے سلوک قرار دے کر ریاضت کی بنائے اوّل ڈالتا ہے۔

اور جب اس پیرائے سے مُبتدی آغاز کرے۔ تو اُسے سوموار کی صبح سے باطہارت کاملہ الگ تھلگ مگر پاک و صاف جگہ پر نہایت عاجزانہ انداز میں دو رکعت نماز نفل بندگی

ادا کرکے دو زانو روبقبلہ اِس طرح اپنی توجہ اللہ تعالےٰ کی طرف مرکوز کرلینی چاہیئے۔ کہ گویا وہ ہر ماسوا اللہ سے کٹ کر بالکل ایک منفرد عاجز کی طرح بے دست و پا اور تہی دامن غریب و مسکین بن کر اور اللہ تعالےٰ کا فقیر بن کر اللہ کے درِ نیاز پر گدائے عبودیت مانگنے کے لئے نیازمند بن کر آیا ہے۔

بس اِس نیّتِ کاملہ کے ساتھ وہ ننانوے مرتبہ پوری اعوذ پڑھے۔ اور اِس کے ترجمہ پر غور رکھے۔

پھر تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ننانوے مرتبہ اُس کے معانی پر غور کرتے ہُوئے پڑھے۔ پھر ننانوے مرتبہ درود شریف پڑھے۔

اُس کے بعد ننانوے مرتبہ پُورا کلمۂ طیبہ پڑھے۔ پھر ننانوے مرتبہ کلمۂ شہادت اِسی طرح کلمۂ تمجید۔ پھر کلمۂ توحید۔ پھر کلمۂ استغفار۔ پھر کلمۂ ردِ کفر۔ پھر ننانویں ننانویں بار ایمان مفصل اور ایمانِ مجمل پڑھے۔

پھر لوٹ کر کلمۂ طیبہ پر آئے۔ اور اُسے ننانوے مرتبہ پڑھے۔ اور کلمۂ شہادت کا بھی دوبارہ ننانوے مرتبہ تکرار کرے۔ اور کلمۂ تمجید کو بھی ننانوے بار دھرائے۔

اِس کے بعد فرمایا۔

سُبْحَانَ ذِی الْمُلْکِ وَالْمَلَکُوْتِ۔ سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّةِ وَالْعَظْمَةِ وَالْهَیْبَةِ وَالْقُدْرَةِ وَالْکَمَالِ وَالْجَلَالِ وَالْجَمَالِ وَالْکِبْرِیَآءِ وَالْجَبَرُوْتِ۔ سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَنَامُ وَلَا یَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰٓئِکَةِ وَالرُّوْحِ ننانویں مرتبہ پڑھے۔

پھر یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ بِحَقِّ لَآاِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ننانوے مرتبہ پڑھے۔ اور اُس کے بعد ننانوے مرتبہ درود شریف پڑھ کر دو رکعت نماز نفل بندگی ادا کرے۔ اور یَاحَلِیْمُ یَاخَبِیْرُ کا وِرد کرنے کے بعد کچھ وقت کے لئے مراقبہ کرے۔

حالتِ مراقبہ میں وہ اپنے دل پر نظر رکھے۔ اور اپنے دل پر بصیرتِ عارفانہ کے ساتھ غور کرے۔

کیا وہ اپنے دِل میں اللہ تعالےٰ پر کامل یقین رکھتا ہے۔ اگر دِل کو ایمان پر صاحبِ استقامت پائے۔ تو زبان سے بِالجَھر اَلحَمدُ لِلّٰہِ پڑھے۔ پھر اپنے سارے وجود پر غور کرے۔ اپنی پیدائش سے لے کر حال تک وہ کیا کرتا رہا۔ اور اب اِس ریاضت کے دوران کِس حالت میں ہے۔ ایسی حالت میں اپنے وجود کو سیاہ دیکھنے کی کوشِش کرے۔

اِس خیال پر کہ وجود پُر تقصیر ہے۔ اس نے نفس وشیطان کے وسوسوں سے مغلوب ہو کر بڑی بڑی خطائیں کیں۔ بڑی کوتاہیوں کا شکار ہُوا۔ اور اپنے پالنے والے سے غافل ہوا۔ اور غیر کی طرف متوجہ رہا۔

یہ اعتراف پوری دلجمعی کے ساتھ کرتے ہُوئے بِالجَھر اَستَغفِرُ اللّٰہَ العَظِیمَ وَ اَتُوبُ اِلَیہِ پڑھے۔

پھر عالمِ انفس اور عالمِ آفاق کے متعلق عالمِ خلق ہونے کا پورا تصوّر کرے۔ اور یقین کرے کہ یہ بات سچ ہے۔ کہ انفس و آفاق دونوں اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور ان میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جو باقی باللہ نہ ہو۔

سب چیزیں اللہ ہی کے حکم سے وجود میں آئیں۔ اور اُسی کے فضل و کرم کے نور سے مشہود ہوئیں۔ اور اُس کی تربیت سے پرورش پا کر نمود پانے والی ہیں۔

اِس تصوّر کے بعد بلند آواز سے اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ پڑھے پھر یَاحَلِیمُ یَا لَطِیفُ پڑھتے ہوئے بغرضِ قیلولہ نیّتِ قیلولہ کرتے ہُوئے سو جائے۔

نمازِ ظہر تک آرام کرے۔ آدھ گھنٹہ قبل از نماز بیدار ہو کر طہارتِ کاملہ کا اہتمام کرے۔ اور نماز کی تیاری کرے۔

اگر مسجد میں ہو تو نماز باجماعت ادا کرے۔ اور اگر مسجد کے قریب ہو، تو بھی حتی المقدور باجماعت نماز ادا کرے۔ اگر ایسا نہیں تو خود کسی کو شریکِ نماز کرنے کے لئے آذان دے۔ اگر نمازی مِل جائیں تو خود امامت کرے اور نماز باجماعت ادا کرے۔ اگر کوئی بھی نہ ملے تو فرداً نماز ادا کرے۔

جِس دن مبتدی نے اِس ریاضت کی نیت کی۔ اُس دن سے لے کر تا زندگی کمال اہتمام اور خشوع و خضوع کے ساتھ نمازیں ادا کرنے کی نیت کرے۔

بڑے خوف و رجا کے ساتھ اور دانشِ ایمانی سے کام لیتا ہُوا فرض نمازیں ادا کرے کیونکہ باقی تمام نمازیں سنت ہیں یا نفل۔

مگر پنجگانہ نمازیں اپنے اوقات کے ساتھ فرض ہیں۔ اور فرض نمازوں کا درجہ تمام نمازوں سے بلند ہے۔ اِس کے بعد سنتوں کا درجہ ہے اور یہ غور کرے کہ پنجگانہ نماز بنائے خمسہ میں سے ایک بنیاد ہے۔

اور عبادات میں یہ وہ بنائے اوّل ہے، جو بعد از ایمان ہے، جِس کے بغیر کوئی عمل چاہے کتنی ہی ریاضت کے ساتھ کیوں نہ ادا کیا جائے۔ نامقبول و نامنظور ہے۔

صوفیائے صالحین کے نزدیک باقی ریاضتیں تزکیۂ نفس کی صورت میں یا اذکار و اوراد کی صورت میں سب کی سب درستیٔ نماز کے لئے ہیں۔ جب نماز درست ہو جائے تو باقی ریاضتیں تابع نماز ہو کر از خود صحیح ہو جاتی ہیں۔ اور اگر نماز ہی غلط ہو جائے۔ تو صدہا سال کی ریاضتیں خاک کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ جو اللہ کے نزدیک نامقبول ہیں۔

بس کلمۂ طیبہ کے بعد صوم و زکوٰۃ ہو یا حج یا جتنے باقی ماندہ فرائض یا سنتیں یا نفل یا ذکر یا اوراد یا چلّے وغیرہ سب کے سب تکمیلِ نماز کے لئے ہیں)۔

قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی روشنی میں سالکینِ راہِ حقیقت نے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ سے اہلِ خشیّت نمازی مراد لئے ہیں۔ ۔ جنہوں نے نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط اور کتاب و سنت کے ذریعہ ایمان باللہ و ایمان

بالرسول و ایمان بالآخرت پایا۔

یہ کتاب مقدس یعنی قرآن مجید ایسے ہی اتقیا کے لئے ہدایت ہے، جو بر بنائے ایمان بالغیب اللہ تعالےٰ سے ڈرنے والے اور منہیات سے پرہیز کرنیوالے ہیں۔

یہ اسلام میں سب سے بڑی معتمد جماعت کے لوگ ہیں۔ جو کتاب و سنت کی روشنی میں بطرزِ صحیح اور براہِ راست علیٰ منہاج نبوت حزبُ اللہ ہیں۔

حزبُ اللہ ہونے کی شرعی شرائط اس گروہ میں موجود ہوتی ہیں۔ یہ جماعت ایمان باللہ کے بعد نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ نماز کی پابند ہوتی ہے۔ اور غلبۂ خشیت ربانی کی بنا پر قرآن مجید سے مکمل استفادہ کرتی ہے۔

اس پابندیٔ احکامات کی بنا پر حزبُ اللہ کے متعلق بشارت ہے۔ یعنی اللہ والی جماعت ہی تمام جماعتوں پر غالب رہے گی۔

چنانچہ ارشاد ہے۔

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔

خبردار مطلع رہو۔ کہ اللہ تعالےٰ کی جماعت ہی غالبون ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اپنی اس مخصوص جماعت کو مخصوص اندازِ عمل کی بنا پر تمام اسلامی شعبوں پر بوجہ تقویٰ برتری بخش دی ہے۔

یہی حزبُ اللہ صحیح معنوں میں اولیاء اللہ کی جماعت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ کسی جبہ ودستار یا کسی مسند وسجادہ و دلق کے ساتھ ہی اظہارِ برتری کریں۔

بلکہ اس جماعت کے لوگ ہر شعبۂ زندگی پر مامور کر دیئے گئے ہیں۔ کوئی تو اسلامی سیاسیات کے ذریعہ مراتبِ امارت پر فائزالمرام ہوکر اسلامی طرزِ حکومت کے ساتھ انتظام ملکی کی کفالت کرتے ہیں۔

یہ لوگ بڑے صاحبِ استقامت ہوتے ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کے بغور مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ایسے امرائے ملّتِ اسلامیہ بھی اللہ کی

جماعت یعنی حزب اللہ ہوتے ہیں۔ اور اظہارِ غلبۂ دین ایسے ہی اُمرائے ملت کے ذریعہ تکمیل پاتا ہے۔

خلفائے راشدین نے اِسی مقام پر فائز المرام ہو کر اپنی متقیانہ اسلامی طرزِ حکومت کے ساتھ غلبۂ اظہارِ حق فرمایا۔ اور سیاستِ مدنیہ کے فرائض خوف باللہ کے ساتھ باحسن وجوہ انجام دیئے۔ اور غلبۂ حق اُن کی صالحانہ امارت کے ذریعہ نمودار ہوا۔

ہر شعبۂ حیات میں اُمرائے قوم کی اطاعت میں اتقیا نے زیادہ اطاعت شعاری کا ثبوت دیا۔ اور اِس ثبوتِ اطاعت نے زیادہ اطاعت شعاری پیدا کی ہے۔

نیز اس اظہار اطاعت نے اولی الامر منکم کی عملی تفسیر بھی مرتب کی۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ کا قولی و عملی ترجمہ اسی حزب اللہ نے ترتیب دیا۔ جو تاریخی طور پر ملتِ اسلامیہ کی ہر دور میں راہنمائی کرتا ہے۔ اور یہ تاریخ ابدالآباد تک بفضل اللہ محفوظ و مامون رہے گی۔

یہ لوگ اولیائے کاملین ہیں۔ اِن کی سیاستِ اسلامیہ اور دوسری جماعتوں کی سیاست میں اتنا بیّن فرق ہوتا ہے۔ کہ ہر بالغُ النظر مسلمان بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اتقیا کا سیاستِ مدینہ میں کیا تصرّف ہے۔ اور غیر اتقیا متصرفینِ سیاست کا کیا حال ہے۔

حزب اللہ کا تصرف علی الاعلان اطاعتِ خدا و رسول اور سیاستِ مدنیہ کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے۔ جِس کی ادائیگی سے فضیلتِ بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔

اور ایسے لوگ محض ظاہری جلال و جمال کے قائل نہیں ہوتے۔ بلکہ اسلام کی معینہ حدود میں رہ کر احکاماتِ الٰہیہ کے نفوذ کے ساتھ اور پابندیٔ عمل کے ساتھ جس قدر متقیانہ جاہ و تجمل اُنہیں ملتا ہے۔ بس اُسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اُن کا جلال جلالِ خداوندی اور اُن کا جمال جمالِ خداوندی کا مظہر بن کر عدالتِ اسلامیہ پر اُنہیں لاتا ہے۔ وہ ہر ظالم سے مظلوم کا بدلہ لیتے ہیں۔ تاخیر سے کام نہیں لیتے

اور ہر عفو و درگزر کے موقع و محل پر رحمت و رافتِ متقیانہ کے ساتھ جمالِ اسلام بن جاتے ہیں۔ اور اخلاقِ اسلامیہ کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ اِن کا جلال و جمال خود ساختہ نہیں ہوتا۔

بلکہ اسلامی احوال کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ متخلق باخلاقِ باللہ ہونے کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اُن کا جلال و جمال اطاعتِ اسلام کی پیداوار ہوتا ہے۔ اُن سے ڈرنے پر خدا کا ڈر محسوس ہوتا ہے۔ اور اُن سے محبت کرنے پر خدا کی محبّت نصیب ہوتی ہے۔

ایک طرف وہ پُرجلال عادل ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف وہ پرجمال عفو و درگذر کرنے والے منکسرالمزاج حلیم الطبع ہوتے ہیں۔

اُن کی خفی و جلی زندگانیاں ہمہ وقت مصروفِ اطاعت ہوتی ہیں۔ اُن کا کوئی لمحہ غافل نہیں ہوتا۔ جس طرح اسلامی رعیت کو وہ خوف کے ساتھ پابندئ احکامات کا حکم دیتے ہیں۔ اُسی طرح وہ خود خدا اور رسول کے خوف سے پابندِ احکامات ہوتے ہیں۔

ایسی حزب اللہ کے مقابلہ میں دوسرے قسم کے مُسلمان حکمران جب محرومئ تقویٰ کی بنا پر خوف و رجا سے محروم ہوجاتے ہیں۔ اور یہ خوف و رجا کی کمی اُنہیں مصنوعی جلال و جمال کی طرف آمادۂ کار کردیتی ہے۔ تو ایسی حالت میں وہ اسلام کا نام تو لیتے ہیں۔ مگر رسماً۔

انجام کار اُن کی بے خوفی اُنہیں ملوکیّت پر مجبور کردیتی ہے۔ جس سے لوگوں پر خارجی دہشت کا سِلسلہ جاری ہوجاتا ہے۔

رعیّت کے لوگ اُن کے ذریعہ بجائے خوفِ خدا کے خوفِ عزت کا شکار ہوجاتے

ہیں۔ جب سے مسلمانوں میں ایسی سیاست نے رواج پکڑا۔ خوف خدا کم ہو گیا۔ اور ملوکیت کی رسم جاری ہوئی۔ اور رسمِ ملوکیت نے امارتِ اسلامیہ کو جو شورائے کے ساتھ رائے عامہ پر قائم ہوتی ہے۔ اُس کو مبدل بملوکیتِ آمرانہ کر دیا۔

جس سے سیاستِ مدنیہ اسلامیہ کو ملوکیت ظاہریہ کے پردوں میں حجاب در حجاب رکھ کر فہم اسلامیہ سے الگ کر دیا گیا۔

اِس ملوکیت نے اسلام سے ہٹ کر غیر اسلامی سیاسیات کو داخلِ ریاست بھی کیا اور غیر اسلامی شعائر کو بھی رواج دیا۔

جس سے ہر آنے والے دَور میں متقیانہ امارتِ مدینیہ کا اسلامی نقشہ بدلتا گیا۔ اور انجام کار سیاستِ اسلامیہ مسلمانوں کے لئے ایک اجنبی سیاست بن گئی۔

اللہ تعالےٰ کی جماعت یعنی حزب اللہ متقیانہ شرافت کے ساتھ ہر زمانہ میں موجود رہے گی۔ اور اِسی جماعت سے مجددینِ اسلام پیدا ہوا کریں گے۔

اللہ کی جماعت یعنی حزبُ اللہ کا پہلا اطلاق صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی جماعت پر ہوتا ہے۔

اُس کے بعد قیامت تک ہر زمانہ میں اللہ کی جماعت صحابۂ کرام کی اطاعت میں ہی حزبُ اللہ کہلا سکتی ہے۔ اور ایسے ہی متبعین کی جماعت سے مجددینِ اسلام پیدا ہوں گے۔

جن کی بڑی پہچان یہ ہو گی کہ وہ کوئی خلافِ دین کام نہیں کریں گے وہ خلافِ اسلام کسی نئی رسم یا نئے دین کے ساتھ نہیں آئیں گے۔

وہ تجدیدِ ملت کتاب وسنت کے مطابق کریں گے۔ اور ملوکانہ تصورات اور مخترعانہ تعلیمات کا خاتمہ کریں گے۔ وہ حصولِ تخت وتاج کے بجائے اسلامی نظریات کو ترویج دینے والے ہوں گے۔ یہ لوگ اسلامی نظریات کو تسلیم کرانے میں حکومت

وسطوت کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں۔

جو مدعیٔ تجدّدِ اسلام کے بنیادی احکامات میں ردّ و بدل کرے یا خدا و رسول کی یا اہلِ بیت اطہار کی اہانت کرے۔ یا صحابہ تابعین یا تبع تابعین کی راہ سے فرار چاہے۔ یا اُن کی اہانت کرے۔

یا سلف صالحین پر تفوق و برتری کا مدعی ہو۔ یا کتاب و سنت کے خلاف کسی نئی راہ پر دعوت دے۔ یا محض وہ غلبہ حاصل کرنے کے لئے کوئی نئی طرزِ سیاست سامنے لائے تو ایسا مدعی اپنے دعوائے تجدّد میں کاذب ہوگا۔

ایسے مدعی پر مجدّدِ دین کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ چونکہ وہ حزب اللہ سے نہیں۔ وہ صرف ایک سیاسی شخص ہو سکتا ہے۔ جس کی سیاست کا اسلامی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔

ایسے مصنوعی لوگ ہر زمانہ میں مجدّد ہونے کا دعوی کرتے رہیں گے۔ مگر صالحین علمائے اسلام کی جماعت اُن کا ردِّ عمل کرتی رہے گی۔ اور علمائے اسلام کے ذریعہ اُن کے جھوٹے دعوے طشت از بام ہوتے رہیں گے۔

اللہ تعالےٰ کی جماعت والوں کی تعریف کتاب و سنت کی متعینہ ہدایات کی روشنی میں ہوتی ہے۔

وہ نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ کے پابند ہوتے ہیں۔ اُن کا کوئی حال ایسا نہیں ہوتا۔ جس میں نماز قضا ہو سکے۔ یا کیف و مستی اِس حد تک آجائے۔ کہ وہ اپنی نماز کو صرف حالِ روح پر چھوڑ دیں۔ اور اپنی نماز کو اشتراکِ جسم سے الگ کرلیں۔

جیسا کہ بعض باہوش بدعتی بے دین لوگ اپنی نماز کو روحانی نماز قرار دے کر بظاہر ادائیگی نماز سے عمدًا کوتاہی کرتے ہیں۔ اور دعوای کرتے ہیں کہ اُنہوں نے روحانی طور پر نماز ادا کرلی ہے۔

ایسے لوگ اگر بال بچہ دار ہوں۔ اور کھانے پینے، اوڑھنے، رہنے، سہنے کا ہوش

بھی رکھتے ہوئے ایسی روحانی نماز کا دعویٰ بھی کرتے ہوں۔ تو ان پر حزب اللہ کی جماعت کے فرد ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

اور نہ ہی ایسے بدعتی اور بے دین لوگ کوئی متقیانہ سلوک کرنے کا دعویٰ کر سکنے کے مجاز ہیں۔ اور نہ ہی اُن سے کوئی مجدّد ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی ایسے لوگ ہادی و مرشدین ہو سکتے ہیں۔

حزبِ اللہ اشتراکِ جسم و روح کی نماز کے ساتھ انفاقِ مال کرنے والی اور آسمانی کتب پر اور یومِ آخرت پر کامل یقین رکھنے والی جماعت ہوتی ہے۔ اور ختمِ نبوت کے بنیادی نظریہ کی قائل ہوتی ہے۔

اِس جماعت کی تحریر و تقریر ایسی تمام تر توجیہات سے پاک ہوتی ہے جس سے کسی طرح بھی اسلامی بنیادی معتقدات میں فساد کا شبہ پیدا ہو سکتا ہو۔

یہ لوگ عام فہم طرزِ تبلیغ کے ساتھ غلطیوں کا احساس دلا کر صراطِ مستقیم کی از سرِ نو وضاحت کرنے میں تائیدِ ایزدی کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نبضِ کائنات کی دھڑکنوں کے مطابق ایک ہی زاویۂ نگاہ کے ساتھ بگڑے ہوئے طبائع کو ہدایت کی جانب مبذول کر لینے کی خداداد صلاحیتوں کے مالک بھی ہوتے ہیں۔

وہ ترویج و تنفیذِ دین کی راہ میں ہر قسم کے شدائد پر صبر و استقامت کی توفیقات کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ وہ راہِ حق میں غازئ سُبکسار ہوتے ہیں۔

اور انجامِ کار راہِ حق میں جانِ عزیز کی شہادت کو ترجیح دینے میں خوشی پاتے ہیں۔

اُمتِ خیر الانام میں آج تک کوئی ایسا مجدّد نہیں گزرا۔ جس نے بنیادی احکامات میں ردّ و بدل کرنے کی سعی کی ہو۔

والد بزرگوار نے فرمایا۔

عامۃ المسلمین ہدایت کے لئے ہمیشہ علمائے صالحین کے محتاج ہوتے ہیں اگر علمائے صالحین اہلِ استقامت ہوں۔ تو عامۃ المسلمین بآسانی ہدایت پا لیتے ہیں۔ اور علمائے صالحین ہمیشہ متشرع علمائے بواطن کی مرہون ہدایت ہوئے ہیں۔ اور علمائے بواطن سے ہی علمائے صالحین کو استقامت ملتی ہے۔ اور علمائے بواطن جو شریعتِ حقہ کے پابند ہوں۔ وہ اخص الخواص کے مرہونِ ہدایت ہوتے ہیں۔ جنہیں اخص الخواص کے ذریعہ استقامت ملتی ہے۔

اور اخص الخواص اللہ کی جماعت کے سردار ہوتے ہیں۔ جن کی نگرانی میں خواص اور علمائے صالحین تربیت پاتے رہتے ہیں۔

اِس گروہ کی ہدایات عملی سبیلِ تقویٰ کے ذریعہ علما اور عامۃ المسلمین تک پہنچتی رہتی ہیں۔

اِس واسطے حزب اللہ یعنی اللہ تعالےٰ کی جماعت کبھی خلافِ دین توجیہات میں خود وقت ضائع نہیں کرتی ہے اور نہ ہی ملتِ اسلامیہ کو شبہات میں مبتلا ہو کر تضیعِ اوقات کرنے دیتی ہے۔

فرمایا۔ چھوٹے بڑے صالحینِ اُمت کی ریاضتیں اور اُن کی تمنائیں، اور اُن کی دردمندانہ دعائیں مِل کر ایک صدی میں ایک مردِ صالح و فالح کو خداوندِ ذوالجلال سے مانگ لیتی ہیں۔ جِس کو اللہ والوں کی قیادت کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

جس کی دعائیں اور نگاہیں دور رس ہوتی ہیں۔ وہ اسلامی آئینہ داری میں ماضی، حال و مستقبل کا صحیح جائزہ لینے کے بعد تلافیٔ مافات کے لئے عملوا الصّٰلحٰت کے ساتھ میدانِ عمل میں اُتر آتا ہے۔

اُس کی وضع قطع سب مسنون ہوتی ہے۔ اس کا لباس، اس کا چہرہ

اُس کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا۔ اُس کی تحریر و تقریر، اُس کا سفر و حضر اُس کی خوشی و غمی سب کے سب مجموعۂ سنتِ رسول کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتے ہیں۔

فرمایا کوئی مجدّد مقطوع الریش بھی نہیں ہو سکتا۔ کوئی مجدد نماز روزہ، حج و زکوٰۃ میں سے کسی رکن کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کر سکتا۔

کوئی مجدّد اپنے آپ کو خدا اور رسول کی صفات میں دخیل نہیں سمجھتا۔ اگر وہ خدا اور رسول کی صفات میں دخیل ہونے کا دعویٰ کرے۔ تو وہ مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔

مدعی تجدّد اگر نبی اللہ کی سنت کی اطاعت کے علاوہ اُن کی ذات و صفات کو اپنی ذات و صفات کے ساتھ مماثل کرے۔

مثلاً ظلی و بروزی نبی وغیرہ تو دعوائے مجددیت تو اپنے مقام پر رہ جاتا ہے۔ وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔

فرمایا غلام احمد قادیانی نے پہلے عالمِ دین ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔

مابعد ان دعووں کے ظلی و بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر مہدئ موعود۔ اور علی التکرار مسیحِ موعود اور کرشنِ موعود وغیرہ کا دعویٰ کرتا رہا۔ اور وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ کا مصداق بنتا رہا۔

مرزا غلام احمد قادیانی جب اِس نقطۂ کذب و افترا پر پہنچا کہ اُس نے تاویلانہ توجیہات کے انداز اختیار کئے۔

تو وہ خارج از اسلام ہو گیا۔ اور اِس خروج و ارتداد کے بعد اللہ تعالےٰ اس پر اتنے ناراض ہوئے۔ کہ اُس پر ہدایت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ اور وہ صریح گستاخ ہوا۔ اور اُس کی زبان و قلم سے اتنا غلیظ مواد خارج ہوا۔ کہ جس کی غلاظت اور عفونت نے اجتماعِ اُمت کا قافیہ

تنگ کر دیا۔

اِس قِسم کی کاذبانہ تاویلات کے پھندے ڈالنے والے اسلامی متقیوں کا لبادہ اوڑھ کر شیطان کی رفاقت میں لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

فرمایا ایسے لوگ اور اُن کے پیروکار انجام کار ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کا حال سامری اور مسیلمہ کذاب کی طرح اُن کے لئے مہلک بن جاتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ میں ایسے لوگوں کی تاریخ تاریخِ مکذبین کہلاتی ہے۔ اور وہ ابدالآباد تک مکذبین میں شمار کئے جائیں گے۔

فرمایا۔ کتاب وسنت تقوٰی کا صحیح معیار ہے۔ خلافِ سنتِ خیرالانام کوئی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

اِس واسطے اگر کوئی مسلمان متقی بننا چاہے تو متشرع اہل اللہ کی نگرانی میں منزل بمنزل آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ تاکہ ریاضت کا کوئی شرعی گوشہ اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے۔

ورنہ بصورتِ دیگر ریاضتِ دینیہ میں وقفہ ہو جائے گا۔ جیسے قیامِ نماز میں وقفہ سقوطِ نماز کا باعث ہو جاتا ہے۔

اِسی طرح تغافلِ منازل وقفہٗ ریاضت بن جاتا ہے۔ اور یہ وقفے منزلِ مقصود سے دُور کر دیتے ہیں۔

ایسے وقفہ جات ایک مدت العمر میں صوفی کے لئے ذریعۂ کذب بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسے وقفوں کے بعد بھی صوفی یہ کہے۔ کہ مَیں نے یہ منازلِ سلوک بکمال طے کر لئے ہیں۔ تو اِس میں کذب آجائے گا۔ حالانکہ اِس نے ترتیبِ منازل میں وقفے کئے ہیں۔

پھر جھوٹ ہی کو ذریعۂ تشہیر بنا لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے بے جا دعوے تصوّف میں ناکامی کا موجب بن جاتے ہیں۔

فرمایا اسلام میں رہبانیت کو ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر ریاضت کرنی ہے۔ تو گوشہ نشینی اس غرض سے اختیار کرنی چاہیئے۔ کہ ریائے نفسانی اور عجبِ نفسانی کے خلاف جہاد کروں گا۔ اور یہ جہاد خلوت و جلوت دونوں میں ضروری ہوتا ہے۔

لہٰذا ریاضت کے بعد مجلس میں واپس آنے کی نیت کرلے۔ ورنہ رہبانیت کا شکار ہو جائے گا۔ جو شریعت میں ناجائز ہے۔ جس فقر کو رہبانیت کے ساتھ نسبت ہو، وہ کسی طرح اسلامی فقر و غنا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ متعلق بالغیر ہو کر سادھوپن اور رہبانیت رہ جاتا ہے۔ ایسے راہبانہ تصوّف کے ساتھ عباداتِ اسلامیہ کی توہین ہوتی ہے۔

طریقۂ قادریہ اُس سبیلِ شرعی پر چلنے کا نام ہے۔ جو اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کا مصداق بنائے۔ یہی وجہ ہے، کہ طریقہ قادریہ سید الطرق ہے۔

اس کے علاوہ میں سلسلہ چشتیہ نقشبندیہ سے بھی اجازت یافتہ ہوں۔ فرمایا میں نے سلسلہ سہروردیہ کے طریقہ پر بھی ریاضت کی ہے۔

مگر تین طریقوں سے اجازت یافتہ ہونے کی بنا پر تمہیں بھی تینوں طریقوں پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیتا ہوں۔ بڑی احتیاط سے ان پر پابندی کرنا۔ اور علمائے امت کا ہمیشہ احترام کرنا۔ علماء جس بات پر یا عمل پر احتساب کریں۔ اُسے بارِ خاطر نہ جاننا کہ اہلِ تقویٰ احتسابِ شرعی کو اپنے لئے موجبِ رحمت گردانتے ہیں۔

علمائے اسلام کی مجالس سے راہِ سلوک میں اعتدال و احتیاط میسّر آتے ہیں۔

ستائیسواں باب

اہلِ دُنیا و اہلِ ایمان

اہلِ دنیا حکمرانوں کی نسبت اہلِ ایمان کی حکومت زیادہ دیرپا ہے۔ اور لوگ نسبتاً اُن سے زیادہ محبت وعقیدہ کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ وجہ معلوم کرنی ضروری ہے۔ کہ انبیا اللہ یا قوموں کے مذہبی راہنما قرن ہا قرن تک لوگوں کے دلوں میں کیسے اور کیونکر ابدی محبت پا لیتے ہیں۔ بوجودیکہ وہ ظاہری تمکنت کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ اور اہلِ دنیا حکمران اگرچہ اپنی حاکمانہ تاریخ مرتب کر لیتے ہیں مگر لوگوں کے دلوں میں اُن کی عقیدت کیوں نہیں ہوتی۔

بَرخلاف اِن حاکمانِ دُنیا کے خلفائے اسلام نے بھی حکومت کی۔ مگر انہوں نے بوجود حکمران ہونے کے بھی عقیدت و احترام کے ساتھ ابدی طور پر لوگوں کے دلوں کو جیت لیا۔

اِس کی واضح وجہ یہ ہے۔ کہ اہلِ دنیا حکمرانوں نے ہمیشہ ظاہری تمکنت کو پسند کیا۔ اور لوگوں پر حکمرانی برائے حکمرانی کی طرز نمود و نمائش کو اپنی عادت بنایا۔

انسانیت اپنی اجتماعی زندگی کی بحالی اور اُس کے اعتدال و انضباط کے لئے ہمیشہ حکمرانوں کی محتاج رہی ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گی۔

اِس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ لوگوں کی اِس فطری مجبوری سے غلط فائدہ اُٹھا کر کوئی حکمران بجائے انتظامِ ملکی کے لوگوں پر اپنا دبدبہ محض جاری کر کے اُن کو ڈراتا

رہے۔ یہ عادت حکمرانوں کو حکومت کا موقع تو دیتی ہے۔ مگر انسانی سینے ایسے عادات کو اپنے دلوں میں محبت والفت کے لئے جگہ نہیں دے سکتے۔

اسلام نے اپنے ہر فرد و اجتماع کو تقویٰ اور پرہیز گاری کا درس دیا ہے۔ تاکہ اسلامی معاشرہ سے جب بھی کوئی فرد کسی صالحیت کے ساتھ بر سرِ عام آئے۔ تو خوفِ خدا کے ساتھ ہی وہ اپنی صلاحیت کا صحیح تصرف کرے۔

اگر ایسا متقی حکمران ہو جائے۔ تو بھی اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کی ادنیٰ رعیت سمجھتے ہوئے حکمرانی کے فرائض انجام دے۔ تاکہ اس میں اِنانیت نہ پیدا ہو۔

بلکہ وہ اللہ تعالےٰ کا عاجز بندہ ہو کر ایک جانب اللہ تعالےٰ کی بندگی کرے اور اس کا شکرانہ بجالائے۔ اور دوسری طرف اپنے آپ کو لوگوں کا خادم گردانتے ہوئے اُن کے حقوق پورے کرے۔

اِس نظریہ کے ساتھ اسلامی حکمران حاکم ہو کر بھی عوام کے سامنے اہل اللہ ہی تصوّر کئے جاتے ہیں۔ خلفائے اسلام کی حکمرانی کا یہی منظر تھا۔ بوجود حکمرانی کرنے کے بھی وہ اولیا اللہ ہیں۔ اُن کے عملی تقوٰی نے حکمرانی کو بھی متقی بنا دیا تھا۔

اس کے علاوہ اُمتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ شخصیات جنہوں نے حکمرانی نہیں کی۔ مگر تزکیۂ نفوس کے ساتھ وہ روحانیت کے اُن مقامات تک پہنچے، کہ سُلطانی بھی وہاں دم بخود تھی۔

یہ لوگ علماء و مفسرین کی صورت میں متقیانہ اعمال کے ساتھ فرائضِ بندگی ادا کرتے رہے۔ یہ لوگ اغواث و اقطابِ زمانہ بھی ہوئے۔ ابدال و اوتاد کے مقام پر فائز ہوئے۔ اُن کی پہنچ حیران کر دینے والی پہنچ تھی۔ ما فوق الادراک کرامات بھی اِن لوگوں سے صادر ہوتی رہیں۔

مگر ان لوگوں نے کبھی انانیت کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ بلکہ مجاہدات محض اسی لئے کرتے رہے۔ تاکہ اِس قسم کی زائدہ اور بے ہودہ امراضِ نفسانی اُن پر یا معاشرہ

پر غلبہ نہ پاسکیں۔

چونکہ اہل اللہ کے نزدیک غرورِ نفس ہی وہ مہلک ترین عادت ہے جو انسان کو نہ ہی خدا کا چھوڑتی ہے۔ اور نہ ہی انسانوں کا۔ اور نہ اپنا۔ ایسا صاحبِ غرور اپنی ذات کے لیئے بھی نفع بخش نہیں ہوتا۔

دنیا میں دونوں قسموں کی حکومتیں یعنی اہل اللہ اور اہلِ دنیا کی بیک وقت ہر زمانہ میں موجود رہتی ہیں۔ بسا اوقات زمین کا کوئی حصہ اگر ظاہری سلطنت سے محروم ہو بھی جائے۔ تو بھی وہاں اہل اللہ کے تصرفات التزامِ روحانیت کے ساتھ جاری رہتے ہیں۔ اور یہ انصرام و انتظام روحانیت کے ذریعہ ضابطوں میں پابند رہتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی کبھی اور کسی لمحہ کے لئے اہلِ روح اولیاء اللہ کی روحانی حکومت بند نہیں ہوتی۔ جب اور جس زمانہ میں اس حکومت میں تعطّل آئے گا قیامت بپا ہو جائے گی۔

اسلام کی حکومت اللہ کی حکومت ہے۔ وہ دنیاداروں کی سیاست نہیں۔ وہ اپنی ریاست میں مرد و زن کے لئے تقویٰ چاہتی ہے اور تقویٰ پر ہی خالص اسلامی تہذیب و تمدن کی بنا قائم ہو سکتی ہے۔

اِس طرح خدا اپنے بندوں کے ذریعہ دنیا پر اپنا رحم و کرم جاری رکھتا ہے۔ جب قومیں ایک جسم کی صورت میں متفق ہو جائیں۔ اور اُن کے راہنما اُن کے اجتماع قوم کا روحانی دِل ہو جائیں تو وہ قوم پیکرِ کرامت بن جاتی ہے۔

جس کا معبودِ برحق خدا وحدہٗ لاشریک ہوتا ہے۔ اور جس کے رسول آخری نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والسلام ہوتے ہیں۔

اور جس کا قبلہ بیت اللہ شریف ہوتا ہے۔ اور اُس کا آئین کتابُ اللہ اور کتابِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے۔ اور جس کا ایمان بالآخرت یہ ہوتا ہے کہ اُس نے اور ساری مخلوقات نے قیامت کے دن ایک خدائے برتر کے سامنے جواب دینا ہوگا۔

اگر ہر دعوٰی دلیل چاہتا ہے۔ اور دلیلِ صائب کے ساتھ دعوٰی کی تصدیق ہو جاتی ہے اگر یہ درست ہے۔ تو اس دعوٰی کی دلیل بھی صحیح ہوگی۔ کہ مادہ پر روحانی حکومت جاری ہے کیونکہ ہر ظاہری صورت پر معنویت حکمرانی کرتی ہے۔ اور صورت کی بقا معنویت پر منحصر ہے۔

اور وجودِ معنویت ہی ظاہری صورت کو تمکنت دیتا ہے۔ یہ مثال ہر ظاہری صورت پر اطلاق کرتی ہے۔

ایک ذرۂ بے مقدار سے لے کر عالمین کی مجموعی صورت پر اِس بات کا اطلاق علی الأصول ہے۔ کہ یہ ساری کی ساری کائنات فطری معنویت پر قائم ہے۔ جس کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ مگر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر ذی جان کی صورتِ جسم میں اُس کی جان معنویت ہے۔

معنویت پر صورت اُستوار ہوتی ہے۔ اور ہر صورت سے جو جو نتائج نمودار ہوں۔ اُن کو صورت کی سیرت کہا جاتا ہے۔ اور عالمِ مادہ اپنی صورت کو معنویت پر اُستوار کرنے کے بعد ہی نتیجتاً ظہور پذیر ہوا ہے۔

اور یہی صوری نتیجہ متشکل کائنات بنا۔ اور اس ظاہری کائنات کو اور اس کی ظاہری حکمرانی کو مادی کائنات اور مادی حکومت کہا جاتا ہے۔

انسان خود ایک صورت ہے۔ جو انسانی معنویت پر متشکل ہوا۔ اور اُس کی سیرت تمام عالمین سے افضل و اعلیٰ ہے۔

چونکہ یہ صاحبِ عقل و نطق ہے۔ اِس کی ترقیات کا پھیلاؤ اِس کی معنویت سے شروع ہو کر جسم کی راہوں سے مخلوقات تک اپنے استفادے پہنچا کر پھر معنویت پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔

انسانی معنویت کی ابتدا علم الٰہی سے شروع ہو کر بصورتِ آدمؑ عالمِ خلق میں نمودار ہوئی۔ معنویت میں انسان خدا کے علم میں اشرف المخلوقات تھا۔ اِس واسطے اشرف کی تشریف آوری سے پہلے عالمین کو اُس کے لئے فرشِ راہ بنایا۔ تاکہ وہ نزولِ آدم علیہ السلام

کے ساتھ اور اُن کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہو۔

پیکرِ آدم صورتاً خاکی تھا۔ مگر معنویت میں اشرف الخلائق ہو کر اول البشر اور ابوالبشر کا مقام پایا۔

مگر یہ معنویت صورتاً و سیرتاً بالنبوۃ بنتی ہے۔ اور پیکرِ خاکی معنویت سے صورت اور سیرت بن کر قبائے نبوت زیب تن فرماتا ہے۔ یہ پیکرِ آدم معنویت میں ابدالآباد تک نوعِ انسانیت کا جامع تھا۔ جس کی پشت میں ازل سے ابدالآباد تک پوری اولادِ آدم مستور تھی۔ معنویت سے صورتِ جسم اور صورتِ جسم سے صورتِ قلب اور صورتِ قلب سے نظامِ تولید۔

پھر دوسری معنویت حوا علیہا الصلوٰۃ والسلام کی صورت میں آپ کی پسلی سے پیدا ہوئی۔ پھر علم الٰہی کی معنوی حیثیت حکمِ الٰہی سے دو صورتوں میں نمودار ہوئی۔ اور وہ دو صورتیں حضرت آدم اور حضرت حوا علیہا الصلوٰۃ و تسلیمات تھیں۔

پھر معنویت نے ارحام کی بنیاد ڈالی۔ اصلاب و ارحام کا سِلسلہ جاری ہوا۔ اصلابی مادہ نے بالاِستنار ارحام میں منتقل ہو کر صورتِ آدم کی تخلیق کا دوسرا جامہ پہننا شروع کیا۔

آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔ اور حوا علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی بغیر دستورِ اصلاب و ارحام پیدا ہوئے۔ اور اِن دونوں کے جوڑے سے صنفی صورت نے ایک تیسری صورت اختیار کرلی۔ یعنی پشت سے رحم مادر میں اور رحمِ مادر میں انسانی خاکہ کشی۔

جیساکہ ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔

هُوَ الَّذِی یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ۔

اللہ وہ ذات ہے۔ جو تمہیں رحمِ مادر میں جس صورت کے ساتھ چاہتا ہے۔ ویسا ہی بنا دیتا ہے۔

یہ معنویت پر صورت کی چوتھی متشکل ترتیب ہے۔ پھر یہ ترتیب ہمیشہ کے لئے جاری ہو گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بعد از آدم و حوا ایک نئی قدرت کی مثال ہے۔ آدم علیہ السلام مذکر تھے۔ آپ کے وجود سے بغیر مادہ صلبیہ اور بغیر رحمِ مادہ کے مؤنث کو بصورتِ عورت پیدا فرمایا۔ جو ذریعہ اولادِ آدم بنیں۔

حوا علیہا الصلوٰۃ والسلام نبی اللہ نہیں تھیں۔ بلکہ ولیہ تھیں۔ اور آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی اللہ تھے۔ مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام ایک عورت تھیں۔ یعنی مؤنث اور ولیہ تھیں۔ آپ کے بطن سے بلا احتیاج مادۂ صلبیہ مذکر یعنی مرد پیدا ہوا۔ جو نبی اللہ تھا۔ یہ حیثیت بھی معنویت پر قائم ہونے والی ایک شکل تھی۔

چونکہ حضرت مائی مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اولادِ آدم تھیں۔ اس واسطے اُن کے جسم کی اولاد بھی اولادِ آدم ہی کہلائے گی۔

چونکہ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اِس واسطے فرمایا۔ اور اُن کی اولاد کے اصلاب و ارحام کے ذریعہ حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوئیں وہ مٹی تھیں۔

کُلُّکُمْ بَنُوْا اٰدَمُ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔

تم سب اولادِ آدم ہو۔ اور آدم علیہ السلام مٹی سے ہیں۔ آپ کو اولادِ مٹی نہیں کہا گیا۔ بلکہ مٹی سے بنایا گیا کی اصطلاح استعمال ہوئی۔

مگر عیسےٰ علیہ السلام بطنِ مادر سے پیدا ہوئے۔ رحمِ مادر میں ہی اللہ تعالےٰ نے اپنے حکم سے آپ کو تیار فرمایا۔

نُدغہ کی صورت میں آپ نے بطنِ مادر میں قرار پکڑا۔ اور مدتِ حمل کے ساتھ پیدا ہوئے۔ یہ پیدائش کا وہی اندازہ تھا۔ جو عام ولادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی مائی صاحبہ کو دردِ زہ ہوا۔ پھر آپ پیدا ہوئے۔ یہ پیدائش

قدرت کی کرشمہ سازی ہے

مگر مجموعی طور پر اولادِ آدم کا سِلسلہ اصلاب وارحام کی معنویت پر ہی متخلق و متشکل ہوتا رہا۔

آگے صفاتِ آدمیت کا سِلسلہ ہے۔ جو انسانی سیرت کہلاتا ہے۔ اور نسلِ انسانی کی سیرت دو حالتوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

یہ تقسیم مُشترک ہے۔ ایک معنویت پر روحانیت کا عروج اور روحانیت کا اللہ کی اطاعت کے ساتھ عروج جو جسمِ نبوت پر اطلاق کرنے کے بعد معجزات بنتا ہے اور اولیاء اللہ پر مرتب ہوکر کرامات بنتا ہے۔

دوسری قسم معنویت پر مادیت کا عروج اور مادیت کے ساتھ نفسانی لذات ورغابات کے ساتھ حرص وہوا کا عروج۔ اِس عروج کا اطلاق مُطلق مادیت پرستی پر مرتب ہوکر محض پیکرِ ہوا وہوس بناکر جاہ وحشمت بن جاتا ہے۔

یہ دونوں مذکورہ اقسام معنویت سے جسم پر مرتب ہوکر سیرت بنتے ہیں۔ ایک سیرت انبیاء واولیاء کی اور ایک سیرت اہلِ دنیا کی، سیرتِ انبیاء واولیاء کے صفات کی جزوِ اعظم روحانی صلاحیت پر احکامِ الٰہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان کا وجود بھی عالمِ مادہ میں بنایا جاتا ہے۔

ان کا جسم اشتراکِ روح ومادہ سے ترکیب دیا جاتا ہے۔ مگر ان کی معنویت اُن کے اجسام کو روحانی صلاحیت جزوِ اعظم کے طور پر تفویض کرتی ہے۔

اِس واسطے یہ لوگ جہاں اللہ تعالےٰ کی بندگی باحسن وجوہ انجام دیتے ہیں۔ وہاں اہلِ دنیا کے حقوق کی بھی نگہداشت کرتے ہیں۔ کہ اِس میں اللہ تعالےٰ ہی کی اطاعت مراد ہوتی ہے۔ اُن کی اصطلاح میں خدمتِ انسانیت کو حقوق العباد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لہٰذا انبیاء صدیقین وشہداء وصالحین کے تمام اعمال لِلہ تعالےٰ ہو کر بندگی بنتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ لوگ اللہ تعالےٰ کا گروہ کہلاتے ہیں۔ یہ بظاہر حکومت کریں

تو بھی لِللہِ تعالےٰ کرتے ہیں۔ اور اگر بظاہر حکومت نہ کریں تو بھی اِن کی برکات کی حکومت کائنات میں جاری رہتی ہے۔ حتیٰ کہ عالمِ عناصر میں کوئی عنصر ایسا نہیں، جس پر ان اہل اللہ کا تصرف نہ ہو۔

اہلِ دنیا کا جسم بھی اشتراکِ روح و مادہ کا مرکب ہوتا ہے۔ مگر ان صفات میں جزوِ اعظم مادہ پرستی ہے۔ اِن سے جو اعمال بھی سرزد ہوتے ہیں۔ اللہ کے لئے نہیں بلکہ خوشنودیٔ نفس اور ریاو نمود کے لئے۔

اس واسطے یہ لوگ عدل وانصاف اور صلہ رحمی سے ہمیشہ بیگانہ ہوتے ہیں۔ اِن سے لوگوں کو مادی استفادے ہوتے ہیں۔ مگر وہ بھی غیر متوازن۔ انجام کار اِن دنیاداروں کی صلاحیتوں کا اتمام مادہ پرستی ہوتا ہے۔ یہ لوگ مادیت پر عروج پاکر مادیت پر ہی اپنا اتمام کرتے ہیں۔

اہل اللہ کی حکومت کے لئے یہ دلائل محکم ہیں۔ اِن کے تصرفات زندگی میں، موت میں اور بعد از موت بھی جاری رہتے ہیں۔

چونکہ مومن زندگی میں بھی اللہ کے نزدیک زندہ ہوتا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی بوجہ ایمان عنداللہ زندہ ہوتا ہے۔

اور غیر مومن زندگی میں بھی عنداللہ مُردہ ہوتا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی مُردہ۔ فلہٰذا اہل اللہ سے اُن کی حیات و موت دونوں میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اٹھائیسواں باب

ایک مردِ خدا سے ملاقات

اباجان سے خرقۂ خلافت ملنے کے چند سال بعد ایک عارف باللہ سے دیول میں ہی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مردِ خدا اکتالیس برس کشمیر کی پہاڑیوں پر ریاضت کرنے کے بعد پشاور کی طرف مراجعت فرما رہے تھے۔ انہوں نے اپنا نام عبدالرحمٰن کابلی بتایا تھا۔

فرمانے لگے۔ اب میری عمر اسی برس کی ہو چکی ہے۔ بیس سال کی عمر میں مجھے بغداد شریف میں خرقۂ خلافت ملا تھا۔

اِس کے بعد میں نے حجِ بیت اللہ شریف کا ارادہ کیا۔ اور دو سال تک مدینہ طیبہ میں دربارِ مصطفےٰ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے سامنے درُود خوانی کی اور تلاوتِ قرآنِ کریم کرتا رہا۔ مجھے خواب میں نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے مشرق کی طرف چلے جانے کا حکم فرمایا۔

چنانچہ میں مدینہ منورہ سے مکّہ شریف آیا۔ عمرہ ادا کیا۔ اور بغداد کی طرف سے ہوتا ہوا کابل پہنچا۔ جو میرا آبائی وطن ہے۔ دو سال میں نے کابل کے ویرانوں میں ریاضت کی۔

پھر ہندوستان کے تمام مزارات پر حاضری دیتا رہا۔ اور وقت کے عظیم روحانی دینی پیشواؤں سے علم و عرفان کا فیض پایا۔

چھ برس متواتر حسبِ استطاعت سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ کی پیروی کی۔ اور

اہل اللہ کی تلاش کرتا رہا۔ جہاں بھی مجھے معلوم ہوا۔ کہ فلاں جگہ کوئی مردِ خدا ہے وہیں پہنچا۔

فرمایا مجھے اسی سیاحت کے زمانہ میں دریائے اٹک پر حضرت خواجہ خضر علیہ السلام سے شرفِ ملاقات نصیب ہوا۔ آپ نے مجھے اپنے سینۂ مبارک سے لگایا۔ اور میرے منہ میں پھونکا اور دعا دی۔ کچھ خاص اوراد و وظائف بھی عطا فرمائے۔

اور فرمایا کہ

کشمیر چلے جاؤ۔ اکتالیس برس کشمیر کے دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں یَاحَبِیْبُ یَالَطِیْفُ کا ورد کرو۔

چنانچہ میں نے اکتالیس برس کشمیر کی پہاڑیوں، جنگلوں اور دریاؤں میں یَاحَبِیْبُ یَالَطِیْفُ کے ورد کے ساتھ ریاضت کی۔ اکتالیس برس کے بعد مجھے کشمیر کے ایک دریا پر بوقتِ سحر حضرت خواجہ خضر علیہ السلام سے دوبارہ ملاقات کا شرف ملا۔

آپ نے مجھے اپنے سینۂ مبارک سے لگایا اور مزید رموز و اسرار بتائے۔ پھر حکم فرمایا کہ دیول شریف جاؤ۔ وہاں ایک نوجوان مصروفِ عبادت ہے۔

اُس کا نام محمد عبدالمجید احمد ہے۔ اور اُس کے والد کا نام محمد عبداللہ ہے۔ جاؤ۔ اور اُس کی راہنمائی کرو۔ تمہارا وہاں جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اسی حکم کے تحت میں تمہارے پاس آیا ہوں۔

حضرت عبدالرحمٰن کابلی رحمتہ اللہ علیہ نے مجھے اپنے سینۂ مبارک سے لگایا۔ اور ایک خرقۂ خلافت اپنی طرف سے پہنایا۔ اور مجھے رموزِ معرفت پر عجیب و غریب درس دیا۔

اور یَاحَبِیْبُ یَالَطِیْفُ کے وظیفہ کی اجازت بخشی اور فرمایا۔ کہ اس وظیفہ میں تمہارا خاص حصہ ہے۔ تمہیں جو کچھ ملے گا۔ اسی سے ملے گا۔

آپ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا۔ کہ مَیں اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے قطبِ

وقت ہوں۔ اور مجھے اللہ تعالیٰ نے زمانے پر تصرف دیا ہے۔

پھر فرمایا میں جا رہا ہوں۔ تجھے خدائے برتر کی حفاظت میں چھوڑ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکرانہ پابندیِ دین کے ساتھ ادا کرنا۔ فرمایا بعض لوگ صرف زبانی شکر ادا کرنے کے اِس طرح عادی بن جاتے ہیں۔ کہ اُن کے ذہن سے یہ جذبہ مفقود ہو جاتا ہے کہ شکرانہ پابندی عمل چاہتا ہے۔

فرمایا۔ زبان سے اللہ کی تعریف بیان کرنا اور بدن سے اللہ تعالیٰ کی مجوزہ عبادات کرنا اور حلال کمائی کر کے اُسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا کامل شکرانہ ہے۔

جو مومن زبان کو اللہ کی یاد میں مصروف کر لے۔ اور اُسے جھوٹ اور غیبت سے بچائے۔ اور بدن کو عبادات پر مائل کرے۔ اور حرام سے بچالے۔ اور حلال کمائی کرے۔ اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر پورے یقین سے کاربند ہو جائے۔

اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی، رحمت اور برکات ملتے ہیں۔ اور ایسے ہی مومن کو اسلام کی زبان میں متقی کہا جاتا ہے۔ اور ایسے ہی متقی ولی اللہ بنائے جاتے ہیں۔

اِس واسطے بیٹا! ۔ اِن تین چیزوں پر اللہ کے فضل وکرم کے ساتھ نظر رکھنا اِن تین چیزوں کو غلطی اور غفلت سے بچانے کی نیت کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ سے مدد چاہنا۔ جب کوئی بندہ نیک کام کی نیت کر لیتا ہے۔ اور اللہ کے حضور شیطان سے پناہ چاہتا ہے۔ تو اُسے نیک کام پر اللہ کی طرف سے توفیق مِل جاتی ہے۔

زبان، بدن اور پاک مال خرچ کے لئے اللہ سے استعانت طلب کرنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی استعانت صبر وصلوٰۃ کے ساتھ ملتی ہے۔ اور صبر وصلوٰۃ کے ساتھ استعانت خاشعین حاصل کرتے ہیں۔

خاشعین وہ ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسول مقبول اور دینِ اسلام کی فرمانبرداری میں یوم آخرت پر ایمانِ کامل رکھتے ہُوں۔ کہ ہم نے انجام کار خدا سے ملنا ہے۔ اور زندگی کا حساب دینا ہے۔ اور ہم اُس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

اِس نصیحت کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی آیت پڑھی۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

یعنی تم اللہ تعالےٰ سے صبر و صلوٰۃ کے ساتھ استعانت مانگو۔ اور ایسی استعانت حاصل کرنا بہت بڑا کام ہے۔ جس کی ادائیگی سوائے خاشعین یعنی متقیوں کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ یعنی وہ صبر و صلوٰۃ کے ساتھ اللہ سے امداد مانگتے ہیں۔ اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا۔ درود شریف جن کلمات کے ساتھ بھی ادا کیا جائے۔ اُس میں صلوٰۃ وسلام دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ اللہ تعالےٰ کا امر ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر صلوٰۃ وسلام کے ساتھ درود بھیجو۔

فرمایا درود تاج مجھے بہت پسند ہے۔ اُس کو تم بھی پڑھا کرو۔ مگر ایک خاص درود شریف کی اجازت دیتا ہُوں۔ جو نسبتاً زیادہ پُر تاثیر ہے۔ مجھے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر وہ درود شریف لکھ کر عطا فرمایا۔ اور اُس کی اجازت بخشی۔ وہ درود شریف درج ذیل ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ عَدَدَ مَا فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ صَلٰوةً دَآئِمَةً بِدَوَامِ مُلْكِ اللّٰهِ۔

اے اللہ درود بھیج ہمارے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ہمارے سردار کی آلِ پاک پر اِس مقدار سے، کہ جتنا تیرا علم ہے۔ درود بھیج اپنی دائمی بادشاہی کے ساتھ اور درود ہو اللہ تعالےٰ کی نہ ختم ہونے والی حکومت

کی مقدار۔

فرمایا۔ ایک دفعہ یہ درود پڑھنے سے اتنے درودوں کا ثواب مِلتا ہے۔ جتنا کہ ایک دلائل الخیرات کے پڑھنے کا ثواب ہو۔ اِس کے بعد مجھے ایک خاص تحفہ عطا فرمایا۔ اور معرفت کے خاص رموز بتائے۔

پھر فرمایا۔ اولادِ غوثِ پاک رضی اللہ تعالٰے عنہ میں سے کوئی صاحبِ تقوٰی مرشد مِلے تو اُس سے سندِ خلافت ضرور لینا۔ اور خرقۂ خلافت بھی حاصل کرنا۔ اِسی سے تمہاری خلافت مکمل ہو جائے گی۔ یہ فرمایا، اور اجازت لے کر چل پڑے چلتے ہُوئے فرمایا۔

بیٹا خدا حافظ۔ انشا اللہ میدانِ حشر میں ملاقات ہو گی۔ خدا ہمارا انجام بالخیر کرے جاتے ہُوئے میرے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ اور میری کامیابی کی دعا مانگی۔ اور لوگوں کو بیعت کرنے کی اجازت دی۔ اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ مسجد سے باہر چلے گئے۔ مَیں بھی دوڑتا ہُوا صحنِ مسجد میں آگیا۔ تقریباً مسجد سے سو قدم کے فاصلہ تک وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ چٹیل زمین کی ہموار سطح سے وہ کِس طرح گم ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شاید فضا میں گم ہو گئے ہوں۔

آپ کی اِس کرامت نے میرے وہ ظنوں دور کر دیئے۔ جو ہمیشہ میرے ذہن میں چھائے رہتے تھے۔ کہ مردانِ خدا فضاؤں پر چلتے ہیں۔ مردانِ خدا کے لئے زمین سکڑ جاتی ہے۔ اور اِس طرح اُن کے فاصلے مختصر ہو جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

انتیسواں باب

والد بزرگوار کا وصال

والد بزرگوار علیہ الرحمۃ کے ان پند و نصائحِ عارفانہ کے بعد میں نے طریقتِ قادریہ کے مطابق ریاضت شروع کر دی۔ اگرچہ ابتداءً تسلسل کے ساتھ ریاضت کو جاری نہ رکھ سکا۔ تاہم گاہے گاہے اس ترتیب پر کاربند رہنے کی کوشش کرتا رہا۔

بعض دفعہ قلق و اضطراب کی فراوانی مجھے بے چین کر دیتی۔ یہ قلق و اضطراب ریاضت میں کسی جھلک کے ہویدا ہو کر بند ہو جانے پر واقع ہوجاتا ہے۔

مَیں نے اس قلق و اضطراب کا ذکر والدِ بزرگوار سے کیا۔

آپ نے فرمایا۔ راہِ حق میں سالک پر واقع ہونے والا قلق و اضطراب توفیقاتِ سلوک سے ہے۔

یہ اللہ کا وہ فضل وکرم ہے۔ جو اجرائے بندگی پر وارد ہوتا ہے۔ جس طرح جاری پانی کا اٹکنا اچھلنا پھسلنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح منتقیانہ ریاضت کے اجرا میں روحِ سالک اپنے جسم باطن کے نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے اٹکتی اچھلتی پھسلتی ہوئی قلق و اضطراب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جس کا منشا سراغ حقیقت ہوتا ہے۔

کسی امید کے اُبھرنے پر فوراً نا امیدی قلق و اضطراب کا ذریعہ بن جاتی ہے سالکِ راہ کو جب ایسا قلق و اضطراب میسّر آجائے۔ تو ایسے عالم میں اُس کو اپنی طلبِ بندگی کو مزید تیز کر لینا چاہیئے۔ اور وہ اصولِ بندگی کے مطابق جادۂ عشق پر اپنے قدم تیز کر لے۔

قلق و اضطراب حصولِ مقصد کی خاطر بُطون میں انگڑائی لے کر بحرِ باطن کو تموج کے ساتھ مدّ و جزر دیتا ہے۔ اور بار بار مدّ و جزر سے باطنی طلاطم میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے سفینۂ بندگی ہچکولے لے لے کر سالکِ راہ کو مشقّتِ منزل کا عادی بنا دیتا ہے۔

جیسے بحری سفر میں ہچکولوں کا آنا ضروری ہے۔ ایسے ہی بحرِ روحانیّت کے مسافروں کو سختئ منزل جھیلنے کا عادی بنانے کے لئے یہ قلق و اضطراب ابتدائے عمل کے لئے بصورتِ توفیق عطا کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں والدِ بزرگوار نے اِس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۲ء بوقتِ صبح نمازِ فجر کے بعد آپ مجلس میں پند و نصائح فرما رہے تھے۔ کہ پیغامِ اجل آپہنچا۔ چند لمحوں میں آپ نے جامِ وصال نوش فرما لیا۔

مَیں اپنے گھر موجود نہ تھا۔ قریب ہی دیول کی بستی میں اپنے ایک دوست کے گھر تھا۔ والد بزرگوار کے وصالِ مبارک کی خبر سُن کر بے حد ملول ہُوا۔ گویا ایک کوہِ الم مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اور غم نے نڈھال کر دیا۔

سخت اضمحال و پریشانی کے عالم میں مَیں اپنے مرشدِ اول والد بزرگوار کی جانب بے تابئ غم کے عالم میں دوڑتا ہُوا آیا۔ آپ کو موت کے جہان میں ساکت و صامت پایا۔ بس اللہ تعالےٰ نے جتنا غم دینا تھا۔ وہ دیا۔ داغِ مفارقت نے بے کل کر دیا۔

مگر غم دینے والا ساتھ ساتھ صبر و استقامت بھی عطا فرماتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو دنیا میں ایسی محبوب ترین متاعِ زیست کے لُٹ جانے پر خدا جانے کتنی جانیں ہلاک ہو جاتیں۔

مگر قانونِ قدرت ایسے اغمام کے ورود پر اپنا دستِ تائید اہلِ غم کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ جِس سے لوگ ایسے نازک ترین حالات کا سامنا کر لینے کی ہمت پا لیتے ہیں۔

بڑا غم ہوا۔ اور سخت غم کی حالت میں دل نے آواز دی۔ کہ حبیبِ کبریا علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے بظاہر وصال کے وقت اہلِ بیتِ اطہار اور صحابہ کبار رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین اور بالخصوص سیدنا عمرِ فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو سخت ترین غم واندوہ کی حالت میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا بروقت کتاب اللہ کے حوالہ سے نصیحت فرمانا۔ اور اِس حقیقی نصیحت سے احباب و اعزا کے تسلّی و تشفی پالینے والی حالت پر غور کر اور صبر کر۔

سیّد الکونین علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے وصال مبارک کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ اور دِل کو تشفی ہُوئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔

اُسی دِن آپ کی تدفین ہُوئی۔ جامع مسجد کے چالیس قدم کے فاصلہ پر آپ کا مزار مبارک بنایا گیا۔

آپ نے اپنے وصال مبارک سے دو ہفتے قبل ایک بھری مجلس میں فرمایا۔ کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اللہ تعالےٰ مجھے جلد ہی اپنی طرف بلانے والے ہیں۔ فرمایا

مجھے اپنے جسم سے بڑی حیا آتی ہے۔ خدا مجھے ایمان کے ساتھ آسان موت دے۔ اور مجھ بندۂ عاجز کی میت کا پردہ رکھے اور میری میت کو اور میری روح کو خفت و ندامت سے بچائے۔ خدا قبر کے حساب میں آسانی کرے اور حضور سرورِ کونین صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی شفاعت اور نظرِ کرم نصیب ہو۔

فرمایا میں نے گذشتہ شب ایک خواب دیکھا۔ کہ ایک پہاڑ اچانک مجھ پر گر گیا۔ پھر یہ واقعہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور کسی مجلسِ خاص میں مجھے ایک خوبصورت برتن میں کچھ بابرکت لوگوں نے کھانا کھلایا۔ میَں نے اس کو تناول کیا۔ مگر وہ کھانا اتنا لذیذ تھا۔ کہ میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا۔ کہ اِس دنیا میں اتنا لذیذ کھانا میسّر آسکے۔

فرمایا۔ اِس خواب کی تعبیر غالباً یہی ہے۔ کہ اچانک مجھے جام موت نوش کرنا ہوگا۔ اور میں جلد ہی تم سے رخصت ہو جاؤں گا۔

فرمایا۔ اے میرے ہم نشینو میں تم میں اپنا وارث چھوڑے جا رہا ہوں۔ انشاءاللہ یہ تمہاری حسبِ منشا خدماتِ دینی انجام دے گا۔

پھر مجھے بلایا۔ اور گلے لگا کر فرمایا۔ کہ

بیٹا! میں تم پر راضی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تم پر راضی ہو۔ اس کے رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام تم پر راضی ہوں۔ بیٹا دین کی خدمت کرنا۔ تقویٰ پر اپنے عمل کو جاری رکھنا۔ عاجزی کو وراثت جاننا۔ سوائے عاجزی کے انسانی بدن پر کوئی لباس پورا نہیں اتر سکتا۔ توبہ کو وردِ زباں رکھنا۔ اپنے ہم وطنوں سے وفا شعاری کے ساتھ مروّت کا ثبوت دینا۔ اپنی ماں کی خدمت کرنا۔ تمہاری ماں فاضلۂ دین اور صالحۂ ولیہ ہے، اس سے فیض پانا۔

اِس کے بعد میری والدہ بزرگوارہ کو اپنے پاس بلایا۔ فرمایا۔ سب کا خدا حافظ ہے۔ شاید میں عنقریب تم سے رخصت ہونے والا ہوں۔ اپنی خاص امانتیں اس بچے کو عطا کر دینا۔ بچوں کو اسلام پر قائم رہنے کی تلقین جاری رکھنا۔ اگر نیک ہوئے تو عاقبت میں کام آئیں گے۔

پھر فرمایا۔ میرے ہم نشینو! میں تم لوگوں میں ایک مخفی درویش باللہ تھا۔ میں عارف باللہ ہوں۔ میں نے تمہارے لئے مقبول دعائیں کی ہیں۔ میں نے اسلام کا پیغام تم تک پہنچایا۔ میں سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ چشتیہ، سلسلۂ نقشبندیہ کا اجازت یافتہ سالک ہوں۔ آپ نے بھری مجلس میں پہلی مرتبہ یہ اظہار فرمایا۔ کہ میں بفضل اللہ تعالیٰ سالک راہِ حقیقت ہوں۔

فرمایا۔ مشکل کشا صرف اللہ کی ذات ہے۔ مگر وہ اپنے بندوں کے توسل کو اپنے اور مانگنے والوں کے درمیان بہتر ذریعہ قرار دیتا ہے۔ سوال کرنے والے سائلیں اور اپنے درمیان انبیاء و صدیقین شہداء و صالحین کے وسائل

سے مانگنے پر زیادہ راضی ہوتا ہے۔

مَیں بالوسائل دعا مانگنے والا دُرویش ہُوں۔ میرے اب وجد دُرویش باللہ ہو گزرے ہیں۔

فرمایا۔ انسان کا زندہ وجود بھی مٹی ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی وہ مٹی ہے کارآمد چیز ایمانِ باللہ ہے۔ جو اسلام روح پر حاصل ہوتا ہے۔ وہی روح کو زندگی میں اللہ کی بندگی کا احساس دلا کر بندۂ خدا ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ روح مرنے کے بعد مر نہیں جاتی۔ بلکہ زندہ رہتی ہے۔

روح کے لئے زندہ و مردہ وجود کا کوئی امتیاز نہیں۔ وہ حکم خدا سے داخلِ وجود رہ کر کچھ مدّت زندہ رکھتی ہے۔ اور حکمِ خدا کے ساتھ بدنِ انسانی سے جُدا ہو جاتی ہے۔

مگر روح پر مردہ ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ وہ دنیوی زندگی میں زندہ رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور بدنِ خاکی سے نکل جانے پر موتِ جسم کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اِس واسطے زندگی و موت میں ایمانی تصرف روحِ ایمانیہ پر ہوتا ہے۔ قبل از وصال ہو یا بعد از وصال۔ روح نے ازل کے دن اقرار کیا۔ روح ہی نے اللہ کے حکم سے جسم کو حرکتِ زیست دی۔ اور روح کے نِکل جانے پر ہی جسم کی حرکت بند ہوتی ہے۔

روح کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ اور بدن کا تعلق عالمِ خلق سے ہے۔ جو ثقیل ہے۔ اور اپنے ثقیل ہونے کی بنا پر وہ نیچے زمینِ خاک میں مِل جاتا ہے۔ اور اہل اللہ کی روح لطیف ہونے کی بنا پر آسمانِ بالا پر چلی جاتی ہے۔ اور غیر مقبول لوگوں کی روحیں سجین میں قید کر دی جاتی ہیں۔

بوجہ قید و بند سجین کی روحیں غیر متصرف ہوتی ہیں۔ مگر عِلیّین کی روحیں بوجہ ایمان کے آزاد ہوتی ہیں۔ اور صاحبِ کرامت بھی۔

وہ جب دنیوی زندگی میں بقیدِ جسم ہوتی ہیں۔ تو بھی کشف و کرامات اولیاء اللہ کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ اور جب وہ علیین میں چلی جائیں۔ تو بھی ان کی آنکھیں ایماندار ہونے کی بنا پر بالکشف و کرامات متصرف ہوتی ہیں۔

فرمایا۔ واللہ۔ باللہ۔ تاللہ میں گزرے ہوئے اولیائِ عظام کے تصرفات کا بارہا مشاہدہ کر چکا ہوں۔

اِس کے بعد فرمایا۔ کہ اولیاء اللہ کے قبور پر جانا موجب خیر ہے۔

شرعی طریقِ عمل کے مطابق قبور پر جانا اُن کے لئے دعائے مغفرت کرنا۔ اُن کی قبور پر بغرض حصولِ ثواب جانا موجب برکات ہے۔ اِس سے ایمان کو تقویت ملتی ہے۔ اور استفادہ اللہ کی رضا سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے ولیوں کی حیات میں اور بعد از وصال بھی اُن کی یاد و تقرب سے راضی ہوتے ہیں۔ پھر یہی رضا قبولیتِ دعا بن جاتی ہے۔ مگر وسیلہ سے مراد نیک لوگوں کی نیکیاں ہوتی ہیں۔ باعتبار تقوٰی اُن کا وجود معتبر ہوتا ہے۔

اولیاء اللہ جن نیکیوں کے موصوف ہوتے ہیں۔ وہی نیکیاں اُن کے موصوف ہونے کا اعتبار ہوتی ہیں۔

لہٰذا اولیاء اللہ کی قبور پر جا کر اُن کے نیک اعمال کے اعتبار کی روشنی میں اُن کے متعلق مراقبہ کرنا چاہیئے۔ اور مراقبہ میں صاحبِ مراقبہ اولیاء اللہ کے صفاتِ نیک پر غور کرے۔ تاکہ اُن نیکیوں کا موصوف یعنی ولی اللہ نیک اعمال کی معیت میں نیک متصوّر ہو سکے۔

ولی اللہ جب صفاتِ اسلامیہ کے ساتھ صاحبِ مراقبہ کے قلب و نظر پر اترے گا۔ تو اُس کی متقیانہ تعمیلی صفات کی طرف طبیعت رغبت کرے گی۔

یہ ہیئتِ مجموعیہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا اچھا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ جس سے دعا کو بالوسیلہ مستجاب ہونے کا موقع مِل سکتا ہے۔

فرمایا۔ اولیاء اللہ کے مزارات پر بغرضِ ثواب جانا چاہیئے۔ جو بڑا

پُر تاثیر طریقہ ہے

بشرطیکہ قبور پر رکوع سجود نہ کیا جائے۔ اور خلافِ امورِ دین کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہونے پائے جس سے اہلِ قبور کی روحیں پریشان ہوں۔

بہتر طریقہ وہی ہے جو شریعت نے آدابِ قبور کے لئے بتایا ہے۔ اور صوفیائے اسلام نے شریعت کے مطابق جو آداب مقرر کئے ہیں۔ یعنی باوضو ہو کر زیاراتِ اولیا اُللہ پر بغرضِ دعا مغفرت جائے۔ اور اسلام علیکم یا اہل القبور کہہ کر فاتحہ خوانی کرے۔ اور سورۃٔ اخلاص متعدد بار پڑھ کر ایصالِ ثواب کرے۔ پھر اہل اللہ کے مزار کے سامنے دو زانوں ہو کر نہایت ادب کے ساتھ اُن کا تصوّر اس طرح کرے۔

کہ یہ لوگ اللہ کی اطاعت و محبت میں سرشار رہے ہیں۔ اُنہوں نے رات دن اپنی کرد ٹوں پر اپنے معبودِ برحق کی عبادات سرانجام دیں۔ یہ لوگ عارفانِ باللہ تھے۔ اُنہوں نے راہِ حق پر وصولِ حق کے لئے موت پائی ہے۔ اِن کے وجود قبور میں علیٰ وجۂ تقوٰی مسعود و محبوب اور محفوظ و مامون ھیں۔ اور یہ تصوّر کرے۔ کہ

ولی اللہ کی موت سے ولایت نہیں مر سکتی۔ بلکہ ولایتِ دینوی میں اور مابعدِ حیات ہر دونوں حالات میں صورتاً اور معناً ولایت ہی ہوتی ہے۔ وہ میدانِ بندگی میں ریاضت کرتی ہے۔ اور معنویت میں اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرتی ہے۔ اور بعد از وصال بھی اُسی جسمِ خاکی کے ساتھ وہ سپردِ خاک ہوئی۔

جس پر متقی ولی اللہ ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ اور حسابِ قبر بھی اس کے ولی اللہ ہونے کے مطابق ہی ہوا ہوگا۔ اور منازلِ برزخ بھی برسبیلِ ولایت ہی طے کئے ہوُں گے۔

وہ زندگی میں بھی ولی اللہ تھے۔ اور وصال کے بعد بھی ولی اللہ ہیں۔ درحقیقت ولایت کی صحیح جزائے خیر مرنے کے بعد ہی ملتی ہے۔

اور یہ کہ ولیوں کی سب ریاضتیں موت کے لئے اور انجام کار جزائے خیر پانے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا اولیا اُللہ زندگی اور موت اور مابعد الموت کے بہرحال مقبولانِ بارگاہ الٰہی ہوتے ہیں۔

علمائے صالحین اور اصفیائے صالحین دونوں کے مقابر پر متذکرہ تصور کے ساتھ مراقبہ کرنے میں ایمان کو تقویت و طمانیت ملتی ہے۔ اور عبادات پر تحریص میسّر آتی ہے۔

فرمایا۔ مابعد کے عجمیّت پسند لوگوں نے آداب قبور میں خلافِ اسلام افراط و تفریط کے ساتھ کافی ردبدل کر دیا۔ جس کی وجہ سے عوام نے قبور کو وُہ مقام دے دیا۔ جس کے دیکھنے سے یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ جیسے کوئی بت پرست قبر کی پوجا کر رہے ہُوں۔

یہ طریقہ شعائرِ اسلام کے خلاف ہے۔ اور ایک گروہ نے اجتناب زیارات وقبور پر اتنا زور دیا۔ گویا کہ مرحومین سے اُنہوں نے قطع تعلق کر لیا ہو۔ ان دونوں حالات کی اسلام میں کوئی سند نہیں۔ نہ ہی ترکِ زیارت قبور کے لئے کوئی حکم ہے۔ اور نہ ہی قبور پر رکوع وسجود کا کوئی حکم ملتا ہے۔

فرمایا مجددِ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے اکثر فیصلے بر بنائے مکاشفات والہاماتِ عارفانہ کئے ہیں۔

آپ نے جب اپنے زمانہ کے بعض بے اُصول لوگوں کا شرعی روشنی میں جائزہ لیا۔ تو اُن کو ہنود کے طرزِ عبادات پر صنم پرست پایا۔ جیسے ہنود اور بدھ مت وغیرہ کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ اصنام کے ذریعہ خدا ملتا ہے۔

چنانچہ وہ مرنے والی شخصیات کے بُت بنا لیتے ہیں۔ اور اُن کو سجدہ کرتے۔ اور اُن سے حاجتیں مانگتے ہیں۔ اگر یہی وطیرہ مسلمان عوام نے بھی اختیار کر لیا۔ تو اہلِ ہنود اور مسلمانوں کی عبادات میں مغائرت کے لئے دقت درپیش آئے گی۔

چنانچہ ان حالات کے ردِ عمل کو لے آپ نے وحدت وجود کے عقیدہ کی اعلانیہ تردید کی

چونکہ اس وقت یہی مسئلہ مسلمانوں کو قبر پرستی کی طرف مائل کر رہا تھا۔ اور اکثر اہلِ عقیدہ یہی گمان کرنے لگ گئے تھے۔ کہ خدا حلول کرتا ہے۔

حالانکہ اسلام عقیدۂ حلول کی تردید کرتا ہے۔ اسلام تو خدا کو عرض وجسم ہونے سے منزہ قرار دے کر اُسے وراء الورا ثابت کرتا ہے۔

اور یہ کہ اسلام خدا کو ہر جگہ موجود کر کے اسے ہر قسم کی تلویثات سے منزہ قرار دیتا ہے۔ یہ کہ اللہ تعالےٰ مومن کے دِل کو اپنی قرار گاہ بنانے کے بعد بھی غیر حادث رہتا ہے۔ اور مومن اللہ کو اپنے قلب ونظر میں پا کر پھر بھی اپنے آپ کو حادث جانتا ہے یعنی اللہ تعالےٰ ہر چیز میں رہ کر بھی منزہ عن التلویث ہے۔

اِس طرح اسلام نے خدا کا تقرب حاصل کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ نہ یہ کہ اللہ تعالےٰ حلول کرتا ہے۔ اُس وقت کے مغلوب القیطرہ لوگ بزبانِ خود تو یہ کہتے تھے کہ ہم ان قبور کو سجدہ نہیں کرتے۔ بلکہ ہم تو ان قبور میں اللہ ہی کو پاتے ہیں۔

یعنی قبور مسجود نہیں۔ بلکہ مسجودِ الیہ کا مقام رکھتی ہیں۔ اور اسلام میں مسجود الیہ کا مرتبہ ومقام اللہ تعالےٰ نے کعبۃ اللہ کو دے رکھا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کعبۃ اللہ مسجودِ حقیقی نہیں۔ بلکہ مسجودِ الیہ کا درجہ رکھتا ہے۔

اگر یہ تخصیص عام ہو جائے۔ تو اس میں کعبۃ اللہ کی اہانت ہوتی ہے۔ اور بظاہر یہ نمونہ ہنود اور دوسرے قسم کے اصنام پرست اور آتش پرست وغیرہ لوگوں کا ہے۔ اور ایسے لوگ بھی بظاہر تو یہی کہتے ہیں۔ کہ ہم تو بتوں کے ذریعہ اللہ تعالےٰ کو پاتے ہیں۔ یعنی یہ بت مسجودِ حقیقی نہیں۔ بلکہ مسجودِ الیہ ہیں۔

اِس طرح اسلامی عقائد اور غیر اسلامی عقائد کا اختلاطِ عمل حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو سخت ناگوار گزرا۔ آپ نے سرے سے ہی وحدت الوجود کا انکار کر دیا۔ اور مسلمانوں کے عقائد کو بر سبیلِ اسلام اعتدال پر لانے کے لئے آپ نے عقیدۂ وحدت الوجود کے بجائے عقیدۂ وحدتِ شہود پر اپنی تسلیم و رضا کا بادلیل دعویٰ کیا۔

تاکہ مسلمانوں کے اذہان خارجی تصورات سے ہٹ کر اسلام کے داخلی تصورات پر آجائیں۔ جس سے خدا کے تقرب کا عقیدہ بھی محفوظ و مامون رہ سکے۔ اور مسلمان اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے طرزِ عبادات کو اپنانے میں کامیاب ہوں۔ اور اسلامی و غیر اسلامی عبادات میں مغائرت کا بھی ثبوت ہو۔

چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اِس موحدانہ تحریک نے مسلمانانِ عجم کو عجمی تصوّرات غیر سے نجات دلائی۔

آج تک اسی تبلیغ کا اثر کار فرما ہے۔ کہ مسلمان قبور کی پرستش سے بخوفِ شرک اجتناب کرتے ہیں۔ ورنہ یہ سلسلہ عام ہو جاتا۔ اور مسلمان علی الاعلان قبور پرست ہو جاتے۔

اس کے بعد بھی زیاراتِ قبور کا سِلسلہ بند نہیں ہوا۔ بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ زیاراتِ قبور کا ولولہ پیدا ہُوا۔

مگر با ادب اندازِ احترام کے ساتھ زیارتِ قبور ہوتی رہی۔ فرمایا میں اولیا اللہ کی قبور پر باوضو جاتا ہوں۔ اور فاتحہ خوانی کرتا ہوں۔ اور کلامِ الٰہی پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتا ہوں۔ اور اُن کے لئے صدقہ و خیرات کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور میرا ایمان ہوتا ہے کہ اس طرح اولیائے مرحومین کو زیادہ راحت ملتی ہے۔ اور اُن کی روحیں زیادہ خوش ہوتی ہیں۔ اور اُن کی خوشی ہی وسیلۂ قبولیتِ دعا ہو جاتی ہے۔

برخلاف اِس کے اولیا اللہ کی روحیں ناراض ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کی ناراضگی بجائے قبولیتِ دعا کے اُلٹا ناراضگئی رب کا موجب بن جاتی ہے۔ اور دعائیں نامقبول ہو کر واپس لوٹا دی جاتی ہیں۔

فرمایا۔ میرے مرشدین نے مجھے یہ بشارت دے رکھی تھی۔ کہ اگر تمہاری قبر پر کوئی مسلمان سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص تین تین بار پڑھ کر دعا کرے گا۔ تو اللہ تعالےٰ اُس کو بامراد کرے گا۔ اور اگر تمہاری قبر پر کوئی بغرضِ ایصالِ ثواب کسی قسم کی خیرات کرے گا۔ تو بھی بامراد ہوگا۔ اور ایسے باادب زائرین اپنی جملہ نیک مُرادوں میں کامیابی پائیں گے۔

مگر مَیں نے بوجہ خوفِ بدعت اِس بشارت کو ہمیشہ صیغۂ راز میں ہی رکھا۔ صرف تمہیں اِس بشارت سے آگاہ کرتا ہُوں۔ کہ جب میری قبر پر آؤ۔ تو حسبِ توفیق کلامِ الٰہی پڑھ کر مجھے ایصالِ ثواب کرو۔ اور نقد و جنس کی صورت میں خیرات کرو۔ اور یہ خیرات اہلِ حق تک پہنچاؤ۔ جِس سے میری روح خوش ہوگی۔ اور میرے مُرشدین کی بشارت کے مطابق عمل بھی جاری رہ سکے گا۔

مگر اس بات کو عام نہ کرنا۔ ورنہ رواجِ عام میں خلافِ شرع زائرین کے حرکات سے میری روح کو سخت اذیت ناک صدمہ پہنچے گا۔

چنانچہ حضرت والد بزرگوار کی وفات مبارک کے بعد میں جب بھی مزار مبارک پر حاضری دیتا ہُوں۔

تو حسبِ استطاعت کلامِ پاک کا کچھ ختم کر لیتا ہُوں۔ اور مزار مبارک پر حاضری دے کر ایصالِ ثواب کرتا ہُوں۔ اور کچھ نقد و جنس کی صورت میں خیرات بھی کر دیتا ہوں۔

میرا دل ایسا کرنے سے مطمئن رہتا ہے۔ کہ میرے والدِ بزرگوار کی رُوح مجھ پر خوش ہو رہی ہوگی۔ اِس واسطے کہ میں حسبِ فرمائش بجاآوری

آداب کر رہا ہوں۔

فرمایا میری اولادوں نسلوں میں سے یا عقیدت مندوں میں سے یا کوئی صاحبِ ایمان جب بھی میری قبر پر حاضر ہوں۔ تو طریقِ مسنون سے تغافل نہ برتیں۔ ورنہ میری روح سخت پریشان ہوگی۔

فرمایا۔ میرے اہلِ عقیدت یا تمہارے اہلِ عقیدت دین کے خلاف کسی مخترع عقیدہ کے ساتھ مقابر اولیا اللہ پر نہ جائیں۔ اس طریق سے اولیا اللہ ناراض ہوتے ہیں۔ اور اُن کی ناراضگی گواہ بن جاتی ہے۔

فرمایا۔ زیارتِ قبور مسنون ہے۔ مگر افراط و تفریط کے لئے نہیں۔ کہ لوگ نماز روزہ، حج و زکوٰۃ سے بھی بے خبر ہو کر صرف قبور ہی کو ذریعۂ نجات قرار دے دیں۔

اولیا اللہ کے قبور پر با ادب حاضری دینے سے اللہ تعالےٰ مرادیں پوری کرتا ہے۔ سب مسلمان عوام و خواص قبور پر جائیں، حاضری دیں، سلام دیں فاتحہ پڑھیں، صدقات و خیرات کریں۔

مگر آدابِ اسلام کو نہ بھولیں۔ ورنہ وہاں جانے سے نہ جانا بہتر ہے۔ خلافِ آدابِ شریعت مقابر پر اندھا دھند والہانہ کیف مستی کی طرف لے جانے کا سبب بن سکتی ہے۔ مسلمانوں پر حق لازم آتا ہے کہ وہ نہ صرف قبور پر بلکہ ہر شعبۂ زندگانی میں اپنے حال و قال کو دینی ضوابط کا پابند رکھیں۔ اس لازمہ کی پابندی مسلمان قوم پر عائد ہوتی ہے۔ نہ کہ غیر مسلمین پر۔

جملہ مکاتیبِ فکر علمائے اسلام اور مشائخ عظام پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی آدابِ قبور اس صالحانہ انداز سے بیان کریں۔ کہ عوام اِن آدابِ شرعیہ کا مفہوم کر لینے میں آسانی پائیں۔ اور آدابِ دین کی روشنی میں قبور سے روحانی استفادہ کر سکیں۔ اور یہ ذہن نشین کر لیں۔ کہ عوام و خواص کی زیارات صرف عبرت و ثواب کا ذریعہ ہیں۔

فرمایا اسلام میں ہر منت اللہ تعالےٰ کے نام پر مانی جاتی ہے۔ چاہے وہ عبادات کی صورت میں ہو۔ چاہے صدقات وخیرات کی صورت میں ہو۔ اگر اولیا اللہ کے نام منت مانی جائے تو بھی نیت یہ ہونی چاہیئے۔ کہ اللہ کے نام پر ہی کسی ولی اللہ کے لئے نقد یا جنس کی منت مانے۔ یہ کہ صدقہ وخیرات کے ذریعہ ولی اللہ کا وسیلہ پکڑے۔ اور اللہ تعالےٰ کے حضور قبولیتِ دعا کی درخواست کرے۔ یہی طریقہ منت افضل ہے۔

چونکہ اس میں اللہ تعالےٰ کی تائید کو شامل کیا جاتا ہے۔ فرمایا۔ قرآن وحدیث کے ذریعہ جتنے صدقوں کا ثبوت ملا ہے۔ وہ سب لِللہِ تعالےٰ ہیں۔ اور سب منتیں عہد باللہ سے متعلق ہو کر نُذُ وْ رُکُمْ بنتی ہیں۔ یعنی تم اپنی اُن منتوں کو پورا کرو۔ جو تم نے اللہ تعالےٰ سے استمداد حاصل کرنے کے لئے مان رکھی ہیں۔

اگر جملہ منتوں کا تعلق اللہ تعالےٰ سے توڑ لیا جائے۔ تو اسلام میں اُن پر منت کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ فرمایا۔ مجھے سمجھ نہیں آسکتی۔ کہ بعض لوگ منتیں ماننے کے وقت اللہ تعالےٰ کی ذات کو کیونکر فراموش کر دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ سرے سے ہی منتوں کا انکار کرتے ہیں۔

فرمایا۔ اعتدال کا یہی راستہ ہے۔ احتیاط کرو۔ اور نہ بُت پرست بنو چنانچہ میں نے اِن نصائح کے تابع اللہ تعالےٰ کے حضور یہی دعا کی ہے۔ کہ وہ مجھے عاجزانہ بندگی پر ثباتِ قدم نصیب کرے۔ اور میں اپنے والد بزرگوار کے اِن اسلام پسندانہ اقوال کی روشنی میں راہِ فقیر پر تا دمِ واپسیں بطریقِ اسلام سفر جاری رکھ سکوں۔ اللہ تعالےٰ مجھے اور تمام مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تیسواں باب

اس کے بعد میں نے حسب الارشاد اور حسب تفویضات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں راہِ سلوک پر تدریجاً ریاضتِ دینیہ کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ والد بزرگوار کے وصال مبارک نے اگرچہ مجھے بظاہر بے سہارا کر دیا تھا۔ مگر بباطن میرے دِل میں آپ کی تعلیمات نے اتنا توکل پیدا کر دیا تھا۔ کہ میں بہر حال اللہ تعالےٰ کی ذات پر ہی کامل بھروسہ کر سکوں۔ اور ہر آنے والی تکلیف کو مرضیاتِ الٰہی پر محمول کر سکوں۔

یہ کہ اللہ تعالےٰ کا کوئی فیصلہ خالی از حکمت نہیں ہو سکتا۔ یقیناً والد بزرگوار کا وصال اللہ کی مرضی کے مطابق ہوا۔

دورانِ ریاضت ہر لمحہ والد بزرگوار کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہا ہُوں۔ اور اِس دعا کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ خداوند تعالےٰ سب مسلمانوں کو اپنے والدین کا وفادار اور فرمانبردار کرے۔ اور سب کو نیک ماں باپ کی عاطفت نصیب کرے۔ آمین۔

آپ کے وصال مبارک کے بعد ایک عظیم فریضہ جو میرے ذمہ تھا۔ وہ میری والدہ ماجدہ کا وجودِ مسعود تھا۔ والدہ بزرگوارہ کے سایۂ عاطفت میں مجھے راہِ سلوک پر ریاضت کا سلسلہ جاری رکھنے میں زبردست تائید حاصل ہوئی۔

آپ بوجہ ضعیف العمر ہونے کے بے حد نحیف تھیں بمشکل تمام مہمانوں سے کلام فرماتیں اور اُن سے حسبِ استطاعت مُروت فرماتیں۔

آپ نے مرض الموت تک لوگوں کی دینی خدمات انجام دیں۔ اور اپنے پند و نصائح

کو جاری رکھا۔ مجھے ادباً بار بار منازلِ سلوک پر نئی ریاضت کے لئے والدہ ماجدہ سے اجازت لینی پڑتی۔ اور آپ ایسی اجازت پر اس قدر زیادہ مسرور ہوتیں گویا آپ کو کوئی نعمت مِل گئی ہو۔

والد بزرگوار کے وصال کے چالیس یوم بعد میں نے والدہ ماجدہ کی خدمتِ بابرکت میں باادب واحترام حاضری دی۔ اور اللہ تعالےٰ کی راہ میں مفوضہ اجازت کے مطابق ریاضت کرنے کی اجازت لینے سے قبل یوں عرض کی۔

اماں جان میری یہ قلبی تمنّا ہے۔ کہ میں آپ کی قدمبوسی کا دائمی شرف پاسکوں۔

آپ مجھے بار بار جنگلوں، بیابانوں میں الگ تھلگ رہ کر ریاضت کرنے کا حکم فرماتی ہیں۔ میں نافرمانی بھی نہیں کرسکتا۔

مگر اماں جان میں نہایت ادب واحترام کے ساتھ التماس کرتا ہوں۔ کہ مجھے آپ صرف اپنی خدمت کے لئے مامور فرمالیں۔ میں بس پنج گانہ نماز اور تلاوتِ قرآنِ کریم اور دوسرے چند وظیفوں کے ساتھ آپ کے تقرب میں آپ کی خدمت چاہتا ہوں۔ آپ کا یہ بڑا احسان ہوگا۔ کہ مجھے اپنے آپ سے کہیں دُور ریاضت کے لئے نہ بھیج دیں۔

میری اِس التماس کے بعد آپ نے تازہ وضو کیا۔ اور دو رکعت نماز نفل ادا کئے۔ اور درود شریف کا وظیفہ فرمایا۔ اور نہایت استقامت ایمانیہ کیساتھ مجھے مخاطب فرمایا۔

فرمایا۔ بیٹا! میں اپنے ضعفِ جسمانی یا ضعفِ مالی یا ذرائع کی تنگی سے قطعاً گھبرانے والی نہیں ہوں۔ یہ اللہ تعالےٰ کا مجھ پر عین فضل وکرم ہے۔ کہ میں ہر حال شاکرِ باللہ ہُوں۔ اِس سے پہلے جو کچھ مہربانیاں ہوئیں۔ وہ سب اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم کا نتیجہ تھیں۔ اب بھی جو کچھ حالات ہیں۔ اللہ ہی کے فضل وعنایات کا نتیجہ ہیں۔ اور آئندہ بھی جو کچھ ہوگا۔ انشا اللہ بہتر ہی ہوگا۔

مجھے نہ تو اپنی ذات پر بھروسہ ہے۔ اور نہ ہی بچّوں پر اور نہ کسی دُوسرے سہارے پر وجود بچے اور دوسرے سہارے سب اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ یہ بھی کسی کی ذاتی کمائی نہیں ہوتے۔

لہٰذا تم میری کیا مدد کرو گے۔ جب تم بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں میرے بطن میں تھے۔ وہاں میری اور تمہاری نگاہبانی کس نے کی تھی۔ تم کو معصومیت میں کس نے پالا۔ مجھے تمہاری معصوم طفولیت میں کس نے خدمت کی توفیق دی۔ اب تک میری اور تمہاری کفالت کون کرتا رہا ہے۔

فرمایا۔ وہی ایک اللہ ہے۔ جو سارے جہانوں کا بادشاہ اور مخلوقات کا پالنے والا ہے۔ فرمایا۔ دنیا کی زندگی اُس کی دین ہے۔ جس پر موت اور قیامت حق ہے۔

میں اپنی قسمت پر شاکر ہُوں۔ سوائے امدادِ حق کے کسی امداد کی طالب نہیں ہوں۔ تم اگر مجھے خوش کرنا چاہتے ہو۔ تو میری ریاضت نہ کرو۔ میرے مالک و مولا کی ریاضت کرو۔ جو میرا اور تمہارا اور سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔

تم اللہ کی راہ میں زیارت کرو گے۔ تو اس کی نیک تاثیرات مجھے اِس ضعیفی میں اُس طرح ملیں گی۔ جس طرح طفولیت میں اللہ تعالےٰ نے میری تاثیرات مادرانہ سے تمہاری مدد فرمائی تھی۔ میں نے اللہ تعالےٰ کی رحمت و کرم سے تمہیں پالا تھا۔ تم اُسی مہربان کی اطاعت کے ساتھ میری کبیر سنی میں میری روح کو اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے ساتھ پالو۔ اور خوش کرو۔

بیٹا! اِس میرے خاکی وجود کو کب تک سہارا دو گے۔ ایک دِن ایسا بھی آجائے گا کہ تم بظاہر سہارا دینا چاہو گے۔ مگر نہ دے سکو گے۔ کیا فائدہ ایسی خدمت کا، جو صرف وجودِ دنیا ہی سے متعلق ہو۔

فرمایا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ اولاد کو اپنے والدین کی خدمت کا نیک صلہ ملتا ہے۔

مگر میرے نزدیک والدین کے لئے خدا کی بندگی کرنے والی اولاد سے بہتر کوئی دوسرا صلہ نہیں ہو سکتا۔

جو اولاد اللہ تعالےٰ اور اس کے حبیب اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اور اسلام کی وفادار ہو وہی ماں باپ کی بھی وفادار ہو سکتی ہے۔

فرمایا۔ میرے پاس چند ایسی اور بھی اجازات ہیں، جو اللہ کی دین ہیں۔ اور میرے پاس امانت ہیں۔ وہ بھی میں تمہیں اللہ کے نام پر تفویض کرتی ہوں۔

پھر مجھے الگ کر لیا۔ اور بہت سی بابرکت تفویضات سے نوازا۔ فرمایا یہ تفویضات جملہ قسم کی خارجی مداخلت سے آزاد ہیں۔ یہ اجازتیں اللہ تعالےٰ کی کامل بندگی حاصل کرنے کے لئے قرآنِ مجید اور احادیثِ شریف سے اخذ کی ہوئی ہیں جو اپنے اجداد سے مجھے ورثہ میں ملی ہیں۔

فرمایا بیٹا! ۔ میں اجازت دیتی ہوں ۔ جاؤ دریاؤں پر ان وظائف کی ابتدا کرو۔ فرمایا۔ میرے نزدیک تم علمِ دین سے بیگانہ ہو۔ تم پر عالمِ دین کا یا عارفِ باللہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور مجھے سب سے بڑا خدشہ یہی ہے۔

کہ تم کہیں بغیر علمِ دین کے عالمِ دین اور بغیر ریاضتِ شرعیہ کے عارفِ باللہ ہونے کے مدعی نہ بن بیٹھو۔ خدا تمہیں ہر حال اپنا بندۂ عاجز رکھے۔ جب علمِ دین مِل جائے۔ تو اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جاہل گردانو۔ اور جب عارف باللہ ہو جاؤ تو اپنے آپ کو اللہ کے سامنے پُر تقصیر جان کر معترف بنو۔

یہی نقطہ ہے، جو راہِ بندگی میں سب سے زیادہ کام آتا ہے۔ جس نے اِس راز کو پا لیا۔ اُس نے خدا کو پا لیا۔

اسلام میں فقر کے چند معانی ہیں۔ ایک فقر بندگی کا صحیح مظہر ہوتا ہے جس سے سالک اللہ کے درِ اقدس کے سِوا دوسرے در کی احتیاج نہیں رکھتا۔ یہی اسلام کا داخلی فقر ہے۔ جس کی بنیاد سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ کے ساتھ ڈالی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فقر کتاب وسنت کے ساتھ ظاہر ہے کہ آپ نے اپنے خدا کے سامنے انتہی عبودیت کا مظاہرہ فرمایا۔ اور عالمگیر سلطنت کے مالک ہو کر بھی فقر ہی کو ظاہری جاہ وتمکنت پر ترجیح دی۔

جس فقر کی معیت میں آپ درِ خدا پر آخری بندگی کے ساتھ ساجد رہے اور اُسی فقر کی معیت میں آپ نے دعا فرمائی۔ کہ اے اللہ میں مسکینی کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے مسکینوں میں زندہ رکھ۔ میری موت مسکینوں کی موت ہو۔ اور میرا حشر بھی مسکینوں میں ہو۔

اِس مسکینی اور فقیری کے صحیح معنی احتیاج غیر اللہ سے قطعی طور پر آزاد ہو کر ایک درِ اقدس کی بندگی مراد ہے۔

ایک فقر اطاعتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں نمود پاتا ہے وہ فقر اہلِ بیت اطہار اور صحابۂ کبار رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کا فقر وغنا ہے۔

ایک فقر علمائے صالحین اُمت کا ہے۔ جو خدا و رسول اور صحابہ کی اطاعت میں نمود پاتا ہے۔ اِس فقر کی آگے چل کر دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک علمائے صالحین جو علمائے ظواہر کہلاتے ہیں۔

مگر اِن میں خَشْیَۃُ اللہ اِس قدر زیادہ ہوتی ہے۔ کہ یہ لوگ ماسوا اللہ کی احتیاج سے آزاد ہو کر صرف اللہ تعالےٰ پر ہی کامل بھروسہ کرتے ہیں۔ اور اعلائے کلمۃُ الحق بلند کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور وہ کسی دوسرے قسم کے ایسے مشاغل کی طرف عملاً رجوع نہیں کرتے۔ کہ تبلیغ دین میں حرج واقع نہ ہو۔

دوسری شاخ اُن علمائے اسلام کی ہے۔ جو علمِ دین کی روشنی میں تزکیہ

نفس کرتے ہیں۔ اور عرفانِ نفس کے بعد عرفانِ باللہ کے مقام ذی برکت پر فائز المرام ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ ایسے لوگوں کا بیشتر وقت تزکیۂ نفوس میں صرف ہو جاتا ہے۔ مگر کامیابی کے بعد یہ لوگ علوم دینیہ کی فضیلت کے ساتھ ساتھ کراماتِ اعمالِ اسلامیہ کے نتائج سے بھی بہرہ ور ہو کر دین کے اُس وقفہ کو بھی پورا کر لیتے ہیں جو دورانِ تزکیہ میں پڑ گیا تھا۔

البتہ ناکامی کی صورت میں اُنہیں اِن وقفہ جات پر توبہ کرنی پڑتی ہے۔ مگر ناکامی کی حالت میں بھی اللہ تعالےٰ ان کی ریاضت کے ثواب سے ان لوگوں کو محروم نہیں فرماتے۔ کامیابی و ناکامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

مگر اللہ تعالےٰ کسی کی نیک محنت کو ضائع نہیں کرتے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ یعنی اللہ تعالےٰ کسی کے نیک اعمال کی نیک جزا ضائع نہیں کرتے۔

فرمایا۔ جو فقر محض لبادۂ فقر تک محدود ہو۔ وہ مصنوعی فقر ہے۔ صرف لباسِ فقر پہن لینے سے کوئی فقیر بن سکے۔ تو سب دنیا داروں کے دروازوں پر دریدہ حال سائل فقیر سالکِ باللہ کہلائیں۔ مگر ایسا نہیں۔

اہلِ دُنیا کے دروازوں کے سائل فقیر محتاجِ غیر اللہ ہیں۔ اور اللہ کے فقیر صرف اللہ کے محتاج ہو کر غیر اللہ کی احتیاج سے قلباً، ضمیراً و ایماناً آزاد ہو جاتے ہیں۔

اِس آزادی سے اُنہیں احکاماتِ ربّانی کی طرف کامل توجہ کے ساتھ مصروفِ بندگی ہو جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور اُن کی رگِ حیات کی دھڑکنوں تک بھی مصروفِ عشقِ حقیقی ہو جاتی ہیں۔

وہ ہر لمحہ اللہ کے بارے میں تفکر اور تدبر کرتے ہیں اور ہر فکرِ عارفانہ پر کتنے ہی

برس کی عبادت کا ثواب پاتے ہیں۔

فرمایا۔ ہر حرف قرآن پر دس نیکیاں پاتے ہیں۔۔ وہ اپنے لئے بھی اور پوری انسانیت کے لئے نجاتِ دارین کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ خیر ہی خیر بن جاتے ہیں۔

لہٰذا فقرِ اسلام میں کوئی ایسی حرکت نہیں ہونی چاہیئے۔ جو عنداللہ و عندالرسول و عندالاسلام و عندالاولیاء و عندالعلمائے صالحین قابلِ گرفت ہو۔ حال و قال دونوں کے متعلق خدا کے سامنے ہر کس و ناکس نے جواب دہی کرنی ہے۔

فرمایا۔ شراب حرام ہے۔ اِس واسطے کہ اُس کا سُکر عقل و دانش سے بے حال کر دیتا ہے۔ اور اِس حد تک بے خبر کر دیتا ہے۔ کہ انسان اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور ایسی بے خبری میں حلال و حرام کی امتیاز کرنے کی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔

اگر یادِ الٰہی جو پابندئ ارکان چاہتی ہے۔ فقیرِ سالک کو اتنا مدہوش کر دے۔ کہ وہ ارکانِ بندگی بھول جائے۔ تو یقیناً اُس کا سُکر اُس کے حال کو ارکانِ اسلام سے غافل کر دے گا۔ اور خدائے برتر کے مقرّر کردہ ارکانِ بندگی سے سالک کی غفلت شعاری اُس کے فقدانِ خوف پر منتج ہو گی۔

کوئی صاحب خوف سوائے حالتِ جنون کے ایسا نہیں کر سکتا۔ کہ بجا آوری کے لئے میدانِ بندگی میں اترا ہو۔ اور میدانِ عمل میں اُترنے کے بعد اپنے مالک و معبود کے احکامات سے غفلت کر رہا ہو۔

راہِ سلوک میں حیرت و استجاب کیف و استغراق کو بھی خوفِ خدا کے تابع رکھنے کا حکم ہے۔ اگر جلالتِ الٰہی سے مرعوب و مبہوت ہو کر یا جمالِ الٰہی سے خیرہ ہو کر کوئی سالکِ راہ مدہوش ہو جائے۔ اور اُس کی مدہوشی اِس حد تک پہنچ جائے۔ کہ سوائے جلال و جمالِ معشوق اُسے اور کچھ نظر ہی

نہ آئے۔

تو ایسا مدہوش سالک ہوش مند ہونے تک غیر مکلف ہے۔ مگر یہ حالت شاذ و نادر ہوتی ہے۔ بڑے رفیق القلب اور نازک مزاج سالک ایسے سُکر کا شکار ہوتے ہیں۔

اگر تدریج سے وہ اپنے ہوش پر جلد ہی قابو پالیں۔ تو وہ پھر رجعت الی الاولیٰ کر کے صاحبِ سہو ہو کر ارکانِ عبادات پُورا کرنے کی راہ پر آ سکتے ہیں۔

مگر رجعت میں دیر یا تاخیر ہو جائے۔ تو ایسے لوگ مجذوب ہو جاتے ہیں۔ عین تلاشِ حق کی راہ میں مجذوب ہونے والے اگرچہ شرطِ سہو کے کھو جانے پر غیر مکلف ہوتے ہیں۔ مگر اپنے عقل و دانش کو راہِ حق میں مردہ کر کے اپنے دلوں کو زندہ کر لیتے ہیں۔ اور اُن کی دِل کی آنکھیں ہی عالم انفس و آفاق کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اور دِل سے ہی اپنے مالک کے ساتھ لَو لگائے رکھتے ہیں۔ یہ بھی سالکینِ راہِ حقیقت ہوتے ہیں۔

مگر مجذوب العقل ہونے کی بنا پر ظاہری اعمال کے تکلف سے آزاد کر دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح نابالغ بچے اور مجنون غیر مکلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح مجاذیب بھی غیر مکلف ہوتے ہیں۔

مگر اہل اللہ میں زیادہ مقبول وہی سالک ہوتے ہیں۔ جو شریعت کی روشنی میں مجوّزہ راہِ طریقت کے آئین کے پابند ہو کر منزلِ مراد کی طرف رختِ سفر باندھیں۔

فرمایا۔ سب سے افضل سلوک اصحابِ کبار کا سلوک تھا۔ جنہوں نے اطاعت میں سرِ مو بھی فرق لانے کی جسارت نہیں کی۔

خلفائے راشدین سالکِ راہِ حقیقت تھے۔ مگر اُن کا طریقِ سلوک علیٰ منہاج نبوت تھا۔ مابعد کے سالکین کو چونکہ اصحابِ رسولِ کریم ہونے کا شرف نہیں مِل سکا

مگر صحابہ کی اطاعت میں اُن کا طریقِ سلوک بھی علیٰ منہاجِ طریقت رسول کریم ہُوا۔

اِس کے بعد ہمیشہ کے لئے طریقتِ اصحابِ پاک ہی نافذ العمل رہے گی۔ اور اولیائے اُمت اسی طریقہ سے اکتسابِ فیض کرتے رہیں گے۔

جملہ طُرقِ اسلامیہ اپنی نسبت کے اعتبار سے خلفائے راشدین میں سے کسی ایک کے ساتھ متعلق ہو جاتے ہیں۔

مگر راہِ سلوک میں سیّد الطائفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات ہے۔ آپ سمندرِ عرفان ہیں۔ اور جملہ سلوک کے دریا آپ ہی سے آغاز کر کے آپ ہی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

فرمایا۔ فقرِ اسلام نے ہر شعبۂ اسلام سے انگڑائی لی۔ متقی تجّار بھی ولی اللہ تھے۔ اور متقی عساکرِ اسلام کے جرنیل اور سپاہ سب کے سب سالکِ راہِ حقیقت تھے۔ اُن کے صالحانہ کردار سے میدانِ وغا میں گوناگون کرامات کا ظہور ہوتا رہا۔

اسلامی غزوات میں مُسلمان سپاہ کو فرشتگانِ مکرمین کے ذریعہ تائیدِ غیبی کا ملنا، درندوں کا مجاہدین کے راہ سے ہٹ جانا اور بسا اوقات راہنمائی کرنا۔ دریاؤں کا راہ دے دینا۔ ارض و سما کے موسموں میں مویدانہ تغیّرات۔ یہ سب احوال اُن کے کریم النفس ہونے کے علامات تھے۔

اِس واسطے یہ گمان کر لینا کہ سلوک صرف سَند سے ہی متعلق ہو کر سلوک کہلاتا ہے۔ ایک بے معنی منطق ہے، جو صرف جہلا کو ہی اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔

مگر وہ بھی عارضی وقت کے لئے تصوفِ اسلام، حسنِ ایمان اور جانِ بندگی ہے یہ کوئی یک طرفہ سلسلہ نہیں۔ بلکہ ہمہ گیر نظریۂ حیات ہے۔

فرمایا۔ خبردار!۔ یہ بھُوت پریت کا فقر نہیں۔ نہ ہی یہ علمِ نجوم د

مسمریزم کا شعبدہ ہے۔ بلکہ حُسنِ ازل کے سامنے خنجرِ تسلیم و رضا کے ساتھ ذبح ہو جانے کا نام ہے۔

بس میری اتنی نصیحت پر ہی اکتفا کرو۔ مجھے اللہ پر چھوڑ دو۔ اور اپنے اللہ کی بندگی پورا کرنے کی سعئی مومنانہ کرو۔ اور تشہیرِ نفسی کے لئے اگر ایسا کرو گے تو میں قیامت کے دِن مواخذہ کروں گی۔ جب فراغت کا وقت مِلے۔ مجھے ملو۔ مگر تہی دامن ہو کر مجھ سے نہ مِلنا۔

جو بیٹے دنیوی کمائی کرنے کے لئے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ وہ نقد کمائی کر کے لاتے ہیں۔ اور اپنے ماں باپ کو خوش کرتے ہیں۔ مَیں تم سے ایسی کمائی کا مطالبہ نہیں کرتی۔ مجھے اللہ تعالےٰ نے صاحبِ نظر بنایا ہے۔

تم جب کبھی عبادات سے تھوڑی فراغت پاکر میرے مِلنے کے لئے آیا کرو گے تو میں تمہارے چہرہ سے معلوم کر لوں گی۔ کہ تم تہی دست واپس آئے ہو۔ یا بندگی کے ساتھ نورِ ایمان کما کر لائے ہو۔ میں تمہارا امتحان لُوں گی۔

چونکہ میں نے خدائے لم یزل کے سامنے تمہارے لئے جوابدہی کرنی ہے۔

نیز تمہارے والد بزرگو تمہاری روحانی کفالت پر مجھے مامور کر گئے ہیں۔ اِس طرح مجھ پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بیٹا! خدا ہی خدا ہے۔ اسی کے لئے جیو۔ اور اُسی کے لئے مرو۔ اور اُسی کے لئے بندگی کرو۔

اللہ کے فضل و کرم سے والدہ کے پند و نصائح نے میرے دِل پر گہرا اثر ڈالا۔ اور مجھے اتنا متاثر کیا۔ کہ رقت قلبی سے میرا وجود موم ہو گیا۔

آپ کی اجازت کے بعد میں نے موضع دیول کے دامن سے گذرتے ہوئے دریائے جہلم کے کنارے۔ جو ایک لق و دق ویرانے سے گزرتا ہے۔ بیٹھ کر مجوّزہ و مفوّضہ ریاضت شروع کر دی۔

یہ میرا پہلا وظیفہ تھا۔ جو سلسلۂ قادریہ سے متعلق تھا۔ گیارہ دِن مسلسل میں

نے اس وظیفہ کے ساتھ ریاضت کی۔ جس سے میرے اکثر منفی قسم کے وہ خیالات اور وساوس بھی دُور ہونے شروع ہو گئے، جو برہانِ سلوک کے متعلق میرے یقین کو متذبذب کرنے کا باعث تھے۔

اِس ریاضت سے مجھے اطمینان نصیب ہُوا۔ اور میرے قلب و نظر اور ذہن نے مثبت پہلو اختیار کیا۔

جس سے منفی کیفیت قلب و نظر نے مثبت پہلو اختیار کیا۔ اور بے یقین رکھنے والے ظن و گمان کم ہونے شروع ہو گئے۔

اِس وظیفہ کے دوران مجھے ہر چیز کے خیرِ محض ہونے پر مثبتِ حقیقی کی طرف قدم اُٹھانے کے لئے ہر چیز کی قلبِ ماہیت کے ساتھ اُس کے مثبت پہلو پر غور و خوض کرنے کی بصیرت ملی۔

ہر حادث چیز کو میں نے مُسبّح پایا۔ ہر چیز مجھے دعوتِ تسبیح و تہلیل دے رہی تھی۔

چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جبکہ مَیں ایک سبز اور گنجان جھاڑی کے پاس بیٹھا دریا کے سامنے مصروفِ وظیفہ تھا۔ کہ گنجان جھاڑی کی پتیوں کی متحدہ زبان سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ورد سنا۔ مجھے شبہ ہُوا کہ جھاڑیوں کے قریب کوئی خوش الحان معصوم بچے ایک جھمگٹے کی شکل میں کلمۂ طیبہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ مگر بار بار اِس شبہ کو دور کرنے کے لئے میں نے جھاڑی کے قریب ہو ہو کر بار بار ذکرِ پاک سُنا۔ جب متیقن ہو گیا۔ کہ یہ جھاڑی ہی ذکرِ الٰہی کرتی ہے۔ (واللہ اعلم)

تو اِس فوق الادراک واقعہ نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ مجھے مزید شبہات نے آگھیرا کہ شاید کوئی جنات وغیرہ ایسا نہ کر رہے ہوں۔ اِس پر میں نے حسبِ نصیحت تیسرا کلمۂ تمجید پڑھا۔ کہ اگر کوئی وسوسہ ہے تو دور ہو جائے۔ اگر وسوسہ نہیں۔ تو اصلی حالت میں میرے سامنے آجائے۔

چنانچہ فی الواقع پتیاں ہی مصروفِ ذکر پائی گئیں۔ اِس کیفیت سے مجھے پہلی

بار ہوش و وجد نصیب ہوا۔ اللہ تعالےٰ کی پُرتاثیر کلام پاک کی اِس معجز نمائی نے میرے دِل پر وہ اعجاز انگیز انقلاب پیدا کیا۔ کہ میں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے قریب پایا۔ اور دُوری کا وہم ختم ہونے لگا۔

گویا کہ میری عاجزانہ اُمیدوں کی حوصلہ افزائی کے لئے قدرتِ کاملہ مجھے پہلی بار برہانی دورعطا کر رہی تھی۔ اِس کیفیت کو میں نے کافی وقت دیکھا۔ اور ذکرِ الٰہی سُنا اور قریب رہا۔

پھر وہ پُرکیف مجلسِ ذکر معاً ختم ہوگئی۔ اِس کیفیّت کی تاثیرات میرے لئے وجد انگیز تھیں۔ اور اِس پُرکیف تاثر کو میں نے ایک شعر کی صورت میں یاداشت کے طور پر بند کرلیا۔ راہِ سلوک میں غالباً یہ میرا پہلا منظوم بند ہے۔ جو فی البدیع تھا۔ وہ یہ ہے ؎

نزد تُو جب شجر کے جائے گا مارے ہجر کے
بول اُٹھے گا لاالٰہ ہُوں گے تماشے ذکر کے

یہ واقعہ میری اِس متشرع پابند ریاضت کے پانچویں دِن صلوٰۃ العشار کے بعد پیش آیا۔ اِن پانچ دنوں میں مسلسل ریاضت سے مجھے سخت تکان محسوس ہو رہی تھی اور نیند کا غلبہ ہو رہا تھا۔ جس کو دُور کرنے کے لئے مجھے بار بار دریا کے ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا پڑتا۔

مگر اس قدرتی اظہارِ ذکر نے میری رُوح میں ایسا پُرتاثیر ارتعاش پیدا کیا۔ کہ تکان اور نیند کا احساس بصورتِ محبت مزید جستجو میں بدل گیا۔ اور میری تکان آسودگی میں اور میری نیند وجود بیداری سے بدل گئی۔ بار بار ارض و سما کی ہر چیز کی طرف اِس امید پر میرے کان کھڑے ہو جاتے کہ شاید کہیں سے پھر ویسے ہی اذکار سننے میں آئیں۔ اور ایسے پُرکیف منظر کو میری نظریں پاسکیں۔

اِس بے قراری میں سالکانہ قلق و اضطراب کی اتنی فراوانی ہوئی۔ کہ ماہیٔ بے آب کی طرح اپنے محدود دائرۂ ریاضت میں تڑپنے لگا۔ کہ معاً دِل نے شریعت کا دامن تھام

لیا۔ اور میرے دِل نے مجھے ایسے جذب سے منع کر دیا۔ جس کے واقع ہونے سے ارکانِ بندگی میں کوتاہی کا شبہ ہو۔

چنانچہ میں سنبھل گیا۔ اور دو رکعت نفل بندگی ادا کیے۔ اور شکرانہ ادا کیا۔ اور مصروفِ بندگی ہو گیا۔ مزید ایک دِن اور ایک رات گزارنے کے بعد گاہے گاہے قریب کی فضاؤں سے لا الٰہ الا اللہ کے نغمے سنائی دیتے۔

یہ طریقِ ذکر پہلے ذکر سے کہیں زیادہ دلآویز تھا۔ اِس ذکر نے مجھے وجد و استغراق دیا۔ اور میں گویا وجد و استغراق میں محصور تھا۔

مگر قدرت کاملہ نے میری مدد فرمائی۔ کہ مجھے ہوش میں رکھا۔ اور میں ارکانِ عبادات کی رعایت کو ملحوظ رکھتا رہا۔

سحر سے دوسرے دِن وُرود شام تک گاہے گاہے یہی ماجرا درپیش آتا رہا۔ اور میں اپنے آپ کو صاحبِ حال پاکر ساتھ شکرِ الٰہی کے مزید مصروفِ عبادت ہوا۔

پھر ساتویں کے بعد آٹھویں شب کو دَریا، ہوا اور جنگل کے درختوں نے ایک زبان ہو کر ذِکر نفی و اثبات جاری کر دیا۔ اب میں گویا مکمل طور پر ہر چہار جانب کے ہجومِ ذِکر میں پوری طرح محویت و سرور پا رہا تھا۔

اِس ذکر نے نہ صرف میرے سمع و نظر کو ہی متاثر کیا۔ بلکہ میرے جِسم و جان کو اپنی تاثیر میں لے لیا۔ اور میرے بدن کا رونگٹہ رونگٹہ لا الٰہ الا اللہ کے خارجی ہجومِ ذِکر میں شریک ہو گیا۔ یہ سارے اذکار طرزِ الحان میں بیک آواز تھے۔ اس مقام پر ہوش کو برقرار رکھنا میری طاقتِ جسمانی سے باہر تھا۔

مگر نورِ شریعت نے میری اِس بے قابو حالت کو اپنی باضابطہ حفاظت میں لے لیا۔ اور مجھے ارکانِ عبادات کی رعایت سے غافل نہ ہونے دیا۔ اور میں اِس ہمہ گیر وجد و سرور میں بھی باہوش مصروفِ عبادت رہا۔ اِس مقام پر میں نے سوائے ذکرِ الٰہی کے کسی دوسری کیفیت کو دیکھنے یا پانے کی خواہش نہیں کی۔ اور یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کی طرف ہی توجہ مبذول رہی۔

میرے دِل نے خوفِ عجب سے بچنے کے لئے ہر اُس چیز کی نفی کر دی، جو غرورِ نفس کا سبب بن سکتی ہے۔

چونکہ کشف و مکاشفہ مقصودِ سلوک نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صرف چراغِ راہ ہو سکتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ بعض سالک اپنی ریاضت کے دوران آنکھوں پر کشف وارد کرنے کے لئے تکلّف کرتے ہیں۔ یہ تکلّف اِس بات کی علامت ہوتی ہے کہ سالک ایمان بالغیب پر ایمانِ بالشہود کو ترجیح دے رہا ہے۔ اور یہ بنیادی غلطی ہے جو سالک کی ساری زندگی میں آڑے آتی ہے۔ اور طبیعت کو مرہونِ غیر بنا دیتی ہے۔

چونکہ کشف و کرامات مطلوب نہیں، بلکہ غیر ہیں۔ جب حصولِ غیر کو مطلوب پر ترجیح دی جائے۔ تو منزل غلط ہو جاتی ہے۔ جس کی انتہا پھر غیر پر ہی اختتام پذیر ہو کر سالک کو اپنے اصل مقصود سے دُور کر دیتی ہے۔ اور ایسی حالت میں سالک کشف و کرامات کو بجائے ایزدِ رحمت قرار دینے کے اپنا ذاتی اکتساب گردانتا ہے۔ اور یہ گمان سالک کو سہل پسند بنا دیتا ہے۔

وہ شخص جو اپنی ریاضت سے عجب و غرور پائے۔ اور دعوائے اکتساب کو اپنی ذاتی محنت قرار دے۔ اُس کی ساری محنت اُسے بجائے مردِ کامل بننے کے محض ایک عامل قسم کا آدمی بنا دیتی ہے۔

چنانچہ پابندِ شریعت ہونے کی بنا پر مجھے ان پُرکیف اور وجد انگیز حالات میں بھی اللہ تعالےٰ نے ایسے خارجی خیالات سے یکساں محفوظ و مامون رکھا۔ اور میں بفضل اللہ تعالےٰ منزلِ سلوک پر شرعی طریق پر گامزن رہا۔

آٹھویں، نویں، دسویں یوم کی گیارہویں رات تک اِس قسم کے امید افزا حالات مرئی اور غیر مرئی انداز میں پیدا ہوتے رہے۔ اور میری ہمت مضبوط کرتے رہے۔

اِن حالات سے میں نے کسی مرحلہ پر اپنی ذاتی حیثیت کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دی۔ بلکہ شریعتِ اسلام کے متعینہ عبادات کی عملی تاثیرات پر میرا ایمان مضبوط و مستحکم ہوتا رہا۔ اور بار بار یہی گمان پیدا ہوتا رہا۔ کہ شریعتِ اسلام کس قدر پُرتاثیر ہے۔ جو

انفس و آفاق پر فتوحات حاصل کرنے کا یقیناً آخری ذریعہ ہے۔ اور یہ کہ ساری انسانیت اسی کے ذریعہ فلاحِ دارین پا سکتی ہے۔ اور یہ کہ شریعت ہی انسانی فلاح و نجات کی ضامن ہو سکتی ہے۔

جوں جوں میں ریاضت میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے دل میں بر سبیل طریقت شریعتِ اسلامیہ کی حقیقت ہی واضح ہو رہی تھی۔ اور میں ہر گوشۂ ریاضت سے شریعت اور شارع علیہ السلام کو اہلِ اسلام کے لئے اللہ کا احسان قرار دیتا رہا۔

قرآن مجید کی یہ آیتِ پاک لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ بار بار میرے سامنے آ آ کر مجھے طریقت با شریعت اور اطاعتِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب متوجہ کرتی رہی اور تزکیۂ نفس کے لئے عملِ شریعت کی طرف رکز دیتی رہی اور اس تقوٰی دینے والے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی آئینہ داری کرتی رہی۔ یہاں تک کہ میرے قلب و نظر نے اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کی پوری پوری تصدیق کر لی۔ اور یہ کہ میری روح و دانش پر وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی صحیح تفسیر واضح ہو گئی۔